

پاؤں کی زنجیر
رضیہ بٹ
RAMZ-E BEKHUDI
/RAMZEBEKHUDI
/RAMZEBEKHUDI


اگر آپ ناولز میں دلچسپی رکھتے ہیں، تو ہماری ویب سائٹ
HTTPS://RAMZEBEKHUDI.BLOGSPOT.COM/
پر آپ بہت سارے دلچسپ ناولز اور کتابیں تلاش
کر سکتے ہیں۔ ہماری کتابوں کا انتخاب مختلف مصنفوں کی لکھی
ہوئی ہے اور آپکو آپکی پسند کے مطابق آسانی سے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں۔

انتقام

اس کی نیت تھی نہ ارادہ۔ بلکہ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ بندوق صاف کرتے ہوئے گولی یوں چل جائے گی۔ اور کھیت کی درمیانی پگڈنڈی پر چلتے جوان کو منٹوں میں موت کی نیند سلا دے گی۔

گولی چل گئی تھی اور سلامت خان کی سلامتی کو ہمیشہ کے لیے چاٹ گئی تھی۔ وہ وہیں گر پڑا تھا۔ خون کا فوّارہ اُبلا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ درانتیاں اور جوتے ہاتھوں ہی میں پکڑے گولی کی آواز سن کر اُٹھ بھاگے تھے۔ ہر کوئی گولی کی آواز کی سمت دوڑ رہا تھا۔

"کیا ہوا!"

"کس نے چلائی گولی۔"

"کسے لگی؟"

"مر گیا کوئی"

"بچ گیا"

"چلانے والے کو پکڑو....."

"بھاگ نہ جائے"

"دوڑو..... بھاگو....."

لوگ تجسّس سے باتیں کرتے حواس باختہ ہوتے اِدھر بھاگے آرہے تھے۔ جدھر دو خاندانوں کی زمینوں کی حد بندی یہ پگڈنڈی تھی..... گولی کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ دونوں طرف

کے کھیتوں سے لوگ اس پگڈنڈی کے ارد گرد ہانپتے ہوئے آن پہنچے تھے۔ جہاں سلامت خان خون میں لت پت پڑا تھا۔ لوٹ پوٹ ہونے کے بعد اب جسم ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

اس کے قریب ہی حشمت خان پریشان سا کھڑا تھا۔ جس کے ہاتھ میں وہی بندوق تھی جس سے اتفاقاً ہی گولی چل نکلی تھی۔ سامنے والے کھیت میں وہ گھنے درخت تلے موٹے موٹے پایوں والے بان کے کھرے پلنگ پر بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ کارتوسوں کی پیٹی ابھی تک پلنگ پر پڑی تھی اس کے کندھے پر رکھنے والی چادر اور پگڑی بھی وہیں رکھی تھی۔

لوگوں نے سلامت خان کی نعش اور حشمت خان کے ہاتھ میں بندوق دیکھی، تو چہرے فق ہو گئے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سلامت اور کبھی حشمت کو دیکھنے لگے۔ یہ سب مزارع اور نوکر چاکر قسم کے لوگ تھے۔ وہاں ایک معتبر بزرگ بھی آن پہنچے۔ معاملہ دیکھا۔ تو وہ بھی ڈر سے گئے۔

" مار ڈالا اسے" بالآخر ایک بزرگ نے غصے سے سرخ انگارہ آنکھیں حشمت کے چہرے پر جما دیں۔

"مر گیا ہے۔ لیکن میں نے مارا نہیں کاکا....." حشمت نے متاسف لہجے میں کہا۔

"مارا نہیں اور مر گیا" دوسرے معتبر آدمی نے تیس بتیس سالہ حشمت کو گھورا۔

" بندوق صاف کر رہا تھا گولی اتفاقاً چل گئی......" وہ خفت سے بولا.....

" اور سیدھی سینے میں جا لگی" اس نے کہا.....

" یہ محض اتفاق ہے....." طنز کو برداشت کرتے ہوئے حشمت نے صاف گوئی سے کہا۔

" یہ اتفاق کتنا مہنگا پڑتا ہے جانتے ہو......" پہلا بزرگ غرایا۔

" کاکا..... میرا بالکل قصور نہیں...... نہ ہی میرا ارادہ تھا..... آپ جانتے ہیں۔ دونوں خاندانوں میں مصالحت ہو چکی ہے پھر....."

" پھر بھی تیرے دل میں کینہ باقی تھا....."

حشمت کچھ کہنے کو تھا..... کہ دور سے ہوائی فائروں کی آواز آئی۔ سلامت کے بھائیوں کو اس سانحے کی خبر مل گئی تھی۔ کچھ لوگ چارپائی لینے دوڑے تھے تاکہ دم توڑتے سلامت کو اس پر ڈال کر کسی ڈاکٹر یا ہسپتال میں پہنچانے کی کوشش کریں۔

فائروں کی آواز سے سب کے دل دہل گئے۔

"خان" حشمت کے ذاتی ملازم نے جلدی سے اس کا کندھا ہلایا..... "آپ یہاں سے چلے جائیں خان..... جلدی کریں......"

" نہیں" وہ بولا..... "میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں مارا....."

" پھر بھی..... وہ لوگ مشتعل ہیں۔ خاندانی دشمنی ہے۔ وہ آتے ہی آپ پر پل پڑیں گے۔ سلامت کا خون ہو گیا ہے خان...... جیسے بھی ہوا ہے۔ آپ یہاں سے فوراً چل دیں....."

" میں کہہ رہا ہوں گولی اتفاقیہ چلی ہے" حشمت گرجا۔ نوکر چاکر سہم گئے۔ لیکن معاملے نے جو رُخ اختیار کرنا تھا۔ وہ بھی مخفی نہیں تھا۔ اس لیے حشمت بولا" وہ لوگ اسلحے کے ساتھ آرہے ہیں۔ تم ہٹتے نہیں ہو......"

تھوڑی ہی دیر میں حشمت خان کے گرد رائفل برداروں کی قطار لگ گئی.....

گاؤں کے کچھ اور معتبر اور بزرگ لوگ بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ معاملے کی سنگینی اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے آپس میں جلدی جلدی دو ٹوک فیصلے کیے۔

"صورت حال خطرناک ہے"

" ابھی محاذ قائم ہو جائے گا"

" کئی جانیں چلی جائیں گی"

" کچھ کرنا چاہیے....."

" معاملہ بڑھ جائے گا"

"ہو سکتا ہے۔ گولی اتفاقیہ ہی چلی ہو۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے...... پچھلے خون کا بدلہ لیا ہو......"

"یہ دشمنی اسی طرح چلتی رہی۔ تو گاؤں کے یہ دونوں سر برآوردہ خاندان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

"انہیں روکنا چاہیے"

"مصالحت کروا دینی چاہیے"

"جلدی کرو..... دونوں مشتعل ہو کر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا..... سلامت کے بھائیوں چچاؤں ماموؤں اور دوسرے رشتہ داروں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ سب رائفلیں بندوقیں لیے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ادھر حشمت خان کے ساتھی بھی چاک و چوبند ہو گئے تھے۔ سارے گاؤں میں افراتفری مچ گئی تھی۔ دل دہل گئے تھے۔ عورتیں گھروں سے باہر نکل آئی تھیں۔ سلامت کی ماں اور بہنیں سینہ کوبی کرتی جائے واردات کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ حشمت کی بیوی، ماں اور بہنیں بھی یہ خبر سن کر متوحش ہو گئی تھیں۔ رنگ سپید پڑ گئے تھے۔ اور دل ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔

دونوں خاندانوں میں پہلے ہی برسوں سے پرانی دشمنی تھی۔ کئی قتل ہو چکے تھے۔ کبھی ایک خاندان کا آدمی قتل ہو جاتا کبھی دوسرے کا..... پچھلے سال حشمت کا بڑا بھائی سلامت کے چچا نے مار ڈالا تھا۔ تب بھی اس طرح محاذ ہو گیا تھا۔ بندوقیں رائفلیں نکل آئی تھیں۔ اگر گاؤں گاؤں کے مدبر، معتبر اور بزرگ درمیان میں نہ آتے تو خون خرابہ ہو جاتا۔ ایک کی جگہ کئی لاشیں اٹھتیں۔

ان بزرگوں نے خدا اور رسولؐ کے واسطے دے کر دونوں فریقوں کو سمجھایا تھا۔ نسل در نسل چلنے والی دشمنی کی تباہ کاریاں سامنے تھیں۔ آج تک اتنی قیمتی جانیں جانے سے فائدہ تو کوئی کسی کو پہنچا نہیں تھا۔ بیچ بچاؤ کرانے پر جانے کونسا مصلحتی لمحہ تھا۔ جو دونوں

خاندانوں کے سربراہوں کے دماغوں کو سہلا گیا۔ رائفلیں بندوقیں نیچی کر لی گئیں۔

پھر جرگہ بیٹھا۔

دونوں خاندانوں کے لوگ جمع ہوئے اور جرگہ کے سربراہ کے حکم کے فیصلے کا اپنے آپ کو پابند کر لیا۔ پورے گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خون خرابے سے شاید دونوں خاندان ہی تنگ آ چکے تھے۔ ذہن کچھ کشادہ بھی ہو چکے تھے۔ کچھ نوجوان اب تعلیم کی روشنی سے بھی بہرہ ور ہو چکے تھے۔

اس لیے بزرگوں اور معتبروں کی کوششیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔

صرف صلح ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کو کشادہ دلی سے معاف کرتے ہوئے آپس میں میل جول بھی ہو گیا تھا..... خوب ضیافتیں اڑی تھیں۔ دونوں خاندانوں کے حجروں میں کئی کئی دن جشن کا سا سماں رہا تھا۔ خوشیاں منائی گئی تھیں۔ راگ و رنگ کی محفلیں سجی تھیں۔ خوش آواز اور خوش گلو نوجوانوں نے رات رات بھر اس خوشی میں لوبھے اور ٹپے گائے تھے۔

دو خاندان جو ایک ہی خاندان کی شاخیں تھیں برسوں دشمنی کے سینچے پر چڑھے رہنے اور بیشتر قیمتی جانیں ضائع کرنے کے بعد اب پھر سے ایک ہو گئے تھے..... عقل کی روشنی غالب آئی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو سچے دل سے معاف کر دیا تھا..... سال بھر کے عرصے میں دونوں خاندان کافی قریب آ گئے تھے۔ بیاہ شادی میں ایک دوسرے کو مدعو کیا جاتا۔ مرگ ہو جاتی تو پورے خلوص سے شرکت کی جاتی۔

لیکن

تقدیر کو شاید یہ کھیل پسند نہ آیا۔ امن و آشتی ان خاندانوں کا مقدر نہ بن سکی۔ حشمت خان کی بندوق کی گولی اتفاقیہ ہی سلامت کی موت بن گئی۔

گولی واقعی اتفاقیہ چلی تھی۔ حشمت خان تو خاصہ ہوشمند آدمی تھا۔ پڑھا لکھا بھی تھا۔

اور صلح ہو جانے پر بے حد خوش بھی کہ آخری قتل اس کے بھائی ہی کا ہوا تھا دکھ بھی تھا اور رنج بھی لیکن اس نے بزرگوں کی بات مان لی تھی۔ سرِ تسلیم خم کر لیا تھا۔

"میں اپنے بھائی کا خون قاتل کو معاف کرتا ہوں" اس نے جرگے میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا "صرف اس لیے کہ آئندہ ہم امن وامان سے رہیں۔ اپنے ہی خون سے نہاتے نہ رہیں۔ ہم غیر نہیں ہیں ایک ہی پردادا کی اولاد ہیں۔ ہمارا خون ایک ہی ہے ادھر سے بہے ادھر سے کمزور ہم ہی ہو رہے ہیں۔۔۔۔" حشمت خان کی بات پر سب بے اختیار عش عش کر اٹھے تھے۔ اس کی کشادہ دلی اور عظمت کی سب نے داد دی تھی۔ اس کے بھائی کا قاتل یوسف جان بھرے جرگے میں اس کے قدموں میں جھک گیا تھا۔۔۔۔

"خان کاکا" حشمت نے جلدی سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا تھا۔۔۔۔ وہ اپنے سے دس سال بڑے کاکا کو اپنے قدموں میں جھکنے نہیں دینا چاہتا تھا یہ اس کی فراخ دلی اور مصلحت اندیشی کا واضح ثبوت تھا۔

لیکن

اب اسی حشمت خان کے ہاتھوں سلامت کا خون ہو گیا تھا۔۔۔۔ سلامت کے بھائی بندُ پل پڑے تھے۔ وہ شور مچاتے نعرے لگاتے اور ہوائی فائر کرتے چلے آرہے تھے۔

"حشمت ہمارا دشمن ہے"

"اسی نے بھائی کا بدلہ لیا ہے"

"وہ کینہ پرور ہے"

"اس نے جرگے کے فیصلے کی خلاف ورزی کی ہے"

"ہم اسے چھوڑیں گے نہیں"

"اس کے خاندان کا نام تک مٹا دیں گے"

خوش وخروش اتنا تھا کہ اس کے آگے بند باندھنے کی صورت ذہنوں میں نہیں آ

رہی تھی۔ آمنا سامنا ہونے کی دیر تھی۔۔۔۔ خون کی ندیاں بہہ جانے کا امکان تھا۔۔۔ حشمت خان اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا تھا۔۔۔۔۔

"مجھے خون خرابے سے خوف نہیں۔ لیکن میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں۔ گولی اتفاقیہ چلی ہے۔ میں نے سلامت کو قتل نہیں کیا۔۔۔۔۔"

دندناتے ہوئے وہ لوگ آن پہنچے سلامت کی لاش بان کی چارپائی پر ڈالی جا رہی تھی۔۔۔۔ اس کے دونوں بھائیوں نے لاش کو دیکھا۔ پھر شدت غیظ وغضب سے للکارے

"سلامت خاناں تیرے دشمن کا سارا خاندان ہمارے ہاتھوں بچے گا نہیں۔۔۔۔"

وہ حشمت پر فائر کرنے ہی کو تھے کہ گاؤں کی سب سے بڑی بزرگ شخصیت خان دوست محمد خان نے اپنی چادر کندھے سے اتاری اور ہاتھ میں پکڑی لٹھ پر ڈال کر فضا میں لہرا دی۔

"صبر میرے بچو صبر۔۔۔۔" وہ پوری قوت سے چلائے۔۔۔۔

ان کی عزت واحترام اتنا تھا کہ لوگوں نے سلامت کے دونوں بھائیوں کے اٹھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"خان صاحب کی بات سن لو۔ صبر سے سن لو۔ خدا کے واسطے سن لو" لوگ ہاتھوں سے نکل نکل جانے والے دونوں بھائیوں کو قابو میں کرنے کی کوشش میں لگے جا رہے تھے۔ دوسرے بزرگوں نے بھی خان دوست محمد خان کی تقلید کی اور اپنی چادریں کندھوں سے اتار کر فضا میں لہراتے ہوئے جوشیلے غصیلے لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

بڑی مشکل بڑی جدوجہد اور بڑی کوششوں سے دونوں پارٹیوں کو قابو میں کیا گیا۔ ورنہ آج قیامت بپا ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

سلامت کے بھائیوں اور رشتہ داروں کو اتنے کڑیل جوان کی موت کا دکھ ضرور تھا دل میں پیچ وتاب بھی کھا رہے تھے۔ انہیں یقین ہی نہیں تھا کہ گولی اتفاقیہ چلی ہے۔

"کینہ اس کے دل میں پل رہا تھا، موقع پاکر اس نے بدلہ لیا ہے۔ یہ بے ایمان ہے۔ اس نے بات دل سے نکالی نہیں تھی۔ اس نے جرگے کے بزرگوں کو دھوکہ دیا ہے۔ ہمیں چھوڑ دو۔ ہم اپنا حساب برابر کرنا جانتے ہیں ......"

ادھر حشمت بار بار یہی کہہ رہا تھا ...... "مجھ سے جو چاہے قسم لے لو میں نے دانستہ سلامت پر گولی نہیں چلائی ..... اتفاقیہ چل گئی ہے۔ میری بات پر یقین نہیں آتا تو ڈرنے والا میں بھی نہیں ہوں کر لو جو کچھ کرنا ہے ......"

دونوں طیش میں آ رہے تھے۔ لیکن گاؤں کے جہاندیدہ بزرگ اور خاص کر خان دوست محمد خان کی موجودگی میں باقاعدہ ایک دوسرے پر حملے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

سلامت خان کی لاش اٹھائی گئی تو حشمت خان نے چارپائی کی پائنتی کی طرف آکر اس کے پاؤں چھوکر گلوگیر آواز میں کہا "میرے بھائی ..... میں نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں مارا۔ میرا خدا گواہ ہے۔ گولی اتفاقیہ چل گئی تھی۔"

حشمت خان کی حرکت پر کئی دل پسیج گئے۔ سلامت کے بھائی حرمت خان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے حشمت کو دیکھا اور اس کے کندھے کو ہولے ہولے ......

"خدا کی رضا یہی تھی" سلامت کے بڑے بھائی مامون نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا۔ خان دوست محمد خان نے ان سب کو دلاسہ دینے کی کوشش کی حشمت نے سر جھکا دیا۔ کوئی مطمئن ہو گیا۔ کوئی نہیں ہوا ..... پھر بھی معاملہ کچھ ٹھنڈا ضرور پڑ گیا ...... لاش اٹھالی گئی۔ اور دونوں پارٹیاں باقاعدہ جلوس کی صورت میں چارپائی کو کندھا دیتے ہوئے سلامت کے گھر تک آگئے۔ حشمت خان کا بے دھڑک لاش کے ساتھ آنا اور جنازے میں شریک ہونا اس کی بے گناہی کا کھلا ثبوت تھا۔ اسے خاندان کے تقریباً ہر فرد نے تسلیم کر لیا۔ لیکن دکھ اپنی جگہ تھا۔ موت کی بے رحمی سے بھی متاثر تھے۔ خاندان کی عورتوں نے بال نوچ لیے تھے۔ سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ آہ و فغاں سے عرش و فرش ہل رہے تھے جیسے ......

سلامت کی نوعمر بیوی اور چھ ماہ کی بچی کو دیکھ دیکھ کر تو ہر آنکھ نم ہو رہی تھی۔

کفنانے دفنانے کے کچھ دن بعد معاملہ جرگے میں پیش ہوا۔ بزرگ محسوس کر رہے تھے کہ دلوں میں کدورتیں پھر سے بھر گئی ہیں۔ وقتی طور پر بات ٹھنڈی ہوئی ہے۔ لیکن یہ انگاروں پر راکھ والی بات ہے۔ کسی وقت بھی ہوا کے جھونکے سے راکھ اڑی تو انگارے پھر سے دہک اٹھیں گے۔

خان دوست محمد خان نے الف خان سے کہا "سلامت کا بھائی رحمت خان بڑا تاؤ کھا رہا ہے وہ مانتا ہی نہیں کہتا ہے حشمت نے جان بوجھ کر سلامت کو مارا ہے۔ بہت سمجھایا۔ لیکن اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے ......"

"وہ ویسے بھی بڑا خاری ہے حشمت خان سے۔ کسی وقت بھی کچھ کر دے گا" الف خان بولے۔

"دونوں خاندانوں میں ہمیشہ کے لیے دشمنی پھر سے عود آئے گی" نواز خان بولا۔

"کچھ سوچنا چاہیئے" رمز خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں" خان دوست محمد خان نے سر ہلاتے ہوئے کہا ...... "کوئی حل نکالنا چاہیئے۔ نہیں تو دونوں خاندان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس خون خرابے کو روکنا ہمارا فرض ہے۔"

"بالکل، بالکل ....." سعد اللہ خان نے کہا۔

گاؤں کے سربرآوردہ بزرگ خان محمد دوست محمد خان کے وسیع حجرے میں جمع تھے۔ دونوں خاندانوں کا سچا ملاپ کرانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔

بالآخر اک تجویز رمز خان کے ذہن میں آئی۔ بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے خان دوست محمد خان سے بات کی۔

"تجویز تو معقول ہے" خان اپنی سفید ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"حشمت خان کی بہنیں جوان ہیں ..... سلامت خان کے دو بھائی کنوارے ہیں۔ ایک بہن

اس کی بھی شادی کے قابل ہے۔ حشمت خان کا بھتیجا فیروز خان بہت اچھا لڑکا ہے۔ ان کی آپس میں شادیاں کرادینی چاہئیں۔ تاکہ رشتہ داری کے بندھن مضبوط ہو جائیں.....“

سب نے سنجیدگی سے اس مسئلے کا جائزہ لیا۔ تجویز معقول تھی۔ دشمنی اور انتقام کی بیخ کنی اس طرح کی جاسکتی تھی۔ گاؤں کے یہی چیدہ اور سنجیدہ بزرگ دونوں خاندانوں کو ان اقدام پر رضامند کرسکتے تھے۔

کئی دن سوچ بچار اور اس تجویز کو دونوں خاندانوں کے سامنے رکھنے کے سلسلے میں گزر گئے۔ بالآخر دوست محمد خان نے اپنی بزرگی اور احترام کے ناطے یہ مسئلہ حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا

دونوں طرف کے بزرگوں اور جوانوں کو حجرے میں جمع کرکے خان دوست محمد خان نے شفقت محبت اور ہمدردی سے دونوں کو صلح و آشتی کا پیغام دیا۔ انہیں مرعوب کیا۔ اور پھر اس صلح اور امن کو ہمیشگی دینے کے لیے آپس میں رشتے ناطے کرنے کی بات چھیڑی۔

پہلے تو دونوں طرف کے لوگ گنگ سے ہوگئے۔ لیکن جب سب نے سمجھایا تباہی اور بربادی ٹلنے کی معقول راہ سمجھائی۔ تو دونوں نے سر تسلیم خم کردیئے۔

سر تسلیم خم کرنے میں سلامت کا پچیس سالہ بھائی رحمت خان پیش پیش تھا۔ لوگوں کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی..... رحمت خان ہی تو سب سے زیادہ جوشیلا اور غصیلا تھا۔ بھائی کا انتقام لینے کے لیے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہی اتنی جلدی رضامند ہوگیا.....بات حیرت ہی کی تھی۔

اگلے دن دوست محمد خان نے حشمت کے ساتھ حرمت خان، رحمت خان اور انہی کے خاندانوں کے چند بزرگوں کو بلایا۔

اور

حشمت کی بہن کا رشتہ رحمت خان سے کرنے کی تجویز پیش کی۔

حرمت خان نے حامی بھری ”مجھے منظور ہے۔“

لیکن

رحمت خان نے اعتراض کیا.....” میں حشمت خان کی بہن سے نہیں اس کی بیٹی سے رشتہ کروں گا۔“

”کیا؟“ حشمت کے ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی بے اختیارانہ کہہ اٹھے۔

”خان کاکا“، رحمت خان بڑے گھمبیر انداز میں بولا ”میں نے آپ کی تجویز منظور کرلی ہے۔ لیکن میں رشتہ حشمت خان کی بہن کا نہیں اس کی بیٹی کا لوں گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو رحمت خان“ بڑے بھائی حرمت خان نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا ”جانتے ہو حشمت خان کی بیٹی صرف آٹھ سال کی ہے.....“

”آٹھ کی ہو یا اٹھارہ کی میں شادی حشمت خان کی بیٹی ہی سے کروں گا۔ اس کی بہن سے نہیں“، رحمت خان نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ حشمت ششدر ہوکر اس کا منہ تکنے لگا۔

”لیکن بچے“ خان دوست محمد خان نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔ رحمت خان نے سننے کی زحمت کیے بغیر کہا ”میں نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔ منظور ہو تو ٹھیک نہیں تو..... پھر ہمارے ہاتھ آزاد ہیں......“

” رحمت خان“ حرمت خان نے پھر رحمت کو ڈانٹا۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑ گیا..... غصے سے بولا ”حشمت کی گولی سے سلامت مرا ہے۔ ہمارا معاملہ حشمت سے ہے۔ اس کے خاندان کے کسی اور فرد سے نہیں..... جان اس نے لی ہے بدلہ یہی چکائے گا۔“

وہ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ حشمت کی تو زبان ہی گنگ ہوگئی تھی۔ سب لوگ بھی متوحش سے تھے۔ صرف دوست محمد خان اور حرمت خان ہی رحمت کو سمجھاتے اور قائل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

رحمت نے ماننا کہاں تھا اپنی بات پر اڑا رہا ”منظور ہے تو ہاں کرو۔ نہیں تو ہم سب پابندیوں سے آزاد ہیں......“ وہ غرایا.....“

عجب صورت حال تھی۔ سمجھانا بجھانا بیکار تھا۔ خون خرابے کو روکنے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا تھا اس نے ایسی سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ رحمت خان نے جو بکھیڑا ڈالا تھا سوچ و سمجھ مفلوج ہو گئے تھے۔

"حشمت خان نے سلامت کی جان لی ہے۔ تاوان لینا ہے تو اسی سے لوں گا" سخت غصیلے اور فیصلہ کن انداز میں رحمت نے کہا۔

حشمت کو بھی غصہ آ گیا۔ اپنی آٹھ سالہ معصوم بچی کو وہ رحمت خان کے ساتھ کیسے بیاہ دیتا ننھی منی بچی تو ابھی شادی بیاہ کے مفہوم سے بھی آشنا نہ تھی۔ پھولوں سی مہکتی نازک بچی تھی، جسے سوائے کھیل کود کے ابھی اور بات کی خبر ہی نہ تھی۔ اس نے رحمت خان کی بات رد کر دی۔

خون کی ندیاں بہہ جانے کا پھر سے خدشہ پیدا ہو گیا.....

جو کسی کو بھی کسی طور پر منظور نہ تھا.....

چنانچہ پھر بزرگوں نے سر جوڑے صلاح مشورے کیے..... رحمت کی ضد کو جانچا پرکھا حشمت کے انکار کا جائزہ لیا......

رحمت کی بات نامعقول تھی۔ لیکن اس بات سے خون خرابہ رک سکتا تھا۔ اور پھر کم سنی کی شادیاں عام نہ سہی خاندان میں دو تین واقعے ایسے ہو بھی چکے تھے۔ شادی کر دی جاتی تھی۔ اور لڑکی کے جوان ہونے پر رخصتی ہوتی تھی..... سب نے حشمت کو سمجھایا۔ چار پانچ سال میں لڑکی جوان ہو جائے گی..... یہ قربانی ہی سہی۔ خاندان اور آئندہ نسلوں کو بچانے کے لیے یہ قربانی دے ہی دو۔ حشمت خان طبعاً صلح جو تھا۔ حالات جس رخ پہ جا رہے تھے ان کی سنگینی سمجھتا تھا۔ دل پر پتھر رکھنا ہی پڑا۔ اپنی آٹھ سالہ معصوم دردانہ گل کا ہاتھ رحمت کے ہاتھ میں دے کر خاندانی دشمنی کو دوستی میں بدلنے پر رضامند ہو ہی گیا..... اس کی بیوی نے احتجاج کیا۔ بہنوں نے آواز اٹھائی۔ لیکن حشمت دردانہ گل

کو مصلحتوں پر قربان کرنے کو زبان دے چکا تھا۔ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ بے ایمانی اس کی سرشت میں نہیں تھی۔ جو بات زبان سے نکلی پتھر پر لکیر تھی۔

فیصلہ دوست محمد خان کی موجودگی میں اسی کے حجرے میں ہوا۔ بجھے دلوں سے لوگوں نے اس فیصلے پر خوشی ظاہر کی۔ حشمت خان پتھرا سا گیا۔ رحمت خان کے چہرے پر شیطانی سی فاتحانہ چمک دیکھ کر اس کا دل ہول ہول گیا۔

دوسری شام ننھی منی دردانہ گل کو لال چمکیلے کپڑے پہنائے گئے۔ چہرے پر گلال ملا گیا۔ ہاتھوں پہ مہندی سجائی گئی۔ بچی دلہن بنتے پھولے نہ سما رہی تھی۔ نئے چمکیلے کپڑے چھن چھن کرتی جھانجر چاندی کے کڑے سونے کی بالیاں طلّے والی جوتی۔ وہ تو خوشی سے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ ماں اور پھوپھیاں رو رہی تھیں۔ ہچکیاں اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھیں۔ پھول سی بچی کو اچھے مقصد کے لیے ہی سہی۔ قربان تو کیا جا رہا تھا۔

رحمت خان اور اس کے گھر والے اور دوست ساتھی سب دھوم دھام سے آئے بے دریغ ہوائی فائر کیے گئے۔

پھر شام سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ منی سی دلہن کو ڈولے میں بٹھا کر اپنے گاؤں لے گئے۔ ماں کا کلیجہ شق تھا۔ باپ پتھرایا ہوا تھا۔ دردانہ کے جانے کے بعد سارا ماحول عجب سی وحشت کا شکار تھا۔

گھر والوں نے ساری رات تڑپ تڑپ کر گزاری۔ صبح دردانہ کی واپسی کے انتظار میں وقت گزر ہی نہیں رہا تھا۔

لیکن

وقت کی یہی اچھی عادت ہے کہ گزر جاتا ہے۔

رات گزر گئی۔

پو پھٹی۔

ابھی دن پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوا تھا کہ دردانہ گل کا ڈولہ واپس آگیا۔

گھر والے بے اختیارانہ تڑپ کے ساتھ ڈولے کی طرف بڑھے۔ تاکہ معصوم سی بچی کو باہر نکال کر سینوں میں چھپالیں۔

جب ڈولے کا پردہ اُٹھا تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ چیخیں بے اختیار ہوگئیں۔ زبانیں گنگ ہوگئیں۔

منی سی دلہن کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔ زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی۔

اور سارا جسم خون میں لت پت تھا۔

نکاح کی آڑ میں انتقام نے ہوس بن کر معصوم دردانہ کی جان لے لی تھی۔ رحمت خان نے بھائی کے قتل کا بدلہ اس طرح دھوکے سے لیا تھا۔

بس

پھر کیا تھا......

تباہی و بربادی کی ایسی آگ بھڑکی جس نے دونوں خاندانوں کو بھسم کر ڈالا۔ سلامت خان کے گھر کا کوئی فرد بچ نہ پایا نہ حشمت خان کا۔

ان کے ٹوٹے پھوٹے ویران اور غیر آباد مکان آج بھی گاؤں میں عبرت کا نشان بنے ہوئے ہیں آج بھی ان پر اتنی وحشت برستی ہے کہ کوئی بھی انہیں آباد کرنے کا خیال نہیں کرتا۔

انمول ہیرا

ہوائی جہاز کا سفر وہ زندگی میں پہلی بار کرنے والی تھی لیکن دوشیزگی سے ازدواجی زندگی کا سفر وہ دوسری بار کر رہی تھی...... اس لیے خوف تجسّس شوق اور گھبراہٹ فطری بات تھی۔ لاؤنج میں وہ اپنے میکے کے عزیزوں میں گھری بیٹھی تھی...... ماں تسلیاں دے رہی تھی۔ بھائی ہمت بندھا رہے تھے بہنیں دلاسے دے رہی تھیں۔ وہ خوش بھی تھی۔ لیکن اک انجانا سا خوف بھی حواس پر مسلط تھا۔ کچھ ماہ پہلے اس کا نکاح سہیل سے ہوا تھا۔ سہیل لندن میں ساٹھ آٹھ سال سے مقیم تھا۔ مکینیکل انجینئرنگ اس نے وہیں کی تھی اور پھر وہیں ایک اچھی جاب مل گئی تھی..... اب وہ خاصا خوشحال تھا۔ اپنا فلیٹ بھی خرید لیا تھا ..... جس میں سہولت کی ہر چیز موجود تھی...... کمی تھی تو صرف بیوی کی..... یوں تو اس کی کئی دوست تھیں..... انگریز، انڈین، جرمن، ہسپانوی، فرانسیسی لڑکیاں اس کی دوست تھیں..... وہ بڑا خوبرو اور بڑا وجیہہ نوجوان تھا..... اخلاق بھی اچھا تھا..... اس لیے اسے دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ لڑکیاں بھی اسے ناپسند نہ تھیں۔ میری راتھر کی نیلگوں آنکھوں اور سنہری بالوں کو وہ بہت پسند کرتا تھا جرمن لڑکی مرتھا کی دھیمی دھیمی باتیں اسے اچھی لگتی تھیں ماریہ کی سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں میں عربوں کی جھلک تھی..... فرانسیسی لڑکی جینا وغیرہ وغیرہ ..... یہ سب لڑکیاں اسے شادی کی آفر کر چکی تھیں..... اور اپنے معاشرے کے مخصوص طریق سے بنا شادی بھی اس کے ساتھ رہنے کو تیار تھیں..... ایسے کئی کپل تھے جو شادی کو اک دردسری اور مفت کا بندھن سمجھ کر اس سے انکاری ہونے کے باوجود اکٹھے میاں بیوی

ہی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ لیکن سہیل کے من کو یہ بات لگتی ہی نہیں تھی..... اس کی دوستی ان لڑکیوں سے ہنس بول لینے...... سے آگے نہیں بڑھی تھی، وہ ان لڑکیوں کو ناپسند نہیں کرتا تھا لیکن ناپسند نہ کرتے ہوئے بھی وہ اسے پسند بھی نہیں تھیں۔ ان لڑکیوں میں جھجک نہیں تھی..... جرأت و دلیری تھی..... وہ ہر مسئلے پر بلا جھجک گفتگو کر لیتی تھیں..... حتیٰ کہ سیکس کے معاملے میں بھی..... ان کی گفتگو ڈھکی چھپی نہ ہوتی تھی..... ہر چیز پر سیر حاصل تبصرہ کرتیں، ہر ضرورت کو کھول کر بیان کرتیں..... اور یہی باتیں سہیل کو ناپسند تھیں..... عورت کا تصور اس کے ذہن میں وہی تھا..... جو اک مشرق کے رہنے والی کا ہوتا ہے..... سات آٹھ سال اس معاشرے میں گزارنے کے بعد بھی وہ اپنے اسی تصوّر پر قائم تھا..... اس معاشرے کی آزادانہ روش سے اس کی ذہنی تبدیلی نہیں ہوئی تھی..... بلکہ وہ تو اس کھلم کھلا آوارگی سے متنفر ہو کر کچھ زیادہ ہی مشرقیت کی طرف جھک گیا تھا۔ اس لیے جب شادی کی طلب ہوئی اور وہ اس کے متعلق سنجیدہ ہوا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے دیس کی کسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہی سے شادی کرے گا۔

لیکن

یہ بھی اک مسئلہ تھا..... اس کے والدین حیات نہیں تھے..... ایک بہن تھی جس کی شادی تین سال پہلے ہوئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہانگ کانگ چلی گئی تھی..... بڑا بھائی تھا..... جو امریکہ میں تھا اور ایک میکسکن لڑکی سے شادی کر کے وطن اور رشتہ داری کے بندھنوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ دور پار کے رشتہ دار تو تھے لیکن انہیں لڑکی تلاش کرنے کی زحمت دینا اچھا نہیں لگتا تھا..... پھر وہ ان لوگوں کی پسند پر اعتماد و انحصار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کیا کرے؟ یہی سوچتا رہتا..... لیکن مسائل حل ہونے ہی کے لیے تو ہوتے ہیں، لگن سچی اور جذبے راسخ ہوں تو کنارے خود ہی قریب آ جاتے ہیں۔ چند دن ہی پہلے اس

کی ایک پارٹی میں جو پاکستانی اور ہندوستانی فیمیلز نے تقریب بہر ملاقات کے طور پر دی تھی..... اس کی ملاقات عرفان سے ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو جیسے اپنی اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔

"ارے تم" دونوں کے منہ سے بے اختیارانہ ایک جیسا کلمہ ہی نکلا..... دوسرے لمحے دونوں کمان سے نکلے تیر کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بڑے تپاک و خلوص سے بغل گیر ہو گئے۔ ملنے کا انداز اور جذبہ بے اختیاری دوسروں کی توجہ کا بھی مرکز بن گیا..... سب شوق اور دلچسپی سے دونوں کو دیکھنے لگے..... دونوں ایک دوسرے سے لپٹے حال احوال پوچھ رہے تھے کہ مسز ارادھنا ملہوترا نے ہنس کر کہا "بھئی یہ پارٹی کے آداب کے خلاف ہے"

رضوان احمد بولے "بالکل..... ہمیں بھی تو پتہ چلے کیا مل گیا تم دونوں کو....." باری باری سب نے ایسے ہی کلمات کہے تو سہیل عرفان کا ہاتھ پکڑے سب کی طرف گھوما "اک انتہائی پیارا اور جگری دوست مل گیا ہے..... اس سے خوشی کی اس وقت کوئی اور بات ہو سکتی ہے"

"تو تم دونوں دوست ہو" نجم نے عرفان کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں..... بہت عزیز دوست" عرفان بولا۔

"تم اتنے دنوں سے آئے ہو....." مسز اشرف نعمانی نے عرفان سے کہا "دوست سے اب تک ملے ہی نہ تھے؟" "مجھے پتہ نہیں تھا کہ سہیل یہاں ہے۔"

"پھر یہ کیسی دوستی؟" کسی نے آوازہ کسا "دوستی ایسی کہ....." سہیل نے سب کو مخاطب کر کے کہا "زندگی کی راہیں تعلیمی دوران ہی میں الگ ہو گئی تھیں میں یہاں اس وقت آیا تھا جس وقت عرفان اپنی سٹڈیز کی تکمیل کے لیے کراچی جا چکا تھا اس کے بعد کوئی خاص رابطہ ہی نہ رہا..... میں صرف ایک بار پاکستان گیا..... لیکن عرفان لاہور میں نہیں تھا پتہ چلا مڈل ایسٹ

کے کسی ملک میں ہے؟"

"بڑے پاپڑ بیلے ہیں....." عرفان نے ہنس کر اس سے کہا دونوں لوگوں سے پیچھا چھڑا کر ایک کونے میں صوفے پر آ بیٹھے۔" اب یہاں کیسے" سہیل نے پوچھا۔ تین ہفتے کے لیے آیا ہوں۔"

"کرتے کیا ہو؟"

"نوکری"

"پاکستان ہی میں.....؟"

"ہاں ان دنوں پاکستان ہی میں ہوں، تین ہفتے کے کورس کے لیے یہاں آیا ہوں" پھر وہ اسے اپنی جاب اور کورس کے متعلق بتانے لگا..... سہیل نے اپنے متعلق اسے تفصیل سے بتایا۔" ٹھہرے کہاں ہو؟" اس نے باتوں باتوں میں پوچھا۔" الاؤنس تو ملے گا..... لیکن بچت کر رہا ہوں ایک عزیزہ ہیں دور پار کی ان کے ہاں ٹھہرا ہوں۔"

"آج سے تم میرے مہمان ہو....."

"نہیں یار..... ٹِک گیا ہوں..... دس دن تو باقی ہیں وہ بھی....." "وہ میرے گھر میں گزریں گے سمجھے تمہیں آج ہی میرے ہاں شفٹ ہونا ہوگا..... حد ہو گئی..... میرے ہوتے ہوئے تم میرے ہاں نہ رہو؟ یار میں بھی اکیلے رہتے رہتے بور ہو چکا ہوں۔ آؤ نا میرے پاس ..... میری خاطر سہی..... میری تنہائی کی خاطر ہی سہی....."

عرفان حامی بھرتے ہوئے مسکرا کر بولا....." ویسے یہاں تنہائی ہوتی تو نہیں....." "تم ٹھیک کہتے ہو......

کم از کم میں تو ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔" پارٹی شروع ہوئی کھانے پینے کے لیے لوگ اٹھے تو وہ دونوں بھی اُٹھ کر میز کی طرف آ گئے سہیل بہت خوش تھا..... اسے یوں لگ رہا تھا کوئی پُرانا دوست نہیں سگا بھائی اتفاقاً مل گیا ہے۔ رات وہ اسے اپنے فلیٹ میں

لے آیا..... عرفان کا مختصر سا سامان تھا..... ایک اکیلی جان تھی.... دونوں ایک ہی کمرے میں بھی رہ سکتے تھے لیکن دو بیڈ روم کا فلیٹ تھا..... سہیل نے گیسٹ روم میں اس کا سوٹ کیس اور بیگ رکھ دیا۔ پارٹی میں کافی کچھ کھا پی لیا تھا اس لیے دونوں ہی کو بھوک نہیں تھی پھر بھی سہیل نے سنیکس اور کافی بنائی..... دونوں ڈرائنگ روم میں قالین پر تکیے اور گدیاں رکھ کر نیم دراز مزے سے کھاتے پیتے باتیں کرنے لگے، پرانی باتیں یاد کر کے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسی دور میں پہنچ گئے ہیں بے فکرے جنہیں آج کی خبر تھی نہ کل کی.....

"کتنے اچھے دن تھے وہ" سہیل نے کہا۔

"ہاں!..... اب تو جنجال ہی جنجال ہیں..... ایک سے جان چھوٹتی ہے تو دوسرے میں پھنس جاتی ہے..... ذمہ داریوں کے بوجھ نے تو ابھی سے کمر توڑ دی ہے میری....." عرفان بولا۔

"شادی کر لی"

"نہیں"

"تو پھر کن ذمہ داریوں نے اتنا بار ڈالا کہ کمر ٹوٹ گئی" عرفان نے کافی کا مگ واپس رکھتے ہوئے کہا" بس گھریلو ذمہ داریاں ہی ہیں..... سارا بار میرے سر ہے تین بہنوں اور دو بھائیوں کا بوجھ....."

"تمہارے ابا....."

"ان کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا....."

"اوہو....."

"سارا بوجھ اب مجھ پر ہی ہے نا....."

"وہ تو ظاہر ہے....." دونوں سوگوار سے انداز میں باتیں کرنے لگے..... عرفان کی حالت پر سہیل کو بڑا ترس آیا..... اس کے ابا کے مرنے سے واقعی اس پر ذمہ داریاں آن

پڑی تھیں.....“

”اپنے ہاں کے رسم ورواج تم جانتے ہی ہونا.....“

”لوگ اب تک نہیں بدلے؟“

”بدلے! توبہ کرو..... روز بروز وبا کی طرف پھیل رہے ہیں رسم ورواج.... خاص کر شادیوں پر لین دین کے معاملے تو اب جان لیوا ہو گئے ہیں.....“ ”واقعی؟“ ”ہاں دوست..... ہمارے ساتھ یہ ٹریجڈی ہو چکی ہے..... بڑی بہن کی شادی کی تھی..... عام سے مڈل کلاس ہی کے لوگ تھے..... اپنی طرح کے..... اماں نے یہ سوچ کر رشتہ طے کر دیا کہ ہماری ہی حیثیت کے لوگ ہیں..... نبھ جائے گی..... لیکن.....“

”لیکن کیا ہوا.....“

”جہیز ان لوگوں کو پسند نہیں آیا..... ان کی توقعات سے بہت کم تھا..... اس جرم کی پاداش بہن کو بھگتنا پڑی ہم لوگ ان کے مطالبات کہاں سے پورے کرتے نتیجہ.....“

”کیا ہوا؟“

”طلاق.....“

”او مائے گاڈ.....“ عرفان نے اک گہری سانس لی..... ”کتنا ظلم ہے.....“ ”لیکن کیا کریں..... سہنا پڑتا ہے..... وہ دو سال سسرال میں رہی..... سال بھر تو اس کی فرمائشیں پوری ہوتی رہیں..... کہ ابا زندہ تھے..... جب بھی روتی آتی..... سسرال والوں کا کوئی نہ کوئی مطالبہ ساتھ لے کر آتی..... ابا بیچارے جیسے بھی بن پڑتا مطالبہ پورا کر دیتے..... بہلا پھسلا کر اسے واپس بھیج دیتے..... بیٹی کا گھر آباد ہی رکھنا چاہتے تھے..... لیکن ابا کے فوت ہونے کے بعد ساری ذمہ داریاں مجھ پر آ گئیں.....“

”ہوں“

”ادھر ان کے مطالبات بھی بڑھنے لگے..... ہماری مجبوریوں کا وہ لوگ ناجائز فائدہ

اٹھانا چاہتے تھے میں تو عاجز آ گیا..... میرے وسائل اتنے کہاں تھے..... ایک دو بار تو تنگی ترشی سے بات پوری کر دی..... لیکن پھر میں بے حسی کا مظاہرہ کرنے لگا..... نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے روشی کو گھر سے نکال دیا۔“

”ہوں“

”صرف نکالا ہی نہیں تیسرے مہینے طلاق بھی بھجوا دی۔“ ”اوہ خدایا..... بیچاری لڑکی.....“ ”ایک کا یہ حال ہوا..... ابھی دو اور ہیں وہ بھی جوان ہیں..... ان کے لیے رشتے بھی آ رہے ہیں..... لیکن مجھے تو کہیں نام لیتے بھی ڈر لگتا ہے..... سچ کہوں تو میں روشی کا بھی مجرم اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہوں میں اس کے مطالبے پورے کرتا رہتا تو شاید اپنے گھر میں آباد ہی رہتی.....“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”میرے ہاں..... کہاں جائے گی..... اس نے بی اے میں تعلیم چھوڑی تھی..... اب پھر سے داخلہ لے لیا ہے..... اچھا ہے پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر تو کھڑی ہو جائے گی..... تیئس سال کی تو ہوئی ہے ابھی..... بی اے بی ایڈ کر کے نوکری.....“

”ساری عمر اسے ایسے ہی گزارنا پڑے گی؟“

”تو کیا کرے گی..... اتنا تلخ تجربہ ہوا ہے اسے شادی کا“ ”بہت دکھ ہوا یار..... کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں..... لالچی ظالم..... زندگی تباہ کر دیتے ہیں..... اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا“ ”لڑکے والے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں.....“

”لعنت ہے۔“

”یہ تم کہتے ہو نا..... اپنے معاشرے میں تو ناسور کی طرح پھیلتی جا رہی ہے یہ بیماری..... معمولی سی معمولی حیثیت کا لڑکا بھی زیادہ سے زیادہ جہیز کی توقع رکھتا ہے..... راتوں رات امیر ہونے کا رجحان ہمارے ہاں وبا کی طرح پھیل رہا ہے..... لوگ اس کے لیے

اخلاق کردار اور دوسری انسانی صفات کو داؤ پر لگا دیتے ہیں..... بڑا جہیز بھی اسی سلسلے کی
کڑی ہے.....“ دونوں بڑی دیر تک یہی باتیں کرتے رہے..... عرفان ایک مخلص دوست
کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا..... سہیل کو اس بات کا احساس تھا..... اسی لیے
پوری دلجوئی اور دھیان سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ رات کافی اتر آئی تھی..... دونوں نے
صبح کام پر بھی جانا تھا..... اس لیے عرفان نے سہیل سے کہا ”اب سونا چاہیے..... بہت
وقت بیت گیا..... یہ داستانیں تو ختم ہونے کی نہیں..... میں نے اپنی پریشانیاں بتا کر تمہیں
بھی پریشان کیا.....“

”دوست ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو..... عرفان ہم ایک طویل عرصہ ایک دوسرے سے
مل نہیں پائے نہ ہی ایک دوسرے کی خیر خبر کا پتہ تھا لیکن آج تم سے مل کر جتنی خوشی مجھے ہوئی
ہے بتا نہیں سکتا میں اب بھی تمہارا وہی سہیل ہوں.....“ ”میں بھی یہی سمجھتا ہوں سہیل.....
اسی لیے تو تمہارے سامنے دل کا بار ہلکا کر لیا.....

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے اب بھی اپنا سمجھا.....“ عرفان اس کے خلوص سے بڑا
متاثر ہوا..... سہیل نے عرفان کی دلجوئی اور دلاسے کی باتیں کیں..... پھر دونوں سونے کے لیے
اُٹھ گئے..... دوسری شام دونوں نے اکٹھی گزاری..... سہیل نے عرفان کو خوب گھمایا پھرایا.....
سارا خرچہ اس نے ہی کیا اگلے دن وہ پھر اکٹھے گھومنے گئے..... عرفان نے چاہا کہ آج وہ سہیل
کو کھانا کھلائے..... لیکن سہیل نے ایسا کرنے نہیں دیا ”تم میرے مہمان ہو.....“ اس نے
مسکرا کر کہا۔

”اب دس دن یہاں بیٹھا رہوں، تو مہمان ہی بنا رہوں گا.....“ ”دس دن کیا دس
سال بھی بیٹھے رہو..... تو تمہیں مہمان بنا کر مجھے خوشی ہوگی“

”بہت مالدار ہو.....“

”اللہ کا فضل ہی ہے..... بہت کچھ دے رکھا ہے اس نے“

”شروع ہی سے قسمت کے دھنی ہو تم.....“ ”اس کا احسان ہے“ سہیل نے آسمان کی
طرف دیکھ کر کہا۔

”واقعی“

دونوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا..... بل سہیل ہی نے ادا کیا۔

”کل رات میں تمہیں اپنے ہاتھ کا بنا کھانا کھلاؤں گا.....“ سہیل نے عرفان سے کہا ”کھانا
پکانا بھی سیکھ گئے؟“

”یہاں زندگی کے دستور ہی ایسے ہیں..... سارے کام خود کرنا پڑتے ہیں۔ کھانا تو میں
بہت عمدہ بناتا ہوں“

”اپنی تعریف کیے جاؤ..... کھلاؤ گے تو دیکھیں گے“ عرفان نے ہنس کر کہا۔ اگلی شام
دونوں گھر پر ہی رہے..... گپ شپ لگاتے رہے اور کھانا بناتے رہے عرفان سہیل کی مدد
کر رہا تھا..... کبھی کوئی برتن پکڑا دیا کبھی کوئی چیز واپس اپنی جگہ پہ رکھ دی..... سہیل ایپرن
باندھے بڑی مستعدی سے کھانا بنا رہا تھا..... وہ کام میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس
نے فون اٹھایا ”ہیلو کون.....“

”مرتھا بول رہی ہوں..... تم دو تین دن سے کہاں غائب ہو.....“

”بہت مصروف تھا.....“

”اب تو گھر پر ہونا..... کئی بار رنگ کر چکی ہوں.....“

”گھر پر ہی ہوں“

”میں آجاؤں“

”نہیں.....“

”کیوں“

”میرا پاکستانی دوست آیا ہوا ہے..... میں اس کے ساتھ بزی ہوں.....“ ”تم مجھے تھوڑا سا

وقت بھی نہیں دے سکتے۔"

"نہیں..... سوری....."

"وہ کب تک رہے گا یہاں"

"جب چلا جائے گا تو تمہیں بتا دوں گا....."

مرتھا باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن سہیل نے چند جملے کہہ کر فون بند کر دیا۔"کس کا فون تھا؟"
عرفان نے کہا"میری وجہ سے تم اسے وقت نہیں دے سکے۔"

"کوئی بات نہیں..... ایک دوست تھی۔"

"تھی یا تھا....."

"تھی" سہیل ہنس کر بولا۔

اچھا اچھا..... کل بھی ایک لڑکی کا فون تھا..... تمہیں بتانا بھول ہی گیا تم آفس جا چکے تھے میں جانے والا تھا کہ....."

"فون آتے ہی رہتے ہیں..... میری یا ماریہ....."

"نہیں..... شاید جینا نام بتایا تھا" "ہاں وہ فرانسیسی لڑکی....."کے حساب سے پال رکھی ہیں لڑکیاں..... عرفان نے مذاق سے کہا۔

"تمہیں ملاؤں گا سب سے....."

سب سے؟

"ہاں..... سب ہی سے اچھے مراسم ہیں....."

"کیسے نبھا کر لیتے ہو۔

"یہ راز کی باتیں ہیں یار....." وہ ہنس پڑا۔

"فلرٹ ہو"

"میرے ان سب سے صرف دوستی کی حد تک مراسم ہیں" تو پھر کسی ایک کو چن کیوں

نہیں لیتے.....

"آرام سے بیٹھ کر یہ سنجیدہ باتیں کریں گے..... پہلے کھانے سے فارغ ہو لیں۔ رات پھر وہ ایک دوسرے کے سامنے قالین پر بیٹھے تھے۔ عرفان چوکڑی مارے کشن گود میں رکھے بیٹھا تھا..... سہیل نے دو تکیے بازو تلے دبائے ہوئے تھے دونوں کے درمیان کافی کے مگ اور جگ پڑے تھے باتیں کرتے ہوئے کافی پی رہے تھے اب سہیل نے اپنے اور عرفان کے لیے دوسرا مگ بھرا تھا..... باتیں ان لڑکیوں کی ہو رہی تھیں..... اس معاشرے کی ہو رہی تھیں..... عرفان نے اس سے کہہ دیا تھا کہ جب اتنی لڑکیاں شادی کی آفر کر رہی ہیں..... پھر تمہیں کیا اعتراض ہے جبکہ اس نے اسی معاشرے میں رہنا ہے۔" تم شاید ٹھیک کہتے ہو..... لیکن میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا..... میں یہاں شادی نہیں کروں گا..... یہاں شادی کا وہ تصور نہیں جو ہمارے ہاں ہے....." عرفان طنز سے بولا" بہت عمدہ تصور ہے ہمارے ہاں شادی کا..... ہونہہ..... وہاں شادی اب تجارت کا روپ دھار گئی ہے۔ دور بیٹھے ہو نا اس لیے اپنے معاشرے کو اتنا عظیم سمجھتے ہو..... بہت انتشار ہے وہاں..... جینا چاہو تو جی نہیں سکتے..... مرنا چاہو تو مر نہیں سکتے..... والی بات ہے۔

"یار سب لوگ تو ایک جیسے نہیں ہوتے..... اب بھی وہاں وفا شعار لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی..... اب بھی بے غرض لڑکوں کا قال نہیں ہو گا..... تمہارے ساتھ چونکہ اتنا گھناؤنا مذاق ہو چکا ہے اس لیے تم ایسا سمجھتے ہو....."

"شاید....."

"یہاں بیوی کا وہ تصور نہیں عرفان..... جو ہمارے ہاں ہے..... یہاں بیوی بیوی نہیں صرف پارٹنر ہوتی ہے جس کے اپنے اصول اور قاعدے ہوتے ہیں اور شوہر ان اصولوں اور قوائد میں مخل نہیں ہو سکتا اگر ان سے ٹکرائے گا تو علیحدگی یقینی ہے۔ طلاق کی شرح جتنی ان ممالک میں ہے اپنے ہاں تو نہیں....."

"وہاں بھی بڑھ رہی ہے۔"

"لیکن ایسے حالات کے تحت نہیں..... وہاں طلاق انتہائی مجبوری اور ناقابل برداشت حالات میں ہوتی ہے.... پانی سر سے گزرنے لگے تو علیحدگی کا سوچا جاتا ہے یہاں تو معمولی سا اختلاف بھی سیپریشن کا باعث بن جاتا ہے...؟" دونوں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

"یہاں عورت آزاد ہے اور آزاد رہنا چاہتی ہے۔ بے باک ہے بے لگام ہے.....اور یہی چیزیں مجھے پسند نہیں۔"

"میں تو سمجھتا ہوں ٹھیک ہی ہے..... عورت کو ایسے ہی ہونا چاہیے روشنی کی مثال لے لو.... چپ چاپ ظلم جھیلے گئی.... احتجاج نہیں کیا آواز نہیں اٹھائی.... اور بے داغ زندگی پر طلاق کا داغ لے کر واپس آگئی..... ہمیشہ کے لیے کرب و آزار سہنے کے لیے.....

یہ معاشرہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ اگر ایک مرد سے بن نہیں آتی تو دوسرے کا ہاتھ تھام لینا مشکل نہیں ہوتا..... اپنے ہاں تو طلاق کا داغ اتنا مکروہ ہے کہ ایک بار لگ جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے.... بیوہ کا نکاح ثانی ہونا ممکن ہے لیکن مطلقہ کے لیے کوئی چانس نہیں..... خاص ہم جیسے متوسط گھرانے کے لوگوں میں..... کوئی خوش نصیب ہی مطلقہ ہوتی ہوگی جسے کوئی مرد خوشی سے قبول کرتا ہوگا....." عرفان بولتا گیا سہیل خاموشی سے سنتا رہا.....

"کچھ بھی ہو..... میں شادی یہاں نہیں کروں گا....."

"تو کہاں کرو گے؟"

"پاکستان میں۔"

"ہے کوئی لڑکی نظر میں؟"

"ہوگی کہاں.... سات آٹھ سال سے تو میں یہاں ہوں.....ماں باپ ہیں نہیں..... ڈھونڈے گا کون رشتہ....."

"اعتماد ہو تو یہ فرض مجھے سونپ دو..... میں امی سے کہوں گا کہ تمہارے لیے اچھی سی

لڑکی تلاش کر دیں" سہیل نے گہری نظروں سے عرفان کو دیکھا.....

"لیکن ایک بات ہے" عرفان جلدی سے بولا۔

"کیا؟"

"تمہاری پسند کا ہمیں کیا پتہ....."

"یوں کرو.... تم پاکستان چلو نا.... امی تمہارے لیے لڑکیاں دیکھ لیں گی.... تم خود دیکھ لینا جو پسند آگئی بات کروا دیں گے۔"

"پکی بات"

"بالکل پکی.... دوست ہو.... بھائی ہو میرے..... تمہارے لیے اتنا سا کام بھی نہ کروں گا بھلا....."

"ٹھیک ہے.... تم جا کر امی سے بات کرنا....."

"ہاں.... امی کا ملنا جلنا ہے کافی لوگوں سے..... وہ دنوں میں پانچ سات لڑکیاں ڈھونڈ نکالیں گی..... بھئی ہمارے ہاں اچھے رشتوں کا بھی تو مسئلہ ہے.... اچھے لڑکے سونے کے مول بکتے ہیں...." وہ ہنس کر بولا" تمہاری ڈیمانڈ کیا ہوگی.... جہیز کا چکر...."

"عرفان.... مجھے جہیز وہیز کی ضرورت نہیں.... میرے پاس جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے میری ایک ہی ڈیمانڈ ہے....."

"کیا"

"لڑکی شریف ہو.... حالات سے سمجھوتہ کرنے والی ہو.... سیدھی سادی بھولی بھالی اور سب سے بڑی بات کہ بیوی بن کر رہنا چاہتی ہو.... عورت کے حقوق و فرائض سے بے بہرہ نہ ہو.... ایسی لڑکی چاہیئے مجھے..... بس.... ایسی لڑکی کی ڈیمانڈ ہے میری...."

عرفان کچھ ڈرے ڈرے لہجے میں بولا" متوسط طبقے کے شریف گھرانوں کی سب ہی لڑکیاں تقریباً ایسی ہوتی ہیں سہیل۔ ان کی تربیت ایسے خطوط پر ہی کی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے ایسی

لڑکیاں بھی پٹ جاتی ہیں..... روشی کی مثال سامنے ہے..... خیر... چھوڑو یہ باتیں اور شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہو تو چھٹی لے کر پاکستان آجاؤ..... تمہارے لیے اچھی سی لڑکی تلاش کر لی جائے گی......"

"خوش رہو دوست..... میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں" عرفان اگلے ہفتے واپس پاکستان چلا گیا..... سہیل نے اس کی امی بہنوں اور بھائیوں کے لیے کچھ تحائف بھیجے۔ اور خود بھی چھٹی لے کر آنے کا وعدہ کیا..... عرفان نے اس کے لیے اچھی سی لڑکی تلاش کرنے کا پکا وعدہ کیا تھا..... اور تلاش کر کے اطلاع دینے کا بھی کہا تھا..... تب ہی سہیل کا پاکستان جانے کا پروگرام بن سکتا تھا۔ عرفان چند دن تو اپنے دفتری کاموں میں مصروف رہا سہیل کے متعلق اس نے سرسری طور پر امی کو بتایا تھا..... ان کے لیے تحائف جو سہیل نے بھیجے تھے..... اس دن ایسے ہی امی نے عرفان سے پوچھ لیا "تیرے دوست کی شادی ہو چکی ہے۔

"نہیں..... عرفان نے جلدی سے کہا" اس نے ابھی شادی کرنی ہے..... وہ پاکستانی لڑکی ہی سے شادی کرے گا میں نے تو اس سے وعدہ کیا تھا کہ اچھی سی لڑکی تلاش کریں گے ہم لوگ اس کے لیے..... آپ سے کہنا بھول ہی گیا ہاں امی سہیل کے لیے نیک شریف مہذب اور شائستہ سی لڑکی چاہیے اسے جہیز کی ضرورت نہیں..... نہ ہی کوئی اور مطالبہ ہے....." روشی پاس ہی بیٹھی تھی..... وہاں رہتے انہیں سات آٹھ سال ہو چکے؟"

"ہاں"

"کردار کیسا ہے ان کا..... یہ نہ ہو..... کسی پرائی لڑکی کو مفت میں پھنسا دو"

"وہ بہت عمدہ اور بڑا ہی نفیس انسان ہے..... وہاں اسے لڑکیوں کی کمی نہیں..... لیکن وہ شادی پاکستانی لڑکی سے کرنا چاہتا ہے....." عرفان سہیل کی تعریفیں کرنے لگا..... روشی کبھی کبھی کوئی سوال کر دیتی، وہ جواب سے مطمئن کر دیتا..... امی ان کی باتیں غور سے سن رہی تھی..... عرفان سہیل کے لیے جس قسم کی لڑکی تلاش کرنے کے لیے کہہ رہا تھا جن صفات

اور خوبیوں کی باتیں کر رہا تھا... کیا وہ عصمہ میں نہیں تھیں..... کیا روبینہ ان سے عاری تھی..... یہ دونوں روشی سے چھوٹی تھیں عصمہ بی اے فائنل میں تھی اور روبینہ تھرڈ ائیر میں۔ دونوں جوان تھیں سمارٹ اور خوش شکل تھیں۔..... ان کی تربیت امی نے جس طرح کی تھی وہ سہیل کے معیار پر پورا اتر سکتی تھیں۔..... تھی تو روشی بھی ایسی ہی..... لیکن اس ہیرے کو اناڑی لوگ پرکھ ہی نہ سکے..... امی اب عصمہ اور روبینہ جیسے ہیروں کو بھی جوہر ناشناس ہاتھوں میں نہیں دے سکتی تھیں..... سہیل کی تعریفیں سن کر ان کا جی چاہ رہا تھا جھٹ سے کہہ دیں "عصمہ اور روبینہ دونوں میں سے کسی کا کروا دو رشتہ....." وہ ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ روشی نے بھائی سے کہا "ایسی لڑکی ڈھونڈنے کا کہہ رہے ہو..... عصمہ تمہیں نظر نہیں آتی..... اتنا ہی اچھا لڑکا ہے وہ..... تو کروا دو نا عصمہ کا رشتہ..... روبینہ بھی ہے دونوں میں سے ایک کا ہو جائے..... تو....."

"تم نے میرے منہ کی بات چھین لی..... میں بھی یہی کہنے والی تھی... روشی نے جو دکھ جھیلے ہیں شاید ان کا ازالہ عصمہ کے سکھی رہنے سے ہو جائے....." عرفان اس وقت تو چپ ہو گیا لیکن سوچا تو بات موزوں ہی لگی کیا ہرج تھا..... عصمہ بھی تھی روبینہ بھی.... سہیل دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے تو انہیں خوشی ہو گی۔ وہ کئی دن سوچتا رہا کہ اس سلسلے میں سہیل کو خط لکھے..... لیکن کچھ جھجک سی آجاتی تھی اپنی ہی بہنوں کے لیے کہنا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا..... وہ ابھی کشمکش و پیچ ہی میں مبتلا تھا کہ ایک دن سہیل کا فون اس کے آفس میں آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد سہیل نے پوچھا "جا کر بھول گئے سب کچھ، کیا وعدہ کر کے گئے تھے؟ ہوں....."

"نہیں بھولا تھا یار....."

"پھر تلاش کی....."

اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا "ہاں کر لی....."

"میری پسند اور معیار پر پوری اترے گی نا....."

"آکر دیکھ لینا.....دو لڑکیاں ہیں.....جسے پسند کرو گے"

مجھے صرف ایک چاہیے..... اور سنو میں اس بدھ کو آرہا ہوں.....چھٹی لے لی ہے..... ٹھہروں گا تمہارے ہی پاس..... کسی ہوٹل وہوٹل میں نہیں جاؤں گا..... تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا....."

"حد کردی تم نے.....میرا گھر تمہارا اپنا گھر ہے جب اور جس وقت آؤ بے دھڑک آ سکتے ہو.....میرے گھر والے تمہیں خوش آمدید کہیں گے..... تم ان کے لیے اب اجنبی نہیں ہو..... تمہارا تعارف میں نے سب سے کروادیا..... بلکہ یہ کہوں کہ امی تمہارے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہیں تو بے جا نہ ہوگا....."

"ان کی شفقتوں اور محبتوں کی مجھے ضرورت ہے سہیل....."

"میری امی بہت شفیق ہیں تمہیں ماں کا بدل مل جائے گا ایک بار آکر دیکھو تو سہی....."

"شکریہ"

پھر چند باتوں کے بعد سہیل نے فون بند کردیا.....

بدھ کی شام کو وہ پاکستان کی مقدس سرزمین پہ قدم رکھتے ہوئے آبدیدہ سا ہوگیا تھا۔ .....عرفان کے ساتھ اس کی امی اور روشی اسے لینے آئے تھے۔ امی نے اسے گلے لگاکر اس کا ماتھا چوما تو اسے اپنی ماں یاد آگئی..... اس نے بڑے پیار سے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگالیے روشی نے بھی مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔ سہیل نے اک نگاہ اس پر ڈالی..... وہ خاصی پیاری لڑکی تھی..... لیکن اس کی آنکھوں میں جما ہوا آزار تھا..... اس کے چہرے پر بیتے لمحوں کی دکھ بھری روئیداد رقم تھی۔ سہیل بڑی اپنائیت محسوس کررہا تھا۔ اسے ان لوگوں سے مل کر یوں لگا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں آگیا ہو..... رات کا کھانا خاصہ پرتکلف تھا امی اور روشی نے بڑے اہتمام سے مشرقی کھانے بنائے تھے۔ میز پر رنگا رنگ کھانے دیکھ کر

سہیل نے کہا" ماں جی! آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا میں کوئی غیر تو نہیں آپ تو مجھے اپنا بیٹا کہہ رہی ہیں....."

"اسی لیے تو یہ سب کچھ کیا ہے..... سوچا تھا برسوں سے تم پرائے دیس میں ہو..... اپنے دیس کے کھانوں کی طلب ضرور ہوگی"

"بہت بہت شکریہ ماں جی"

"اوں ہوں شکریئے کی بات ماں بیٹے میں نہیں ہوتی..... میں نے پیار سے سب کچھ بنایا ہے تم رغبت سے کھاؤ گے تو شکریہ آپوں آپ ادا ہو جائے گا۔"

کھانے کی میز پر روشی اور چھوٹے بھائیوں کے علاوہ عصمہ اور روبینہ بھی آگئیں روشی نے بہنوں کا تعارف اس سے کروایا دونوں جھجکی جھجکی شرمائی لجائی بیٹھی تھیں سہیل نے انہیں دو تین بار گہری گہری نگاہوں سے دیکھا شکل وصورت تو دونوں کی روشی سے ملتی جلتی تھی لیکن ان کی رنگتیں حوادثات کے دھوئیں سے دھندلائی نہیں تھیں، نگاہوں میں بھی بوجھل تاثر نہیں تھا..... امید اور خوشی کے دیپ جل رہے تھے ان کی آنکھوں میں.....

وہ ان سے ان کی تعلیم اور سبجیکٹس کے متعلق پوچھنے لگا۔ روشی اس سے بے تکلفی سے باتیں کررہی تھی..... بہنوں کی جگہ زیادہ تر جواب وہی دے رہی تھی اس کا لہجہ بڑا شستہ اور مہذب تھا۔

"آپ بھی تو طالبہ ہیں" سہیل نے اچانک ہی کہا۔

"ہاں میں نے بی اے کا امتحان دیا ہے....."

"آگے کیا ارادہ ہے"

"پاس ہوگئی تو بی ایڈ کرلوں گی"

"یعنی پاس ہونا مشکوک ہے" سہیل نے ہولے سے مذاق کیا۔

"بالکل..... جن حالات میں میں نے پڑھا اور امتحان دیا ہے..... شک کی گنجائش نکلتی

ہے..... شاید عرفان نے میرے متعلق آپ کو سب کچھ بتایا ہوگا۔"

"ہاں..... یہی کہ ظلم کی دہلیز پر آپ جیسی بے گناہ لڑکی کا گلہ کاٹنے کی پوری پوری کوشش کی گئی.....۔"

روشی نے سر جھکا لیا..... وہ کچھ دل گیر سی ہو گئی تھی.... امی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے..... وہ داستان ستم سہیل کو سناتے ہوئے کہنے لگیں" بڑی صابر و شاکر بچی ہے میری..... ہیرا تھی ہیرا..... لیکن بے قدروں نے شناخت نہ کی۔"

"چھوڑیں امی..... روشی چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی قسمت میں جو تھا مل گیا.... اب آپ ان کی فکر کریں" اس نے بہنوں کی طرف اشارہ کیا۔

عصمہ اور روبینہ دونوں ہی میز سے اٹھ گئیں..... سہیل نے ان کے گلابی ہوتے چہرے دیکھے اور مسکراہٹ آپوں آپ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ رات خاصی دیر تک گپ شپ رہی روشی امی سہیل اور عرفان مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ سہیل رات بستر پر لیٹا تو ان سب سے بڑا مرعوب اور بڑا ہی متاثر تھا..... صرف مرعوب اور متاثر ہی نہیں تھا بلکہ وہ تو یہ بھی جان گیا تھا کہ ان نوازشات کے پیچھے ان لوگوں کی کچھ دبی دبی خواہشیں بھی ہیں..... ان کی آنکھوں سے یہ خواہشیں بلاجھجک جھانک رہی تھیں۔ یہ جائز بھی تھیں..... گھر میں دو جوان لڑکیوں کے ہوتے ہوئے ایسا ہونا فطری تھا۔ سہیل بیڈ پر لیٹے لیٹے ان لوگوں کے مسائل کے متعلق سوچنے لگا عصمہ اور روبینہ کے لیے رشتوں کی تلاش ان کا اہم اور سلگتا ہوا مسئلہ تھا..... دوسرے دن عرفان اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا.... چھٹی تھی دونوں سارا دن گھومے پھرے..... سہیل کی ملاقات کئی پرانے دوستوں سے ہوئی..... وہ اس محلے میں بھی گیا جہاں کبھی اس کا شاد و آباد گھر تھا اس کا جی بہت دکھا۔ وہ صرف دس دن کے لیے آیا تھا۔ ان دس دنوں میں اس نے اپنی زندگی کا بڑا نازک اور اہم فیصلہ کرنا تھا۔ رات اس مسئلے پر بات ہوئی۔

عرفان نے کہا" امی نے تمہارے لیے کچھ لڑکیاں دیکھی ہیں....."

"ہوں" وہ بولا۔

"اور میں نے بھی" روشی نے کہا.....

"بہتر ہے کہ حیلے بہانے انہیں لڑکیاں دکھا دی جائیں ان کے پاس وقت کم ہے اور پسند آنے کی صورت میں بات بھی چلانا ہے....."

"یہ پسند کر لیں.... بات تو بعد میں بھی چلائی جا سکتی ہے" روشی بولی۔

"نہیں بھئی..... پسند ہوگی بات چلے گی اور آخر میں نکاح ہوگا..... سہیل بولا۔

"اتنی جلدی.... سب کچھ کیسے ہوگا" امی بولی۔

"ہو جائے گا امی" سہیل بولا....." نکاح کر کے جانا ضروری ہے کیونکہ جاتے ہی ویزے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"تو پھر" روشی بولی۔

"کل بلا لو اپنی دوستوں کو..... جو تمہیں سہیل کے معیار پر پوری اترتی دکھائی دیتی ہیں" عرفان بولا۔

"بھئی اتنا جمگھٹا ایک ہی دن نہ کریں..... بلکہ روشی آپ بھی زحمت نہ دیں انہیں....." سہیل بولا۔

"واہ..... تو پھر آپ دیکھیں گے کیسے..... پسند کیسے کریں گے اور اتنی جلدی....." روشی نے کہا۔

"سہیل چند لمحے چپ رہا..... سر جھکائے کچھ سوچتا رہا..... پھر ہولے ہولے سر اٹھا کر امی کی طرف دیکھا اور خفیف سی مسکراہٹ سے بولا" امی میں نے دیکھ بھی لیا پسند بھی کر لیا۔ بات چیت چلانے کی ضرورت نہیں ہاں نکاح کا دن مقرر کرنا ہے..... اگر..... آپ کو اعتراض نہ ہو.... تو.... مجھے فرزندی میں قبول کر لیجیے....."

امی کے چہرے پر شگفتگی تیر گئی..... روشی بھی خوش ہوئی..... عرفان نے متشکر نگاہوں

سے اسے دیکھا۔

"تو..... تو تم نے فیصلہ کر لیا.....؟" امی بولیں "سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے نا.....؟"

"ہاں ماں جی..... کر لیا.....؟" سہیل نے مسکرا کر کہا۔

روشنی خوش ہو کر بولی "یہ ہماری خوش قسمتی ہے سہیل صاحب..... خدا کرے آپ ویسے ہی ہوں جیسے عرفان نے آپ کے متعلق بتایا ہے....."

"تجربہ بتائے گا کہ میں اس سے بھی بڑھ کر ہوں" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"امی سے تو جیسے خوشی برداشت نہ ہو پائی تھی..... اُٹھ کر اس کے قریب آئیں اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے رو دیں" میرے بچے تم نے میرا بڑا بار ہلکا کر دیا..... عصمہ یا روبینہ جس سے بھی چاہو....."

"روشنی نے بات کاٹی اور جلدی سے بولی "ویسے پسند تو سہیل صاحب ہی کی ہے..... لیکن امی عصمہ بڑی ہے ہمیں پہلے اس کا سوچنا چاہیئے..... کیوں سہیل صاحب....."

"سہیل نے شوخ سی مسکراہٹ سے کہا "عصمہ بہت اچھی ہے..... لیکن.....

"اچھا..... تو روبینہ....." روشنی جلدی سے بولی..... عصمہ کے ریجکٹ ہونے کا اُسے دکھ نہیں ہوا کیونکہ روبینہ بھی تو تھی، سہیل نے کانٹے سے کھیلتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

امی عرفان اور روشنی سبھی کے دل دھک سے رہ گئے..... سب نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا..... روشنی گھبرا کر اسے دیکھتے ہوئی بولی "آپ ابھی امی سے کہہ رہے تھے کہ وہ آپ کو فرزندی میں لے لیں"

"جی کہا تھا....." وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو....." روشنی بوکھلا گئی۔

"تو....." سہیل نے آہستہ آہستہ سر اُٹھا کر روشنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "عصمہ اور روبینہ کے علاوہ آپ بھی ہیں....."

"سہیل....."

"بیٹے....."

"اوہ....."

تینوں کے منہ سے ایک دم ہی یہ بے اختیار الفاظ نکلے۔

"سہیل نے روشنی پر اک نگاہ ڈالی... پھر امی کی طرف دیکھتے ہوئے لجاجت سے بولا

"کیا آپ یہ انمول ہیرا میری جھولی میں ڈال سکتی ہیں؟"

"اوہ سہیل یو آر گریٹ" عرفان بے اختیارانہ اس سے لپٹ گیا..... اور خوشی سے امی کی آنکھیں چھلک گئیں۔ روشنی بوکھلائی بوکھلائی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد امی سہیل اور عرفان باتیں کرتے رہے..... ماں بیٹا اس عظیم انسان کے بے حد ممنون و احسان مند تھے..... جب تینوں سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جانے لگے تو سہیل نے امی سے کہا "عرفان نے مجھے وہاں ہی روشنی کے ساتھ ہونے والے ناروا مظالم کا بتایا تھا.....اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اس دکھی لڑکی کے سارے دکھ سمیٹ کر اس کا دامن خوشیوں سے بھر دوں گا....."

"بڑے کائیاں ہو....." عرفان نے ہنس کر کہا "مجھے تو لڑکیاں تلاش کرنے کا..... سہیل نے بات کاٹتے ہوئے ہنس کر کہا "وہ نہ کہتا تو یہاں کیسے آتا اور یہاں نہ آتا تو بات کیسے بنتی....."

امی اسے پیار کرتے ہوئے دعائیں دینے لگی۔

"ماں جی....." سہیل نے رک کر کہا۔

"جی بیٹے"

"آپ روشنی کی مرضی بھی معلوم کر لیں....."

"تم اس کی فکر نہ کرو....."

سہیل نے سر جھکایا.... شب بخیر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ امی اور عرفان سیدھے روشی کے پاس گئے جو اب تک اپ سیٹ تھی.... اور یقین نہ کر پا رہی تھی کہ سہیل جیسا وجیہہ شکیل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دولت مند آدمی اسے پانے کی تمنا کر سکتا ہے....

لیکن یہ

اک سچائی تھی..... زندہ حقیقت تھی..... سہیل نے ترس کھا کر اسے نہیں چنا تھا بلکہ اس کی جوہر شناس نظریں ہیرے کو پہچان گئی تھیں.....

اگلی شام سادگی سے نکاح ہو گیا.....

اور

دوسرے دن سہیل شاداں و فرحاں واپس چلا گیا۔

اب

روشی جا رہی تھی..... ان دیکھے دیس میں.... اک نئی دنیا بسانے..... وہ یہ دنیا ایک بار پہلے بھی بسا چکی تھی.... جس کی ہولناکی سے وہ اب بھی کانپ کانپ جاتی تھی.... اب کے خوشحالی پھوار کی طرح پڑ رہی تھی.... خوش آئند تصور تھا..... آنکھوں میں کرچی کرچی خواب پھر سے تنومند اور سہانے ہو گئے تھے..... وہ خوش تھی۔

لیکن

اک انجانا سا خوف بھی تھا.....

یہ خوف سہیل کے پاس جا کر اس کے ساتھ رہ کر اور وقت گزار کر ہی دور ہو سکتا تھا۔

درد مُشترک

دونوں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ کمرے بھی آمنے سامنے تھے۔ ایک کے کمرے میں ذرا سا کھٹکا ہوتا تو دوسری چونک جاتی۔ چوکنی ہو جاتی کمرے میں ہوتی تو جھٹ سے دروازے پہ آجاتی۔ باہر ہوتی تو اس کے دروازے سے کان لگا لیتی۔ کھٹکے سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتی کہ اندر کیا ہوا ہے۔

دونوں کی نظر ایک دوسری کی ایک ایک حرکت پر ہوتی۔ صلح تو دونوں میں کبھی ہوئی نہ تھی، سرد جنگ تو بنیاد تھی ہی یہ سرد جنگ کبھی کبھی اتنی گرم ہو جاتی کہ شعلوں کی لپک سے گھر بھر کا سکون تباہ ہو جاتا..... لڑائی اس طرح ہوتی کہ لگتا ایک دوسری کا خون پی جائیں گی قتل کر دیں گی، زندہ نہیں چھوڑیں گی۔

شروع شروع میں تو اسلم دونوں میں بیچ بچاؤ کرانے کی کوششیں کرتا کبھی دونوں کی منت سماجت کرتا کبھی دونوں کو برا بھلا کہتا۔ لیکن اس سے حاصل کچھ بھی نہ ہوتا۔ دونوں ہی اتنی خونخوار بنی ہوتیں کہ لگتا اسلم کو بھی غصے کی آگ میں بھسم کر ڈالیں گی۔ اب تو اسلم کسی کا ساتھ دیتا نہ برا بھلا کہتا۔ لیکن اس سے حاصل کچھ بھی نہ ہوتا۔ بس سر تھام کے رہ جاتا..... غلطی کا عذاب اس پر ٹوٹ رہا تھا اسے سہنا ہی تھا۔

سلمیٰ اور عذرا دونوں ہی اسلم کی بیویاں تھیں۔

بارہ برس پہلے جب اسلم اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا تھا تو ہر ماں کی طرح اماں کو بھی بیٹے کے سہرے کے پھول دیکھنے کا ارمان ہوا تھا۔ اس نے اپنے کماؤ بیٹے کے لیے کئی رشتے دیکھے تھے۔ بیٹے کی ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی خوبصورت ہو۔ داج جہیز کی ضرورت نہیں تھی۔ سیدھی سادی اماں بھی اس نقطہ نظر سے لڑکی دیکھ رہی تھی۔

ڈھیر ساری لڑکیوں میں اسے سلمٰی پسند آئی تھی۔ سلمٰی بین نقش کی اچھی تھی، رنگت مہرہ سندور گندمی تھی۔ خوب صحت مند جسم تھا۔ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن گھر گرہستی کے کاموں میں ماہر تھی۔ خوش خلق خوش مزاج اور سلیقہ شعار لڑکی دو کلرک بھائیوں کی بہن تھی۔ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے رشتہ کہیں طے نہ ہو رہا تھا..... اماں نے لینے دینے پر لکیر کھینچ دی۔ تو بھائیوں کو سکھ کا سانس آیا.....

"ہمیں لڑکی چاہیے۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔" اماں نے سلمٰی کے بھائی صابر سے کہا... "میرے بیٹے نے اپنا سٹور کھول رکھا ہے۔ ماشاءاللہ بہت چل نکلا ہے سٹور، ساری زندگی کمائی ہی کرنا ہے گھر اپنا ہے سر پر اپنی چھت ہو تو بہت سے اندیشے فکر دور ہو جاتے ہیں۔ تم لوگ بالکل فکر نہ کرو۔ بیٹی راج کرے گی راج....."

"ماں جی....." صابر نے خوشی سے اماں کو دیکھا "اس زمانے میں ایسے لوگ ملتے کہاں ہیں۔ جو جہیز کے لالچ کے بغیر رشتے پر آمادہ ہوں۔ یہ تو ہماری اور ہماری بہن کی خوش بختی ہے۔"

"جیتے رہو" اماں نے دعا دی..... اور سلمٰی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "آج سے یہ ہماری بیٹی ہوئی۔"

صابر کی بیوی نے سعادت مندی سے کہا "ہاں ماں جی..... ہماری طرف سے رشتہ طے سمجھیں۔"

"میں نے شادی بھی جلدی کرنا ہے۔" اماں بولی "ایک ہی بیٹا ہے میرا......

اس کی خوشیاں دیکھنے کی تمنّا ہے جلدی سے بہو بنا کر لے جاؤں سلمٰی کو یہ میری دلی خواہش ہے۔"

"ہم تیار ہیں....." چھوٹا بھائی ناصر بولا۔

"چڑھتے مہینے کی پندرہ تاریخ ٹھیک رہے گی" اماں نے انگلیوں پر دن گنتے ہوئے حساب لگا کر کہا صابر اور ناصر نے بھی دنوں کی کچھ جمع تفریق کی اور پھر دونوں نے اپنی بیویوں سے مشورہ کرنے کے بعد اماں سے کہا

"ٹھیک ہے ماں جی..... یہ تاریخ ٹھیک رہے گی....." صابر نے کہا۔

"تھوڑی بہت تیاری تو کرنا ہی ہے نا....." صابر کی بیوی نے کہا۔

"ہاں جتنی حیثیت ہے ہماری اتنا تو کریں گے ہی....." ناصر بولا۔

"یہ تمہاری اپنی خوشی ہے بچو....." اماں نے کہہ دیا..... "ہماری طرف سے کوئی مطالبہ ہے نہ پابندی..... شربت کے پیالے پر بھی نکاح کے دو بول کہو گے تو پڑھوا لیں گے....."

"نہیں ماں جی....." صابر کی بیوی نے کہا "اب ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں آپ بارات لے کر آئیے گا ہم ان کی عزت دخاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔"

"جیتے رہو..... سب خوش رہو....." اماں خوش ہوگئیں۔

مقررہ تاریخ پر اماں سلمٰی کو لے گئیں۔ اپنی طرف سے خاصی دھوم دھام سے شادی کی سلمٰی کے لیے پندرہ بیس تولے سونے کے زیورات اور خوبصورت ریشمی جوڑے لے کر آئیں۔ ولیمہ بھی شاندار کیا۔

اسلم کو سلمٰی پسند آگئی.....

سلمٰی کے من کو اسلم بھا گیا۔

دونوں ایک دوسرے کے جیسے دیوانے ہوگئے۔

اماں دونوں کو خوش دیکھ کر نہال ہو جاتی.....

وہ اسلم سے کہتی "دیکھا کیسی بھولائی ہوں میں...... چاند جیسی دلہن ہے میری"

اسلم اماں کو چھیڑتا "اتنی تعریفیں نہ کرو اماں اب ایسی حسین بھی نہیں ہے تمھاری بہو......"

"چل چل بڑا آیا..... چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسی لڑکی نہ ملے"

"اماں تم تو اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچا دو گی تعریفیں کر کر کے" "وہ ہے ہی تعریف کے قابل....."

سلمٰی اماں سے لپٹ جاتی خوب پیار کرتی..... گھر کا سارا کام کاج بھی اس نے سنبھال لیا تھا۔ اماں کو تو اس نے پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ دوڑ دوڑ کر سارے کام کرتی۔ اماں کا دل اس نے اس طرح بھی تو موہ لیا تھا.....

اسلم اس سے بہت خوش تھا..... ساس بہو کا پیار اس کی خوشی کا باعث تھا۔ گھر میں سکون ہی سکون تھا۔

ہنسی خوشی دن گزرنے لگے..... اسلم کا کاروبار خوب پھلا پھولا... وہ اُسے سلمٰی کا مقدر کہتا تھا.....

"تم بہت نصیبے والی ہو سلمٰی....."

"ہوں تو....."

"سچی..... جب سے اس گھر میں آئی ہو..... خوشی و مسرّت کا دور دورہ ہے۔ میرا کاروبار خوب چل نکلا ہے"

"چل تو پہلے بھی رہا تھا....."

"تمھارے اس گھر میں آنے کے بعد سے بہت پھلا پھولا ہے....."

"خوش بخت ہوں نا....."

"اس میں شک نہیں......"

سلمٰی اٹھلا کر اسے تکتی اور وہ اس پر ہزار جان سے نچھاور ہو جاتا.. ....

ایک سال یونہی گزر گیا۔ خوشیوں کی چہل پہل ہو تو وقت گزرتے پتہ بھی نہیں چلتا۔ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ پر جب اسلم نے سونے کا ایک نفیس سیٹ سلمٰی کو تحفے میں دیا تو یہی کہا "پورا سال گزر گیا سلمٰی..... اور یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو....."

"ہاں..... بالکل ایسے لگتا ہے یہ عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا....." سلمٰی نے متشکرانہ اسے دیکھا۔

"یہ تحفہ پسند آیا....."

"بہت......"

"پہنو"

"خود پہنا دُ....."

اسلم نے بڑے پیار سے اسے زیور پہنایا..... سلمٰی خوشی سے پھولے نہ سمائی... اس کا چہرہ دمک اٹھا..... انتہائی پیار سے اسلم کو دیکھ کر بولی "تم کتنے اچھے ہو....."

"تم بھی تو ہو....."

"اسی طرح رہو گے نا ساری عمر....."

"کیوں نہیں رہوں گا..... تم تو میری زندگی ہو سلمٰی..... میرا پیار ہو۔ تم سے میں کبھی منہ موڑ سکتا ہوں؟" سلمٰی نے اترا کر اسے دیکھا۔ دونوں ہمیشہ ہمیشہ ایک دوسرے کا رہنے کے پکے پکے عہد و پیمان کرتے رہے۔

وقت کا چکر چلتا رہا دن ہفتوں مہینوں اور سالوں کا روپ دھارتے گئے۔ سلمٰی کی شادی کو پانچواں سال جا رہا تھا۔ لیکن اس کی آغوش خالی تھی۔ اس کا آنگن سونا تھا۔ وہ ماں نہ بن پائی تھی۔ دو دفعہ امید سے ہوئی تھی۔ لیکن تیسرے چوتھے مہینے ہی امید

ناامیدی میں بدل چکی تھی...... تخلیق کا عمل اس کی کوکھ میں ادھورا ہی رہا تھا....

اماں بھی ننھے منے گل گوتھنے سے بچے کی تمنا دل میں لیے چل بسی تھی۔ اماں کے مرنے سے گھر ویران اور سونا سونا لگنے لگا تھا۔ بچے کی کمی کچھ اور شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ سلمیٰ تو اس کمی کو بہت زیادہ محسوس کرتی۔ بہت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ کام کاج میں جی نہ لگتا تھا۔ رنگت خراب ہو گئی تھی...... جسم کچھ پھول گیا تھا۔ اس طرح پھولنے سے بھدا پن نظر آنے لگا تھا۔

لیکن وہ اپنی ذات سے بے خبر تھی۔ اسے تو صرف اور صرف اپنی محرومی کا احساس تھا۔

اسے بچہ چاہیے تھا۔ بچہ......

لیکن

اس کی حسرت ہی رہی...... آغوش ویران اور گھر سنسان ہی رہا۔ بہتیرے علاج کیے۔ ڈاکٹروں حکیموں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ تعویز گنڈے کیے...... جھاڑ پھونک کی...... دائیوں سے رجوع کیا۔ لیکن سونی گود آباد نہ ہو سکی۔ محرومی نے اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اپنے آپ سے تو بیگانہ ہو ہی گئی تھی۔ اسلم سے بھی جیسے کوئی سروکار نہ رہا۔ نہ ہی اس کے کھانے پینے کا دھیان رکھتی نہ ہی اوڑھنے پہننے کا..... ہنس کر بات کرنا بھی بھول گئی تھی...... اس سے بات کرتی بھی تو صرف بچے کے متعلق۔

"ہمارے بچہ نہیں ہو گا....."

"نہیں ہو گا تو میں کیا کروں"

"مجھے بچہ چاہیئے....."

"بازار میں نہیں ملتا جو تمہیں لا دوں"

"میں مر جاؤں گی اسلم ..... میری ممتا بلک رہی ہے"

"اوہو..... دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا..... میں کیا کروں۔ کمی تم میں ہے خرابی تم میں

ہے۔ بچے کے لیے مجھے پریشان کرتی رہتی ہو۔ کہاں کہاں سے علاج نہیں کروایا تمہارا...."

"لیکن بچہ......"

وہ رونے لگتی۔ اسلم چڑنے لگتا۔ یوں دونوں ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دکھی کرنے لگے..... فاصلے پھیلنے لگے دوریاں بڑھنے لگیں۔

پھر انہیں دنوں

اسلم کی شناسائی عذرا سے ہوئی..... عذرا اسلم کے دوست فیض کی بیوی کی چچازاد بہن تھی۔ والدین دونوں مر چکے تھے۔ فیض کی بیوی ریحانہ کے سوا اس کا کوئی اور عزیز نہیں تھا۔ مجبوراً ریحانہ عذرا کو گھر لے آئی۔ لیکن جوان لڑکی کو گھر میں رکھتے ہوئے وہ بھی پریشان تھی۔ جلد از جلد اس کا رشتہ ڈھونڈ کر نکاح کے دو بول پڑھوا دینا چاہتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اسے فیض پر اعتماد نہیں تھا۔ یا عذرا ہی کوئی چھچھوری لڑکی تھی...... پھر بھی وہ کسی قسم کا رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔

وہ فیض سے اکثر کہتی "تمہارے اتنے دوست ہیں۔ کسی سے بھی نہیں کہتے رشتے کے لیے......"

"بھئی وہ سب شادی شدہ ہیں" فیض ہنس کر کہتا..... "کیا دوبارہ شادی کروا دوں کسی کی؟"

"یہ کب کہا میں نے...... دوست شادی شدہ ہیں۔ ان کے کوئی بھائی، سالے یا اور رشتہ دار بھی تو ہوں گے۔ کسی سے بات تو کریں....."

"ریحانہ تم جانتی ہو..... آج کل رشتے آسانی سے نہیں ملتے۔ عذرا کے لیے ہمارے پاس جہیز وہیز ہے نہیں۔ خالی خولی لڑکی کو کون لے جانا پسند کرے گا۔"

ریحانہ متفکر ہو جاتی...... بات واقعی صحیح تھی۔ وہ عذرا کو دو چار جوڑوں کے سوا اور دے بھی کیا سکتی تھی..... اور ایسا رشتہ اس دور میں ملنا مشکل تھا..... جو صرف اور

صرف لڑکی لے جانا پسند کرتا.....

اس دن اسلم کسی کام سے فیض کے ہاں آیا.....فیض نے اسے کھانے پر زبردستی روک لیا۔

"تمہاری بھابی اکیلی ہے مجھے جانے دو" اسلم نے کہا۔

"کوئی بات نہیں..... زیادہ دیر نہ رکنا۔ بس آج کھانا کھا کے جاؤ۔ پائے پکے ہیں اور مجھے پتہ ہے تم پائے بہت خوش ہو کر کھاتے ہو....."

"بات تو میرے دل کی کی ہے....."

"بس چپکے بیٹھے رہو..... ابھی کھانا لگواتا ہوں....."

پائے اور خمیری روٹی اسلم کا من بھاتا کھانا تھا۔ کھانا عذرا ہی نے میز پر لگایا۔ ریحانہ اور عذرا دونوں ہی کھانے میں شریک ہوئیں۔ اسلم پہلے بھی عذرا سے مل چکا تھا۔ ریحانہ سے اس کے بارے میں پتہ بھی چلا تھا.....

آج بھی وہ میز پر اس کے قریب بیٹھی تھی.....

اسلم نے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے کہا" بھابی بہت اچھے بنائے ہیں آپ نے پائے....."

"میں نے نہیں عذرا نے بنائے ہیں" ریحانہ نے کہا "بہت اچھے کھانے بناتی ہے"

اسلم نے عذرا کی طرف دیکھا۔ عذرا نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں.....

تب

تب

اسلم کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا.....

عجیب سا.....

عذرا کو اپنی بنانے کا خیال.....

لیکن بیوی کے ہوتے ہوئے یہ خیال دل میں لا کر جیسے اس نے کوئی گناہ کیا تھا.....

اچانک ہی اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا.....

اور سب گھر والوں کے اصرار کے باوجود ایک لقمہ بھی اور نہیں توڑا.....

وہ جلد ہی وہاں سے چلا آیا۔ اور پھر کبھی بھی فیض کے ہاں نہ جانے کا عہد دل میں کر لیا۔ اس دن گھر آ کر اس نے سلمٰی کی بہت دلجوئی کی..... بہت پیار کیا بڑی تسلی اور دلاسے دیئے۔

"خدا ہمیں بچّے کی نعمت سے ضرور نوازے گا سلمٰی....." اس نے خود ہی اس سے کہا۔

"سچی....." وہ پاگلوں کی طرح خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

"ہاں"

"کب"

"جب اس کی مرضی ہوگی"

"اب مجھ میں برداشت کی ہمت نہیں رہی اسلم....."

"خدا سے دُعا مانگا کرو..... وہ ضرور دے گا....." وہ اسے تسلیاں دیتا رہا.....

لیکن

عذرا کا خیال اور اس کے خیال سے فرار محض فریب خیال تھا..... رات اس کے خوابوں میں بھی عذرا لہراتی بل کھاتی رہی..... اور دن میں بھی خیالوں میں براجمان رہی.....

کئی دن وہ کشمکش میں رہا۔ تذبذب کا شکار رہا..... گومگو کی کیفیت رہی.....

لیکن

جتنا ہی اس نے عذرا کے خیال سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اتنا ہی وہ اس کے

حواس پر چھائے گی.....

اس دن اسے کوئی کام بھی نہیں تھا...... اور فیض سے بھی ملنے کی قطعاً خواہش د ضرورت نہ تھی...... پھر بھی وہ اس کے گھر گیا..... اسے خود بھی پتہ نہ چلا۔ بس وہ تو جیسے کسی مقناطیسی کشش یا ساحرانہ عمل سے کھنچا چلا گیا۔

دروازے پر دستک دی۔

تو

عذرا ہی نے دروازہ کھولا.....

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا...... نگاہوں نے نگاہوں کو اپنا اپنا مفہوم سمجھا دیا۔

اسلم چند لمحے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر ہولے سے بولا" اندر آسکتا ہوں وہ ادائے دلربائی سے مسکرائی" نہیں......"

" کیوں"

" گھر پہ بھائی فیض نہیں ہیں....."

" تو......"

" ریحانہ آپا بھی گھر پہ نہیں ہیں....."

" تم تو ہو......"

" ہاں ہیں...... ہوں"

" پھر اندر آنے دو نا....."

" نہیں......"

" میں ضرور آؤں گا"

" بُری بات ہے"

" بُری بات تب ہوگی۔ جب نیت بھی بُری ہو......"

" آپ......"

اس نے پرے ہٹتے ہوئے اسلم کے لیے راہ چھوڑ دی..... اسلم بیٹھک میں جا بیٹھا..... عذرا دروازے میں کھڑی رہی.....

چائے پئیں گے یا ٹھنڈا......"

" کچھ بھی نہیں......"

" کوئی کام تھا"

" نہیں....."

" پھر آئے کیوں ہیں....."

" پتہ نہیں....."

دونوں مسکرا دیئے.....

پھر اسلم اُٹھا......

" جا رہے ہیں"

" ہاں"

" ہاں......"

" ہاں"

دونوں ہنس پڑے.....

اسلم چلا آیا..... لیکن عذرا اس کے دل و دماغ پر چھا گئی...... کچھ یہی حال عذرا کا بھی تھا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسلم شادی شدہ ہے۔ وہ اسے پانے کی خواہش دل میں جگا بیٹھی۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے والی بات ٹھیک ہی تھی...... اسلم کا گھر میں روز روز آنا اور عذرا کا اس کے جانے کے بعد گم صم رہنا ریحانہ کی نظروں سے پوشیدہ نہ

تھا...... اس نے ایک دن عذرا کو ٹٹولا...... وہ گھبرائی سٹپٹائی...... لیکن آخر اعتراف کر ہی لیا۔ ریحانہ بہت فکر مند ہوئی۔

"جانتی ہو، وہ شادی شدہ ہے....."

"ہاں....."

"وہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا ہے"

"اب نہیں"

"تجھے اسلم نے بتایا"

"ہاں"

"وہ تجھے بہلانے پھسلانے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتا ہے"

"نہیں آپا"

"تو کیسے کہہ سکتی ہے"

"اس کی بیوی نیم پاگل ہے....."

"نیم پاگل؟ وہ صرف بچے کے لیے پریشان رہتی ہے"

"ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا ہے"

"ہوں....."

اسلم دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسے بچے چاہئیں..... اور اس کی بیوی اس قابل نہیں رہی.....

"وہ تجھ سے شادی کرنے کو تیار ہے"

"ہاں"

"دھوکہ تو نہیں دے گا"

"نہیں آپا..... وہ سنجیدہ ہے"

"اور تم......"

"میں آپ کی اجازت کی خواہش مند ہوں....."

"ٹھیک ہے..... میں فیض سے بات کروں گی....."

ریحانہ عذرا کا بار جلد از جلد سر سے اتارنا چاہتی تھی۔ اس نے فیض سے بات کی تو وہ حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا "تم پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ اسلم سلمیٰ بھابی سے بہت محبت کرتا ہے"

"لیکن اسے بچے کی بھی ضرورت ہے۔ جو سلمیٰ نہیں دے سکتی......"

"سلمیٰ اسلم کو دوسری شادی کی اجازت دے دے گی"

"اسلم دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ اجازت لینا اس کی دردسری ہے....."

ریحانہ نے فیض کو بحث و تکرار سے رضامند کر ہی لیا..... فیض نے جھجکتے جھجکتے اسلم سے بات کی۔ تو اس نے بخوشی عذرا کو اپنانے کی حامی بھرلی۔

"لیکن سلمیٰ بھابی....." فیض نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں اسے جلد ہی رضامند کر لوں گا....."

"تمہارا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گی"

"میں نے میدان ہموار کر لیا ہے...... وہ جلد ہی رضامندی دے دے گی.... اسے بچے کی ضرورت ہے۔ بچے کے لیے وہ نیم پاگل ہو گئی ہے۔ اسی بنیاد پر تو میں اسے اس شادی کی رضامندی دینے پر آمادہ کر رہا ہوں....."

اپنے پیار میں کوئی کسی کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتا۔ نہ ہی اپنے بھرے ہوئے گھر میں کسی دوسرے کی شرکت گوارہ کرتا ہے۔ سلمیٰ اپنے آپ سے کسی حد تک بیگانہ ضرور ہو چکی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنی محبت میں کسی دوسری عورت کو حصہ دار بنا لے یا اپنے گھر میں سوکن لا بٹھائے..... یہ تو اسلم تھا جس نے نرمی سے کام بنتے نہ دیکھا تو سختی

پر اُتر آیا۔ طلاق تک دے دینے کی دھمکی دی......بے بس اور مجبور عورت نے روتے دھوتے اسے دوسری شادی کی اجازت دی کہ ایسا نہ کرتی تو بھی گھر سے نکالی جاتی......

نکل کر جانا بھی کہاں تھا......کوئی آسرا کوئی ٹھکانہ تھا ہی کب...... پھر اسے اپنی خامی اور کمی کا بھی احساس تھا......مرتی کیا نہ کرتی......اسلم کی خوشی کے آگے اسے جھکنا ہی پڑا۔

اسلم نے اجازت حاصل کر لی......تو سلمیٰ کو بہت دلاسے دیئے۔

”تم میری نظروں میں اور بھی عظیم ہو گئی ہو......میں تمہاری حیثیت اور وقار برقرار رکھوں گا۔ عذرا تمہیں ہمیشہ بڑا ہی سمجھے گی...... اس کے بطن سے ہونے والے بچے تمہاری آغوش میں پلیں گے۔ تمہیں بچے چاہئیں نا...... تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی......ہم سب مل جل کر رہیں گے......“

اسے تسلیوں اور دلاسوں سے اسلم نے خوب بہلایا......

اسلم نے عذرا سے شادی کر لی۔ ریحانہ کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔ بنا جہیز کے عذرا کا بار سر سے اتر گیا......

عذرا دلہن بن کر گھر میں آ گئی۔ دل پر پتھر کی سل رکھ کر سلمیٰ نے اس کا استقبال کیا۔ اسے اس کے کمرے میں لے گئی......یہ کمرہ اس کے اپنے کمرے کے عین سامنے تھا۔ سلمیٰ عذرا کے لیے اوپر والی منزل کے کمرے کو بھی ٹھیک ٹھاک کر سکتی تھی، لیکن جانے کن مصلحتوں کے تحت اس نے عذرا کے لیے یہ کمرہ منتخب کیا۔

وہ ساری رات سلمیٰ نے روتے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتے گزاری۔ اسے اپنی شادی کی پہلی رات بار بار یاد آتی...... اسلم کے وعدے یاد آتے۔ اس کا پیار اس کی جنونی محبت کیا کچھ نہ یاد آیا اس رات...... یہ رات عذاب کا لمحہ لمحہ بن کر سرکتی رہی......

صبح صبح اسلم اس کے کمرے میں آ گیا......عذرا سے ملن کی خوشیوں کو بمشکل چھپاتے ہوئے اس نے سلمیٰ کے گلے میں باہیں ڈال دیں......اسے خوب پیار کیا......آنکھیں بھی ڈبڈبائیں آواز بھی بھرائی ”سلمیٰ مجھے ساری رات تمہارا خیال رہا......یقین مانو میں تم سے اب بھی ویسی ہی محبت کرتا ہوں، جیسی پہلے کرتا تھا۔ عذرا تو ہم دونوں کی ضرورت ہے، تم پریشان نہ ہونا...... خوش رہنے کی کوشش کرنا......اب جو حقیقت ہے اسے ہم تینوں کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

ہفتہ عشرہ وہ عذرا ہی کے پاس رہا...... پھر اس نے سلمیٰ کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے عذرا سے کہا ”میں تم دونوں میں مساوات چاہوں گا......ایک دن تمہارے پاس رہا کروں گا۔ ایک دن سلمیٰ کے پاس......میں سلمیٰ کو یوں روتے بلکتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے نہیں دیکھ سکتا......“

عذرا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگی۔ منہ سے تو کچھ نہیں بولی......لیکن دل میں سلمیٰ کے لیے نفرت کی آگ بھڑکتی محسوس کی۔

اسلم نے گھریلو فضا کو متوازن رکھنے کی شعوری کوششیں کیں۔ وہ ایک رات سلمیٰ کے پاس رہتا۔ ایک عذرا کے۔ دونوں کو خرچہ بھی برابر کا دیتا...... باہر لے جانا ہوتا تو دونوں ہی کو لے جاتا۔

لیکن

اس سے فضا متوازن نہ رہ سکی۔ عذرا نئی نویلی دلہن تھی۔ اسلم محبت کا کھیل کھیل کر اسے بیاہ کر لایا تھا۔ وہ اس پر اپنا حق زیادہ سمجھتی تھی۔ سلمیٰ پانچ چھ سال پہلے کی بیاہی تھی۔ عذرا کے خیال میں اس کا حق تو بنتا ہی نہیں تھا کہ اسلم اس کے پاس رہے......

اسی بات پر اس کی اسلم سے خاصی تکرار ہوئی......”تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، سلمیٰ کے پاس ہی رہنے مجھ سے شادی کیوں کی...... میں اس عورت کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔

مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اسے علیحدہ کر دو......"

کچھ ایسی ہی باتیں سلمیٰ بھی کرنے لگی۔

"اسلم..... تم نے مجھے بھروسے اور اعتماد سے مارا ہے۔ تم کہتے تھے میری حیثیت اور وقار مجروح نہیں ہوگا۔ میں بڑی ہوں اور بڑی رہوں گی..... لیکن تم نے مجھے دھوکہ دیا......"

اسلم عذرا کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتا..... سلمیٰ سے چپ رہنے کی استدعا کرتا۔ کبھی پیار سے کبھی منت سماجت سے۔

لیکن بنتا کچھ نہیں..... بات دبنے کی بجائے پھیلنے لگی..... سلمیٰ اور عذرا ایک دوسرے سے نفرت تو کرتی ہی تھیں۔ اس نفرت کا اب کھلم کھلا اظہار ہونے لگا۔ اس اظہار میں شامت اسلم کی آجاتی.....

اس رات کسی ضروری کام سے اسلم سلمیٰ کے کمرے میں گیا۔ یہ رات اس نے عذرا کے پاس گزارنا تھی۔ عذرا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار دروازے تک آتی۔ لیکن جب پورا گھنٹہ گزر گیا اور اسلم سلمیٰ کے کمرے سے باہر نہیں آیا۔ تو وہ غصّے سے بھڑک اٹھی..... پھنکارتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور سلمیٰ کے کمرے میں جا دھمکی..... پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ..... شیرنی کی طرح غراتے ہوئے سلمیٰ پر جھپٹ پڑی۔ گالیاں بکتے ہوئے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا.....

اسلم بوکھلا گیا.....

"میں تجھے جان سے مار ڈالوں گی....." اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ اسلم نے بمشکل سلمیٰ کے بال چھڑائے..... عذرا کو برا بھلا کہہ ہی رہا تھا کہ سلمیٰ پوری قوت سے عذرا پر ٹوٹ پڑی..... مکّے گھونسے لاتیں مارتیں..... جواباً عذرا نے بھی حملہ کر دیا دونوں کو الگ کرنا اسلم کے بس میں نہ رہا.....

مار پیٹ چکیں تو ہانپتے ہوئے دانت پیس پیس کر ایک دوسری کو کوسنے لگیں۔

اس رات اسلم عذرا کے پاس رہا نہ سلمیٰ کے پاس..... چھت والے کمرے میں جا کر سویا۔ وہ تو میدان کارزار دیکھ کر ہی حواس باختہ ہو گیا تھا......

لیکن

یہ تو ابتدا تھی......

پھر تو آئے دن لڑائی جھگڑا ہونے لگا۔ گالی گلوچ تو عام سی بات بن گئی....... مار پٹائی سے بھی گریز نہ کیا جاتا..... اسلم کے سمجھانے بجھانے کا دونوں پر ہی اثر نہ ہوتا.... اُلٹا دونوں اسے بھی رگید ڈالتیں..... خوب کوستیں۔ خوب لڑائی کرتیں۔

انہی دنوں عذرا امید سے ہو گئی۔ اس کا پاؤں خوشی سے زمین پر نہ پڑتا۔ اب تو اس کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ وہ اُتراتی پھرتی..... سلمیٰ کو جلانے کے لیے ایسی ایسی حرکتیں کرتی کہ اسلم کا دل بھی کانپ جاتا۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا.....

"عذرا ایسے نہ کیا کرو۔ کہیں سلمیٰ کے دکھی دل سے بددعا نہ نکل جائے..... اپنی خیریت خدا سے چاہا کرو۔ اللہ کرے صحیح و سالم بچّہ پیدا ہو....."

"اور تم اسے سلمیٰ کی گود میں دے دو....."

"یہ تو تمہاری مرضی پر ہے....."

ادھر وہ سلمیٰ کی دلجوئی کرنے کو کچھ کہتا تو وہ بپھر جاتی "مرد ہو تو زبان پر قائم رہنا۔ تم نے بچہ میری گود میں ڈالنے کا وعدہ کیا ہے......"

"اچھا اچھا..... بچہ پیدا ہو تو لے پھر دیکھوں گا......"

"یہ بچہ میرے لیے ہوگا....."

اسلم یونہی سر ہلا دیتا.....

لیکن قدرت کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔ عذرا کا تیسرا مہینہ جا رہا تھا کہ سلمیٰ کی

سونی کوکھ میں بھی کونپل پھوٹ پڑی..... وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو گئی۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ بانجھ اور ویران کوکھ میں بھی سبزے کی کونپل پھوٹ سکتی ہے......

خوشی اسلم کو بھی ہوئی..... اس بات سے تو اور بھی اطمینان ہوا کہ چلو بچہ لینے دینے کا جھگڑا تو ختم ہوا۔ لیکن جھگڑے ختم نہیں ہوئے..... عذرا کو تو اس خبر سے بہت دکھ ہوا..... بس نہیں چلتا تھا کہ سلمٰی کی کوکھ پھر سے ویران کر دے...... ہزاروں بددعائیں دے ڈالیں اسے...... لڑائی میں اسے زور سے دھکا بھی دیا لیکن ادھر وہ گری ادھر خود بھی سنبھل نہ پائی۔ پاؤں الٹ گیا..... کئی دن دونوں چارپائی سے لگی رہیں۔

عذرا کے لڑکا پیدا ہوا..... اسلم نے خوشیاں منائیں۔

عذرا نے اترا کر کہا "خوب خوشی مناؤ..... اتنا پیارا بیٹا دیا ہے میں نے تمہیں..... دیکھ لینا سلمٰی کے بیٹی ہو گی۔ پھر خوشی منانے کا جواز نہیں ہو گا....."

لیکن

سلمٰی کے بھی بیٹا ہی ہوا..... اسلم خوش تھا۔ تین چار ماہ کے وقفے میں خدا نے دوسرے بیٹے سے نوازا تھا۔ خوشیاں اب بھی اس نے منائیں۔ عذرا جل بھن گئی۔

وقت گزرنے لگا..... سلمٰی اور عذرا کی آپس میں کبھی بن نہ آئی۔ دونوں بال بچوں والی ہو گئی تھیں۔ ہر ایک اپنا حق زیادہ جتاتی تھی۔ ذرا سی بات پر بھی بہت بڑا جھگڑا کھڑا ہوتا۔ اسلم کبھی ایک کے بچوں کو پیار کرتا تو دوسری بھڑک اُٹھتی۔ دوسری کے بچوں کے لیے کبھی کوئی فالتو چیز لے آتا تو وہ جان کو آجاتی......

اسلم بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ صحت بگڑ گئی۔ لیکن دونوں بیویاں اپنے آپ تک ہی محدود تھیں اس کی پرواہ کسی کو بھی جیسے نہیں تھی..... پرواہ تو اس وقت ہوئی جب پانی سر سے گزر گیا۔ ڈاکٹروں نے اسلم کی بیماری کو لاعلاج قرار دے دیا اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر بستر پر پڑ گیا.....

لڑائی اب بھی نہیں رکی..... سلمٰی کی کوشش ہوتی کہ وہ اسلم کی زیادہ خدمت کرے .....اس کے قریب رہے اور دولت میں سے بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر سکے۔ ادھر عذرا بھی اسی کوشش میں ہوتی کہ تیمارداری میں سلمٰی سے نمبر لے جائے..... تاکہ اسلم اس پر مہربان ہو..... اسے زیادہ حصے کا حقدار بنائے۔

پھر

ایک رات اسلم چپکے ہی سے اللہ کو پیارا ہو گیا.....

دونوں کا سہاگ لٹ گیا۔ دونوں ہی کے بچے یتیم ہو گئے..... غم اور صدمے سے دونوں ہی نڈھال ہو گئیں۔ جب جنازہ اٹھا تو دونوں کے بین کلیجہ چیرنے لگے..... کچھ لوگوں نے سلمٰی کو سہارا دے رکھا تھا جو پچھاڑیں کھا رہی تھی، کچھ نے عذرا کو سنبھال رکھا تھا جو فرط غم سے نڈھال ہو کر ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ جنازہ لے جایا گیا۔

عورتیں دونوں کو سہارا دے کر اندر لے آئیں..... کچھ عورتوں نے چاہا کہ دونوں کو الگ الگ کمرے میں لے جا کر بٹھائیں۔ ان کے لڑائی جھگڑوں سے سبھی آگاہ تھیں۔ نہیں چاہتی تھیں..... کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو اور کسی بھی بات پر دونوں مشتعل ہو کر بھڑک اٹھیں۔

"چلو سلمٰی اپنے کمرے میں چلو....." چند عورتوں نے کہا۔

"تم اپنے کمرے میں چلو عذرا....." کچھ نے عذرا سے کہا۔

لیکن

دونوں اپنے اپنے کمروں میں نہیں گئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھا...... دھندلائی اور روتی آنکھوں سے ایک دوسری کو دیکھا۔ پھر عورتوں سے اپنا آپ چھڑا کر ایک دوسری کی طرف جھپٹنے کے انداز میں لپکیں۔

سب عورتوں کو خدشہ ہوا کہ وہ لڑائی مار کٹائی شروع کر دیں گی..... اس لیے جلدی سے دونوں کے درمیان آنا چاہا۔

لیکن

آنہ سکیں۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئی تھیں اور چیخیں مار مار کر گریہ وزاری کرنے لگی تھیں۔

عورتیں حیران ہو ہو کر دونوں کو دیکھ رہی تھیں..... بات انہونی سی لگ رہی تھی۔

لیکن

نہ بات حیرانگی کی تھی..... نہ ہی انہونی..... وجہ نزاع ختم ہو گئی تھی۔

اب درد مشترک تھا..... اس نے دونوں کو ایک دوسری کے قریب کر دیا تھا۔

بڑا آدمی

کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد بھی میں چند منٹ میز پر بیٹھا ریسٹورنٹ کے ہال پر نگاہیں ڈالتا رہا۔ ساری میزیں بھری تھیں۔ لوگ کھانے پینے باتیں کرنے اور قہقہے سمیٹنے میں مصروف تھے۔ رنگا رنگ کھانوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی خوشگوار موسیقی کا ترنم اس میں گھل رہا تھا۔ اور ہال میں پھیلے سرخی مائل روشن اندھیرے بڑے اچھے اور دلکش لگ رہے تھے۔

عمر کا تقاضا۔ یا۔ تنہائی کا احساس!

جو کچھ بھی تھا۔ میری نگاہیں ان سجے سنورے چہروں پر مرکوز تھیں۔ جو بڑے جاذب نظر تھے اور پرکشش لگ رہے تھے۔

میں ان دنوں بالکل اکیلا تھا۔ حال ہی میں میری پوسٹنگ اس شہر میں ہوئی تھی۔ اور میں کرائے کی ایک بیٹھک میں رہ رہا تھا۔ میری بیوہ ماں تین جوان بہنیں اور دو چھوٹے بھائی اپنے آبائی شہر میں رہتے تھے۔ مکان اپنا تھا۔ اور میں برسر روزگار ہو گیا تھا اس لیے اپنے گھر کی کشتی کی پتوار سنبھالے تھا۔ میری تنخواہ اتنی تھی۔ کہ میری ماں میری بھیجی ہوئی رقم سے سارا بوجھ گھسیٹے جا رہی تھی۔ میں اپنی ماں کا فرماں بردار بیٹا تھا۔ اور اپنے حالات کا بھی احساس تھا۔ اس لیے تنخواہ میں سے کم سے کم خرچ اپنے اوپر کرتا اور زیادہ سے زیادہ ماں کو بھیجنے کی کوشش کرتا۔ بار زیادہ تھے اور وسائل کم پھر بھی میں اپنے طبقے کے ہر نوجوان کی طرح اچھے وقت کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

زندگی کا یہ چکر شاید اپنی رفتار ہی سے چلتا رہا۔ لیکن اس دن عمران مجھے بازار میں مل گیا۔

" طاہر، تم کہاں؟" وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر میری طرف لپکا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ عمران کو دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا اس کا ننھیالی گھر ہمارے آبائی گھر سے ملحق تھا۔ وہ بچپن میں زیادہ تر اپنی نانی ماں ہی کے پاس رہا کرتا تھا۔ تب ہی سے ہم دوست بن گئے تھے۔

پڑھائی کے زمانے میں تھوڑا عرصہ ہمارا ساتھ رہا۔ اس کے بعد وہ اک بڑے شہر کے بڑے کالج میں داخل ہو گیا۔ میں نے اپنے آبائی شہر ہی میں تعلیم مکمل کی۔ عمران نے تعلیم ختم کر کے اپنے باپ کی لمبی چوڑی بزنس ہاتھ میں لے لی تھی اور میں کئی سال بیکار اور چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے بعد اب اچھی پوسٹ پر آیا تھا۔ یہ پوسٹ اتنی اچھی بھی نہیں تھی۔ لیکن میرے حالات اور وسائل کے مطابق کافی تھی۔ عمران اب کبھی کبھار ننھیال آیا کرتا تھا۔ جب بھی آتا۔ خلوص سے ملتا۔ مجھے کبھی احساس بھی نہ ہوتا۔ کہ اس میں اور مجھ میں طبقات اور درجے کی حد بندیاں حائل ہو چکی ہیں۔ وہ مجھ سے خلوص سے بغلگیر ہوا۔ اس کی محبت کو میں نے محسوس کیا۔ اس کی گاڑی دیکھ کر جو جھجک میں نے محسوس کی تھی دُور ہو گئی۔ احوال پرسی کرتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ "کیسے آئے یہاں؟" اس نے پوچھا۔ "پوسٹ ہو کر" "واقعی؟" "ہاں!" "کب سے آئے ہو؟" میں کترایا۔ وہ یقیناً گلہ کرے گا کہ اتنے دنوں سے یہاں ہوں اور اسے ملنے نہیں آیا۔ میں بات گول کرتے ہوئے بولا "تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ تمہاری طرف آنے ہی والا تھا" "لیکن نہیں آسکے" اس نے مجھے گاڑی کی طرف دھکیلا اور بولا "چلو بیٹھو" "یار پھر آؤں گا کسی دن!"

" اوں ہوں۔ ابھی چلو گے۔ بھابی اور بھتیجی سے نہیں ملو گے" اس نے مجھے سیٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا "ٹھہرے کہاں ہو؟ وہ مجھے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔ "جگہ مل گئی ہے" میں نے جلدی سے

کہا اور پھر اس سے بھابی اور اس کی دو سالہ بچی کے متعلق پوچھنے لگا۔

میں عمران کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ گھر پہ مجھے کام بھی کیا تھا۔ رات گئے تک سڑکوں کی لمبائیاں ہی ماپنا تھی نا۔

عمران ایک خوبصورت سفید کوٹھی میں رہائش پذیر تھا۔ یہ کوٹھی درختوں میں بل کھاتی بیلوں اور خوبصورتی سے تراشیدہ گھاس کے قطعوں میں گھری ہوئی تھی۔ گیٹ سے ہی امارت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ڈرائیو وے کے دونوں طرف سرخ انگارہ سے گلابوں کے مہکتے تختے سبز مخملیں گھاس اور پھوار برساتے مرمریں فوارے دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ کوٹھی باہر سے کہیں زیادہ اندر سے شاندار تھی۔ ڈرائینگ روم جہاں عمران نے مجھے لا بٹھایا اتنا خوب صورت اور نفاست سے آراستہ تھا کہ چند لمحے تو میں مبہوت ہی رہ گیا۔

" بہت خوبصورت گھر ہے تمہارا" میں نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

" یہ سب تمہاری بھابی کی پسند اور خوش ذوقی ہے" وہ جیسے اترا کر بولا۔ میں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ گویا اس کی بیوی کی حسن سلیقگی کی داد دی۔ رشنہ واقعی خوش ذوق تھی۔ وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملی "عمران اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں میرا ایک ہی دوست ہے بچپن کا۔ اچھا ہوا وہ آج آپ کو گھر لے آئے۔ غائبانہ تعارف تو تھا ہی آج مل بھی لیا۔ بہت خوشی ہوئی" "شکریہ بھابی!" میں اس مشفق اور شائستہ خاتون کے انداز تخاطب سے کچھ اور مرعوب ہو گیا۔ دونوں نے صرف پرتکلف چائے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ رات کے کھانے پر بھی مجھے روک لیا۔ اور پھر دونوں مجھے کرائے کی بیٹھک پر ڈراپ کرنے آئے۔

" اب آتے جاتے رہنا" عمران نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پیار سے کہا "ان کی جگہ تو دیکھ ہی لی ہے نہ آئے تو خود پکڑ کر لے جایا کریں گے" رشنہ بھابی نے مسکرا کر کہا "دونوں کا خلوص اور محبت دیکھ کر میری جھجک دور ہو گئی۔ میں بھی ہنس کر بولا "بھابی تنگ آجائیں گی مجھ سے" "نہیں بھیا۔ تمہاری بھابی ایسی نہیں" رشنہ نے کہا "آپ عمران کے دوست

ہیں اور میرے بھائی۔" "شکریہ" میں اب ہفتے میں ایک آدھ بار ان کے ہاں جانے لگا۔ عمران اور رشنہ بڑے پیار سے ملتے۔ ان کی بچی مجھ سے بڑی مانوس ہو گئی۔

ان دنوں عمران ورلڈ ٹور کا پروگرام بنا رہا تھا۔ یہ اس کا بزنس ٹرپ تھا۔ لیکن رشنہ بھابی بھی ساتھ جانا چاہتی تھی۔ بزنس ٹور کو تفریحی دورہ بنانا ان دولت مندوں کے لیے مشکل تھوڑا ہی تھا۔ بیگم کی فرمائش رد کیوں کر کرتا۔ دنوں ہی میں دوڑ دھوپ کر کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔

اس دن میں بھی ان کے ہاں گیا تھا۔ رشنہ بھابی نے تیاری مکمل کر لی تھی۔ صرف گھر اکیلا چھوڑنے سے متفکر تھیں۔ یوں تو ان کے رشتہ دار اس شہر میں تھے۔ لیکن ہر کوئی اپنے گھر کا ذمہ دار تھا۔ کوئی بھی ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر میں رہ کر نگہداشت کرنے کی ذمہ داری نہیں لے رہا تھا شاید۔ اسی لیے تو اس دن اچانک ہی رشنہ بھابی کو میرا خیال آ گیا۔ اس نے عمران سے کچھ کہا اس کی اثبات میں ہلتی گردن دیکھ کر وہ مجھ سے بولیں۔

"طاہر بھائی۔ آپ چند ماہ ہمارے گھر آ جائیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"گھر اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی رشنہ" عمران نے کہا۔

"نوکر چاکر تو ہیں" میں نے کہا۔

"بھئی ہیں تو سہی۔ لیکن نوکر ہی ہیں۔ ذمہ دار تو نہیں۔ آپ گھر میں رہیں گے تو ہمیں تسلی رہے گی۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اصرار سے بولی "دیکھیے بھیا انکار نہیں کیجیے گا آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ دونوں نوکر یہیں ہوں گے۔ آپ کا سارا کام کریں گے۔ مجھے تسلی رہے گی کہ آپ گھر پہ ہیں۔ ان دنوں چوری چکاری۔"

"خدانخواستہ میرے ہوتے ہوئے کچھ ہو گیا۔ تو۔" میں نے ان کی بات سمجھتے ہوئے خدشہ

ظاہر کیا۔

"آپ یہاں ہوں گے تو انشاءاللہ کچھ نہیں ہو گا۔ سب کو پتہ ہو گا کہ گھر پہ نوکروں کے علاوہ بھی کوئی ہے۔"

میں چند لمحے تذبذب میں پڑا رہا۔ رشنہ اور عمران کا بھرا ہوا گھر نادر اور نایاب چیزیں۔ قیمتی سامان کیا مجھے ذمہ داری لینا چاہیئے۔؟؟

میرے دل نے تو یک دم ہی ہاں کہہ دی۔ دراصل میں اس ٹھاٹھ دار اور شاہانہ زندگی کو دیکھ کر دل میں خواہش مچلتی پا رہا تھا کہ ایسی زندگی میں بھی گزاروں۔ یہ خواہش اپنی آمدنی سے تو کبھی پوری ہونا ہی نہیں تھی۔ عمران اور رشنہ کی وجہ سے موقع مل رہا تھا۔ تو گنواتا کیوں کر۔

میں ابھی چپ ہی تھا کہ رشنہ نے کہہ دیا" بس ٹھیک ہے۔ طاہر بھائی یہاں رہیں گے۔ اب میں تسلی اور اطمینان سے اس ٹور پر جا سکوں گی۔"

میں ہولے سے مسکرا دیا۔

اگلے ہفتے وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے اور میں اس شاندار سجی سجائی کوٹھی میں آیا۔ عمران کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ ایک وہ میرے تصرف میں دے گیا۔ دونوں نوکروں کو بھی میری خدمت کے لیے مامور کر گیا۔

مجھے یوں لگا جیسے مجھے چند مہینوں کے لیے بادشاہی مل گئی ہے۔ ٹھاٹھ سے رہنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ صبح آنکھ بھی نہ کھلتی کہ خوبصورت نازک سے برتنوں میں ٹی ٹرے پر رکھی چائے آ جاتی۔ ملازم مجھے آہستہ آہستہ مؤدبانہ طریق سے پکار کر بیڈ ٹی لینے کو کہتا۔ میرے اٹھنے تک میرا لباس استری کر کے رکھ دیا جاتا۔ جوتے چمکا کر رکھے ہوتے۔ ناشتے کی میز پر دو تین اردو دو انگریزی روزنامے رکھے ہوتے۔ میں تیار ہو کر دفتر جانے لگتا تو ملازم دوپہر کے کھانے کا پوچھتا۔ رات کو مجھے کیا کھانا ہے وہ بھی دریافت کرتا۔ میں کبھی من پسند چیز بتا دیتا۔

کبھی کہہ دیتا کہ کھانا باہر کھاؤں گا۔ نوکر میرا بریف کیس۔ جس کی مجھے قطعاً ضرورت نہ ہوتی لاکر گاڑی میں رکھ دیتا اور میں سیاہ چشمہ رومال سے صاف کرتے ہوئے تمکنت سے گاڑی میں آبیٹھتا۔ مجھ میں آپوں آپ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور میں اپنے آپ کو عمران ہی کا ہم پلہ سمجھنے لگا۔

گاڑی میرے تصرف میں تھی۔ اور میں اس سے خوب استفادہ کر رہا تھا تنخواہ بھی خوب اڑا رہا تھا۔ پٹرول پانی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اور ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں کھانا اور چائے پینا معمول بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی دوستوں کو مرعوب کرنے کے لیے بھی عیاشی کروا دیتا۔ میں اپنی موجودہ زندگی میں اس طرح بہہ گیا تھا۔ کہ مجھے اپنی بیوہ ماں جوان بہنوں اور تعلیم حاصل کرنے والے بھائیوں کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر خرچہ بھیجنے میں بے قاعدگی آگئی تھی اور بہت ہی کم رقم بچتی تھی جو میں انہیں بھجوا رہا تھا۔ ماں کے خط بھی آئے تھے۔ اپنی مجبوری کا رونا بھی رویا تھا۔ تنگی کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن میں نے خط پڑھ کر یونہی ڈال دیئے تھے۔ کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اپنی چند دن کی شاہانہ زندگی پر میں کسی پریشانی کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔ میں تو ان دنوں اک بے فکرا امیر زادہ بنا ہوا تھا۔ انجانوں کو یہی تاثر دے کر تسکین حاصل کیا کرتا تھا۔

آج بھی میں اس ریسٹورانٹ کے ہال کی مسحور کن فضا میں بیٹھا تھا۔ اور گرد پھیلے خوبصورت چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی رگ و پے میں سرور بن کر اتر رہی تھی۔

زیادہ دیر یونہی بیٹھے رہنا آداب کے منافی تھا۔ میں بے دلی سے اُٹھا۔ گاڑی کی چابی انگلی کے گرد گھماتا بیرونی دروازے کی طرف آیا۔ شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو قدموں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ جھک کر دیکھا۔ تو اک زنانہ نفیس سا پرس تھا۔ پرس میں نے اٹھا لیا۔

میں نے پرس کو یونہی الٹا پلٹا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ دور نزدیک کوئی عورت ایسی نظر نہ آئی

جو کسی گمشدہ چیز کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہو۔

میں پلٹا۔ یہ پرس ریسٹورانٹ کے مینجر کو دے دینا چاہیے یقیناً کوئی عورت اس ریسٹورانٹ میں آتے یا جاتے گم کر گئی ہے۔ لیکن۔!

میں نے پرس مینجر کے حوالے کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ اس پرس میں پڑے پیسوں کو اڑا لینا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ یہ کسی خاتون کا پرس تھا۔ اور جتنا نازک اور قیمتی پرس تھا۔ اس سے میں نے پرس والی اک اچھوتی سی موہنی سی شبیہہ خود ہی گھڑ لی تھی۔

میں گاڑی کی طرف آیا۔ پرس ڈیش بورڈ پر رکھا اور گاڑی چلا دی۔ رات جب میں اک لمبی ڈرائیو کر کے واپس پہنچا تو پرس اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ سائیڈ ٹیبل پر پرس ڈال کر میں لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

پرس میں بہت سی چیزیں تھیں۔ میں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگا۔

اڑھائی تین سو روپے کے نوٹ تھے۔ کچھ ریزگاری تھی۔ چھوٹی سی نوٹ بک اور پنسل تھی۔ ایک لپ اسٹک اور دو تین تہہ شدہ کاغذ تھے۔ ایک لفافہ تھا اور ایک ڈرائے کلینر کی چٹ۔ ایک کی رنگ میں چار چابیاں بھی تھیں۔

میں نے جلدی سے لفافے پر پتہ دیکھا۔ کسی مسز ثانیہ کمال کا نام کا تھا۔ گھر کا پتہ درج تھا۔ یقیناً یہ پرس مسز ثانیہ کمال کا نام میرے ذہن میں مہکی مہکی لڑکی کی صورت بگڑنے لگی۔ میں نے منہ بنایا اور ڈرائی کلینر کی چٹ پر نگاہ ڈالی اس پر بھی وہی نام اور پتہ درج تھا۔ ایک شال ایک مردانہ جیکٹ دو بچگانہ سوٹ دھلائی کے لیے دیے گئے تھے۔

تو مسز ثانیہ کمال بچوں والی عورت تھی۔

میں نے ساری چیزیں ناگوار تاثر کے ساتھ پرس میں ڈالیں۔ اس وقت میری انگلیاں کسی سخت سی شے سے مس ہوئیں۔ میں نے ٹٹولا اور پھر ایک کونے سے سخت سی چیز نکال لی۔

دو ائر رنگ اور ایک انگوٹھی میری ہتھیلی پر تھے۔ میں نے دونوں کو غور سے دیکھا۔ میں نہیں جانتا تھا یہ آرٹیفشل ہیں یا اصلی۔ اگر اصلی تھے تو ڈائمنڈ کے تھے اور یقیناً قیمتی بھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ پرس مسز ثانیہ کے لیے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس میں سے گھر کا پتہ بھی مل گیا تھا۔ اس لیے اسے واپس کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا تھا۔

میں نے پرس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر لیمپ آف کر دیا۔ دوسرے دن میں مسز ثانیہ کمال کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ ایک پرانی وضع کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ لکڑی کا بڑا سا گیٹ ادھ کھلا تھا۔ سامنے چوڑی بجری کی سڑک تھی۔ دائیں ہاتھ کوٹھی کے عین سامنے پورچ تھی۔ جس میں گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کا پرلا دروازہ کھلا تھا شاید کوئی اندر بیٹھ رہا تھا۔

میں نے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی رکنے کی آواز پر پوری پورچ میں کھڑی گاڑی کی کھلی کھڑکی سے ایک لڑکی نے جھانک کر میری طرف دیکھا۔

میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔

وہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اس کے چہرے پر اجنبیت کی چھاپ تھی۔ وہ کچھ حیران سی ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف آیا۔ شائستگی سے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کمال صاحب کا گھر ہے نا؟“

”جی۔“ لڑکی کی نظر مجھ پر اور میری گاڑی پر پڑ رہی تھی۔ میں فخر سے کچھ تن سا گیا۔

”مجھے مسز کمال سے ملنا ہے۔ گھر پہ ہوں گی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی۔ ہاں۔ ہیں بھابی گھر پہ ہی ہیں۔“ وہ اپنے چہرے پر جھک آنے والے بالوں کی لٹ کو ایک ہلکے سے جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

اس نے بھی مجھے بغور دیکھا پھر بولی ”بھابی آپ کی کچھ۔“

میں ہنس کر بولا ”وہ میری کچھ نہیں لگتیں۔ نہ ہی میں ان کا کچھ لگتا ہوں۔ ان کی

کوئی شے کھو...“ ”اوہ۔ بھابی کا پرس گم ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔

”وہی لوٹانے آیا ہوں۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”ریسٹورانٹ سے نکلتے وقت میرے پاؤں سے ٹکرایا تو میں نے اٹھا لیا۔“

”اس میں۔ اس میں“ وہ گھبراہٹ کے عالم میں بولی۔

اس گھر کا پتہ تھا۔ خوش قسمتی سے۔“ میں نے اس کی گھبراہٹ کا سبب جانتے ہوئے جان بوجھ کر کہا۔

”بھابی کی قیمتی ...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر بولی ”آیئے ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہیں بھابی کو بلاتی ہوں۔“

اس نے مجھے ڈرائینگ کے دروازے پر چھوڑا اور خود دوسرے دروازے سے اندر چلی گئی۔ اس کی گھبراہٹ اور خوشی سے مجھے اندازہ ہو گیا۔ کہ ایئر رنگ اور انگوٹھی ڈائمنڈ ہی کے ہیں۔

میں ڈرائینگ روم میں ابھی بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ مسز ثانیہ کمال اس لڑکی کے ساتھ آ گئی۔ مسز ثانیہ کمال پینتیس چھتیس برس کی دبلی پتلی اچھے نقش و نگار کی فیشن ایبل خاتون تھی۔ میں نے سلام کیا جلدی سے جواب دیتے ہوئے وہ بولی ”میرا پرس آپ کو ملا تھا؟“ ”جی ہاں“ میں نے کہا۔ وہ لڑکی تجسس سے میرے ہاتھ میں پکڑے پرس کو دیکھ رہی تھی۔

”اس میں“ مسز ثانیہ کمال عجلت آمیز گھبراہٹ سے بولیں۔ پھر خیال آیا۔ مجھ سے کہا ”تشریف رکھئے مسٹر

طاہر۔ میں نے مسکرا کر لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھ گیا وہ دونوں بھی برابر کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں دل ہی دل میں سرشاری کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پرس لوٹانے کا فرض اب خاصہ خوشگوار لگ رہا تھا۔

میں نے پرس مسز کمال کی طرف بڑھا دیا۔

بڑی بے تابی سے پرس لیتے ہوئے اس نے پوچھا" کہاں ملا تھا؟"

میں دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا" پہلے اپنی چیزیں چیک کر لیجئے" وہ لڑکی بشاشت سے بولی" جب پرس لے آئے ہیں تو ظاہر ہے چیزیں بھی پوری ہوں گی"

میں قدرے شوخی سے بولا" ضروری تو نہیں"

وہ میری بجائے بھابی کی طرف دیکھ کر بولی" اور کچھ ہو نہ ہو۔ ان کے ایرنگ اور انگوٹھی ضرور ہوں اس میں" "بھئی انہی کا تو مجھے غم تھا۔ اتنے قیمتی" مسز کمال نے پرس کھولتے ہوئے کہا۔

میں پھر شوخی سے بولا" مجھے پتہ ہوتا اتنے قیمتی ہیں۔ تو نکال لیتا دونوں چیزیں" "ایماندار آدمی ہیں" وہ بولی" شکریہ" مسز ثانیہ کمال اپنے ایرنگ اور انگوٹھی دیکھ چکی تھی" بہت بہت شکریہ۔ پتہ نہیں کیسے گر گیا تھا پرس۔ گاڑی میں بھی پتہ نہیں چلا۔ گھر آکر جابیاں نکالنے کی ضرورت پڑی تو پرس گم تھا" "پلیز ساری چیزیں چیک کر لیں" میں نے اس سے کہا۔ وہ مسکرا بولی" اصلی چیزیں چیک کر لی ہیں۔ یہی کافی ہے" مسز ثانیہ کمال نے واقعی پیسے چیک نہیں کیے۔ اپنی قیمتی چیزیں پا کر وہ جتنی خوش تھی۔ بیان سے باہر ہے۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میری ایمانداری کی تعریف کر رہی تھی۔ اور میں اپنے آپ کو بڑا معتبر سمجھتے ہوئے خوشی سے پھولا جا رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پرس مجھے کب اور کہاں ملا۔ وہ بار تشکر سے جھک جھک گئی۔ چند لمحے یہی کچھ ہوتا رہا۔ پھر وہ سنبھلی۔ اسے خیال آیا کہ مجھے چائے وغیرہ پوچھنی چاہیے" نمی" مسز کمال نے لڑکی سے کہا۔

وہ چائے کے لیے اُٹھنے لگی۔ تو میں نے جلدی سے کہا" شکریہ چائے کا تکلف نہ کیجئے" "آپ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ چائے تو ضرور پئیں گے کمال گھر پہ ہوتے تو آپ کو کھانے پہ روک لیتی" ثانیہ نے کمال شفقت سے کہا۔ پھر اس نے خود ہی کہا" میں اور کمال آپ کا شکریہ ادا کرنے آپ کے گھر آئیں گے۔ آپ کے گھر والوں سے بھی مل لیں گے" میں

نے دیکھا نمی کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ وہ چائے کا کہنے جا رہی تھی۔ ثانیہ نے کہا۔

" آپ رہتے کہاں ہیں" نمی رُک گئی۔ شاید میرے گھر کا پتہ سننے میں اسے بھی دلچسپی ہونے لگی تھی۔

میں نے اسے عمران کے گھر کا نام اور سٹرک بتا دی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا" آپ عمران ولا میں رہتے ہیں یعنی" اب تو نمی گھوم کر کرسی کی پشت پکڑے میری طرف دیکھنے لگی تھی۔

" جی" میں دھن میں کہے گیا" عمران میرے بھائی ہیں۔ ویسے آج کل میں گھر پہ اکیلا ہی ہوتا ہوں بھیا اور بھابی ورلڈ ٹور پر گئے ہیں۔ ہم عموانڈسٹریز کے مالک ہیں۔ دونوں۔ بھائی صاحب اس دفعہ بھابی کو بھی ورلڈ"

آپ کے بھائی اور بھابی" نمی نے حیرانگی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا اور میری بات کاٹ دی۔

" جی" میں نے مسحور کن نظروں سے اسے دیکھا۔ ثانیہ اور نمی نے بھی ایک دوسری کو دیکھا۔ میں نے جیب سے پن نکالا اور ایک چٹ پر عمران کا فون نمبر لکھ کر ثانیہ کی طرف بڑھایا" یہ میرا فون نمبر ہے۔ شکریے کے تکلف کی تو ضرورت نہیں۔ ویسے مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اور کمال صاحب کبھی میرے غریب خانے پر تشریف لائیں" ثانیہ نے نمبر دیکھا۔ نگاہیں گھمائیں اور نمی کو نمبر دکھاتے ہوئے بولی" یہ ان کا فون نمبر ہے" نمی ایک دم کچھ کہنے کو تھی کہ ثانیہ نے کہا جاؤ بھئی چائے کا تو کہہ آؤ۔ جاؤ نا" ثانیہ نے اسے کہنی ماری۔ نمی چل دی۔ ثانیہ میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر بولی" عمران آپ کے دوست ہیں" میں اپنی امارت کا رعب جمانے کو جلدی سے بولا" جی نہیں بھائی ہیں۔ ہم دو ہی تو بھائی ہیں۔ بزنس بھی ہم دونوں کا ہے" "اچھا" اس نے لبوں میں مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ سے میں کچھ سٹپٹایا اسی لیے جلدی سے پوچھا" آپ عمران کو جانتی ہیں"

"جی نہیں" وہ جلدی سے بولی "بڑے آدمی ہیں۔ نام سن رکھا ہے۔ عموا انڈسٹریز کا نام غیر معروف نہیں"

"نوازش!" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر اپنی امارت کی ڈینگیں مارنے لگا۔ ثانیہ تھوڑی دیر کو معذرت کر کے اُٹھ کر چلی گئی۔ واپس آئی تو نمی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں اب بڑی دلچسپی سے میرے ساتھ باتیں کرنے لگیں وہ مجھ سے میری بزنس، رشتہ داروں اور گھر بار کے متعلق کرید کرید پوچھنے لگیں۔ میں نے سمجھا کر تیر مار لیا نمی کی مہک میرے حواس پر چھا رہی تھی اس لیے میں خوب بڑھا چڑھا کر بتانے لگا۔ صرف امیر زادہ ہی نہیں بنا نواب زادہ ہونے کا بھی تاثر دیا۔ مجھے لگا دونوں مرعوب ہو رہی ہیں۔ خوب دلچسپی لے رہی ہیں میری باتوں اور میری امارت کا سکہ ان پر بیٹھ گیا ہے۔ میں شیر ہو گیا۔ صوفے پر بڑے اعتماد سے پوز بناتے ہوئے بولا "عمران بھائی تو بھابی اور بچی سمیت ورلڈ ٹور پر گئے ہوئے ہیں۔ ان دنوں سارا بار میرے کندھوں پہ ہے۔"

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ" چمکتی نظروں سے دیکھتے ہوئے نمی بولی۔

"عمران آپ سے بڑے ہیں۔ یا چھوٹے" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

"بڑے" میں نے گاڑی کی چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے کہا۔

"بڑے مالدار لوگ ہیں آپ تو" ثانیہ مجھ سے کہتے ہوئے نمی کو دیکھ کر مسکرائی۔

میں "ذرہ نوازی ہے" کہتے ہوئے قدرے جھک گیا۔

چائے آ گئی۔ چائے کے دوران بھی میں خوب ڈینگیں مارتا رہا۔ جانے اپنی کونسی تشنہ اور گرسنہ خواہشوں کی تسکین کے لیے میں جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ شاید ان دونوں پر اپنی امارت کا رعب ڈال کر میں ان کی نظروں میں اپنے نمبر بنا رہا تھا۔

وہ دونوں شاید مرعوب ہوئی جا رہی تھیں، میرا خیال یہی تھا۔ نمی تو بہت شریر ہوئی جا رہی تھی۔

جی تو نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کو۔ لیکن پہلی ملاقات کو اتنی طوالت دینا موزوں نہیں تھا۔

"اب اجازت چاہوں گا" میں نے دونوں کی طرف دیکھا۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بھیا آجائیں تو ہم آپ کے ہاں شکریہ ادا کرنے آئیں گے" نمی بولی ثانیہ نے اس کی طرف شوخ نگاہ ڈال کر گھنی مسکراہٹ لبوں میں دباتے ہوئے کہا "ہم انہیں کھانے پر مدعو کریں گے۔ یہ ہمارے گھر آئیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے" نمی مسکرائی "ضرور۔ ضرور۔ بلائیں گے انہیں"۔ پھر نظریں گھما کر شوخ ادائی سے کہا "ایک تو پرس لوٹانے کا احسان ہے۔ دوسرے شہر کے اتنے بڑے آدمی کو کھانے پر بلانے کا اعزاز۔"

"نوازش ہے" میں عجز یہ انداز کی اداکاری کرتے ہوئے مسکرا دیا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

ئیں چائے کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ ثانیہ کچھ کہنے ہی کو تھی۔ کہ پندرہ سولہ سالہ لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ جلدی میں مجھے سلام کیا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "می رشنہ آنٹی کا فون ہے امریکہ سے جلدی آئیں انکل عمران بھی بات کریں گے۔ اُٹھیں —— اٹھیں —— جلدی کریں ——"

رشنہ اور عمران

میرے ذہن پر تازیانے سے برس گئے۔ میں نے گھبرا کر ثانیہ کو دیکھا جو دروازے کو تیزی سے پار کر کے جا رہی تھی۔ پھر میری نگاہ نمی پر پڑی۔

جو

بڑے ہی تمسخرانہ انداز میں مجھے تکتے ہوئے اپنی امنڈتی ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں بے حد گھبرا گیا ——

نی اک مسکراتی نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے بولی "رشنہ ہماری بہن ہیں اور عمران ہمارے بہنوئی عمو انڈسٹریز کے مالک ان دنوں ورلڈ ٹور پہ ہیں ـــــ امریکہ پہنچ چکے ہیں وہیں سے فون آیا ہے ـــــ"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا ـــ جی چاہا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

کئی لمحے میں گُنگ سا رہا۔ "آپ بیٹھیے ـــ میں بھی رشنہ سے بات کر لوں ـــ" وہ پلٹی۔

شاید اس نے دانستہ مجھے بھاگ جانے کا موقعہ دیا ـــ

میں اٹھا ـــ اور آندھی کی طرح کمرے سے نکلا ـــ ڈرائیور باہر آیا اور گیٹ سے باہر نکلتے ہی اس چور کی طرح تیزی سے جدھر منہ اُٹھا بھاگنے لگا۔ جس کے پیچھے تعاقب کرنے والے لگے ہوں۔

پرچی

یہ اس کی پُرانی عادت تھی۔

اتنی پُرانی

کہ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ کہ اس عادت کی جڑیں بچپن کے کس حصے میں پھیلی تھیں۔ کوئی بات بھی تصفیہ طلب ہوتی۔ کوئی امر بھی متنازعہ ہوتا۔ کسی فیصلے کو بھی آخری شکل دینا مشکل ہوتا۔ تو وہ جھٹ سے کاغذ قلم نکال لاتا۔

"پرچی ڈالو۔ پرچی..... وہ کہتا۔

اور

پھر خود ہی کاغذ کے دو چوکور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر ایک پر ہاں لکھتا دوسرے پر نہ..... ان ٹکڑوں کو تہہ کر کے دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر وہ لمحہ بھر کے لیے پرچیوں کو اچھالتا۔ پھر مٹھی کھول کر کاغذ کے تہہ شدہ ٹکڑے ہتھیلی پر رکھ کر کسی کے سامنے کر کے کہتا۔

"ایک اٹھا لو۔ جونسا دل چاہے اُٹھا لو....."

کاغذ کا تہہ شدہ ٹکڑا اُٹھا لیا جاتا۔ اسے کھول کر پڑھا جاتا۔ ہاں ہوتا تو فیصلہ ٹھیک مانا جاتا۔ نہ نکلتا تو نفی ہو جاتی۔

اکثر کاغذ اُٹھانے کی ذمہ داری وہ بچوں کو سونپتا۔ معصوم بچوں کو جو ابھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان سے کوئی ہیرا پھیری ہونا ممکن نہ تھی۔ وہ تو بس یونہی اُٹھا لیتے تھے پرچی۔

ان کی اٹھائی ہوئی پرچی پر سب کو اعتماد کرنا پڑتا تھا۔

پہلے تو یہ اس کا اک کھیل تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہنسی مذاق کے علاوہ یہ مستند فیصلے کرنے کا ذریعہ بھی بن گیا۔ وہ اتنی سنجیدگی سے پرچی ڈالنے کا کام کرنے لگا تھا۔ کہ جب بھی خاندان میں یا دوست احباب کو کوئی حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا اثبات اور نفی کی درمیانی کیفیت سے نکل نہ پاتے۔ وہ اس سے کہتے۔

"سمجھ نہیں آرہا کیا کریں۔ امر تم ہی کچھ بتاؤ بھئی...... ہاں اور نہ کے درمیان لٹک رہے ہیں۔"

امر جھٹ سے کاغذ قلم لے آتا" کوئی مشکل نہیں۔ پرچی ڈالتے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر۔ وہ جو فیصلہ اسے منظور ہو گا کر دے گا......"

پرچیاں لکھی جاتیں۔

تہہ کی جاتیں..... مٹھی میں چند لمحے بند کر کے ہلائی جاتیں۔

پھر کسی معصوم بچے کے سامنے ہتھیلی پر رکھی پرچیاں کر دی جاتیں۔ بچہ سے کہا جاتا" ایک اٹھا لو....."

بچہ پرچی اُٹھا کر دے دیتا..... پھر اس میں ہاں ہوتا یا نہ...... اس پر ہی عمل کیا جاتا تذبذب ختم ہو جاتا۔ کشمکش باقی نہ رہتی۔ اطمینان اور سکون سے فیصلہ ہو جاتا۔

اپنے اور دوسروں کے بہت سے الجھے معاملے اس نے یوں حل کیے تھے۔

پرچیوں پر صرف ہاں اور نہ ہی نہیں لکھی جاتی تھی۔ بعض اوقات نام لکھے جاتے۔ بعض اوقات جملے لکھے جاتے۔ لیکن فیصلے کا طریقہ وہی تھا۔

اسے یاد نہیں تھا۔ کہ یہ طریقہ اس نے کسی سے سیکھا تھا یا خود ہی ایجاد کر لیا تھا۔

اسے یاد تھا۔ کہ پہلی دفعہ یہ پرچی ڈالنے کا کھیل اس نے تیسری جماعت میں کھیلا تھا۔

کلاس میں استاد کے ٹیبل کے دائیں ہاتھ والے ڈسک پر بیٹھنے کے لیے ریحان اور امجد

میں روز ہی جھگڑا ہوتا تھا۔

ریحان پہلے آجاتا۔ تو وہ ڈیسک پر قبضہ کر لیتا۔

امجد پہلے آتا تو وہ براجمان ہو جاتا۔

ہر ایک اس ڈیسک کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ اس بات پر دونوں میں روز ہی تکرار ہوتی۔ ایک دوسرے کی کتابیں اٹھا پھینکتے۔ دھکم دھکا کرتے۔ اور اب تو گالیاں بھی بکنے لگے تھے۔ امر نہیں چاہتا تھا۔ کہ دونوں میں لڑائی جھگڑا ہو۔ دونوں اس کے اچھے دوست تھے۔ ایک دن اس نے دونوں کو سمجھایا۔

"بھئی تم آپس میں فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے ....." اس نے کہا۔

"یہ جگہ میری ہے" امجد بولا۔

"سب سے پہلے میں اس ڈیسک پر بیٹھا تھا"

"بات سنو....." اس نے بڑے بزرگوں کی طرح دونوں کو متوجہ کیا۔

"ہوں" دونوں بولے۔

"میں فیصلہ کر دوں تمہارا..... روز روز کا جھگڑا ختم ہو جائے"

"کرو....."

"منظور ہو گا دونوں کو"

"ہاں......"

"پرچی ڈالتے ہیں....."

"پرچی؟"

"ہاں"

"جس کا نام نکل آئے وہی اس ڈیسک پر بیٹھا کرے....."

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ لیکن امر نے انہیں پیار سے سمجھایا..." بھئی فیصلہ تو آخر

کہنا ہی ہے۔ ورنہ تم دونوں تو آپس میں لڑمروگے۔ سب لڑکے تم پر اب بھی ہنستے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں۔ اتنی سی تو بات ہے۔ پرچی ڈال لیتے ہیں۔ اللہ میاں نے جس کو یہ ڈیسک د ہوگا اسی کا نام نکل آئے گا......"

"ٹھیک ہے" دونوں بچے رضامند ہوگئے۔

"لاؤ کاغذ" امر نے کہا" ایک پنسل بھی......"

امجد نے کاپی میں سے کاغذ پھاڑا...... ریحان نے پنسل دی۔

امر نے دو پرچیاں بنائیں.....

ایک پر ریحان کا نام لکھا۔

دوسری پر امجد کا۔

پھر بڑی احتیاط سے دونوں کو تہہ در تہہ کیا۔ پھر تہہ شدہ چوکور ٹکڑوں کو دونوں ہاتھوں کے اندر بند کرکے مٹھی بنائی اور کافی دیر تک انہیں ہلاتا رہا......

امجد اور ریحان دم سادھے کھڑے دیکھتے رہے۔

امر نے کچھ دیر کے بعد دونوں ہاتھ الگ کیے، دایاں ہاتھ پھیلا کر اس پر تہہ شدہ دونوں پرچیاں رکھیں۔

پھر ہتھیلی کلاس کے سب سے چھوٹے لڑکے کے سامنے کرتے ہوئے بولا ایک پرچی اُٹھالو...... شاہد"

اس نے پرچی اُٹھالی۔

امر نے دوسری پرچی میز پر رکھ کر شاہد سے پرچی لی۔ اور بسم اللہ پڑھ کر آہستہ آہستہ کھولنے لگا.....

"ریحان" اس نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا نام پڑھا۔

"ریحان خوشی سے اچھل کر تالی بجانے لگا۔ امجد کا چہرہ بجھ سا گیا۔ جلدی سے اس نے

میز پر پڑی دوسری پرچی اٹھا کر کھولی۔ اس کا نام اس پرچی پر لکھا تھا۔

فیصلہ ہوگیا تھا۔

اس دن کے بعد ریحان اور امجد سیٹ کے لیے کبھی نہیں اُلجھے۔

اس نے کھیلوں میں بھی کسی دفعہ اپنے ساتھیوں میں اسی طرح فیصلہ کروایا۔

گھر کے باہر والی گراؤنڈ پر کرکٹ کھیلا جاتا تھا۔ بچوں کی فوج ظفر موج ہوتی۔ باقاعدہ ٹیمیں بنی ہوتیں۔

لیکن ترتیب نہیں رکھی جاتی تھی۔ کبھی کپتانی پر جھگڑا ہوتا۔ کبھی باری لینے پر سلمان اور اسد تو اکثر ایک دوسرے پر بیٹ چلانے لگتے۔

"میں کپتان ہوں" ایک کہتا۔

"نہیں مانوں گا میں۔ کپتان میں ہوں" دوسرا کہتا۔

"بھئی تم لوگ روز ہی جھگڑتے ہو۔ ایک بار فیصلہ کیوں نہیں کرلیتے....." امر کہتا۔

"پرچی ڈالیں......؟" دونوں کہتے۔

"بالکل۔ ابھی فیصلہ ہوجائے گا..... پھر لڑائی نہ جھگڑا۔ فیصلے پر کاربند ہونے کا پہلے ایمانداری سے عہد کرلو"

"ٹھیک ہے"

امر جیب میں کاغذ پنسل رکھے رہتا تھا۔ جھٹ سے پرچیوں پر نام لکھے جاتے اور جس کا نام نکلتا۔ وہ عہد کے مطابق فیصلے کا پابند ہوجاتا......

اسی طرح باری لینے کا بھی فیصلہ ہوجاتا۔

امر پرچی ڈالنے کے معاملے میں خاصہ معتبر اور مشہور ہوگیا تھا۔ گھر میں خاندان میں، گلی محلہ میں سکول میں۔ جب بھی کوئی بات تصفیہ طلب ہوتی۔ اس سے کہا جاتا" یار امر ڈالو پرچی.....

یا۔

وہ خود ہی کہہ دیتا..... "پرچی ڈالو پرچی۔ معاملہ ابھی طے ہوجاتا ہے۔"

اب تو سنجیدہ مسئلوں میں بھی پرچی ڈال کر فیصلہ کیا جانے لگا تھا۔ گلی کی نکڑ پر زیدی صاحب رہتے تھے۔ انہیں زمین خریدنا تھی۔ لیکن فیصلہ نہ کر پا رہے تھے۔ کہ کونسا پلاٹ موزوں ترین ہے۔ دونوں ہی خریدنا چاہتے تھے۔ اور نہیں بھی۔

امر سے ذکر کیا۔ اور ہنس کر بولے "یار ڈالو پرچی۔ ہاں یا نہ۔ فیصلہ کر ہی لیں۔"

امر نے پرچی ڈالی۔

ہاں نکل آیا۔

زیدی صاحب نے فوراً ہی دونوں پلاٹوں کا سودا کر لیا۔ اور ان کی خوشی کی حد نہ رہی۔ دونوں پلاٹوں کی قیمت چھ ماہ ہی میں بہت زیادہ ہو گئی۔

بڑی آپا کے رشتے کا فیصلہ بھی اسی پرچی نے ختم کیا تھا۔

پھپھو اور خالہ دونوں ہی رشتے کی خواہشمند تھیں۔ امی ابو بیچارے سمجھ نہ پاتے تھے کہ کیا کریں۔ رشتے دونوں ہی اچھے تھے۔ گھر کے لڑکے دیکھے بھالے تھے۔ دونوں ہی تعلیمیافتہ تھے اور اچھی نوکریوں پر لگے تھے۔

بڑی آپا سے پسند پوچھی گئی۔

تو۔

انہوں نے کہہ دیا "امی ابو جہاں چاہیں کر دیں۔"

وہ اپنا جھکاؤ کسی ایک رشتے کی طرف ظاہر کرتیں۔ تو معاملہ نپٹ جاتا۔ انہوں نے فیصلہ امی ابو پر چھوڑ دیا تھا۔

اور۔

امی ابو کے لیے دونوں ہی ایک جیسے تھے۔ دوسری بیٹی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ ورنہ

ایک کا ہاتھ پھپھو کے بیٹے کے ہاتھ میں دیتے تو دوسری کا خالہ کے بیٹے کے ہاتھ میں۔

لیکن۔

نبیلہ تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔

"امی" امر نے ماں کو پریشان دیکھا تو بولا۔

"ہوں"

"آپ نے بڑی آپا کے رشتے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"سمجھ نہیں آتا کیا کریں۔"

"آپ تو چاہیں گی خالہ کے ہاں ہو۔"

"شاید"

اور ابو کی خواہش ہو گی پھپھو کے ہاں۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"فیصلہ نہیں ہو رہا؟"

"نہیں......"

"میں کر دوں؟"

"پرچی ڈال کر۔"

"بالکل....."

"خالہ اور پھپھو مانیں گی؟"

"ظاہر ہے ماننا پڑے گا۔ سب کو بلا کر پرچی ڈال لیتے ہیں۔"

"یہ کھیل سنگین معاملوں کو حل نہیں کر سکتا بیٹے......"

"اور کوئی طریقہ ہے۔"

"نہیں"

"تو پھر یہی طریقہ اختیار کریں امی۔"

اس نے واقعی پھپھو اور خالہ کو قائل کر لیا۔ دونوں رضامند ہوگئیں۔ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ اس نے پرچی ڈالی۔ قرعہ فال خالہ کے نام نکلا۔ پھپھو کو مایوسی تو ہوئی۔ لیکن پرچی کا فیصلہ ماننے کا اقرار کر چکی تھیں۔ امر نے بخیر وخوبی یہ مشکل معاملہ حل کر دیا۔

اب تو سبھی اس کے قائل ہو گئے۔ اس پر اعتماد کرنے لگے۔ اور ہر تصفیہ طلب معاملے میں اس سے پرچی ڈالنے کی مدد لینے لگے۔

امر کو تو اب جیسے عادت ہی پڑ گئی معاملہ عام نوعیت کا ہوتا۔ یا سنگین کا جھٹ سے کاغذ قلم نکالتا اور پرچیاں لکھ کر ہاں نہ کا فیصلہ کر لیتا۔ چھوٹی سی نوٹ بک اور پنسل اب ہر وقت اس کی جیب میں رکھی رہتی۔

اپنے معاملے میں کبھی کبھی وہ ٹھگی بھی کرنے لگا تھا۔ یہ ٹھگی بے ضرر ہی ہوا کرتی تھی۔ امی سے پیسے بٹورنا ہوتے۔ یا دوستوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا۔ تو امی ذرا سخت گیر ہو جاتیں بگڑنے لگتیں "تیرے لیے تو خزانوں کا منہ کھلا ہے۔ جب خود کمائے گا تو قدر آئے گی پیسے کی۔ اڑاتا پھرتا ہے باپ کی کمائی۔ جیب خرچ لے لیتا ہے پھر کیوں مانگتا پھرتا ہے۔ ذرا ہوش سے کام لیا کر۔ صرف تو ہی نہیں اس گھر میں تیرا چھوٹا بھائی بھی ہے۔ سب کو خرچہ دینا ہوتا ہے۔ حرام کی کمائی نہیں آتی اس گھر میں......"

امی کی سرزنش سے مرعوب ہوئے بغیر وہ لجاجت سے کہتا" اس دفعہ دے دیں اگلے مہینے کاٹ لیں بیشک۔

"نہیں دوں گی......"

"پلیز امی"

"کہا ہے نا نہیں دوں گی نہیں دے سکتی۔ ہیں ہی نہیں میرے پاس دوں کہاں سے"

"امی اتنی سخت گیر آپ کیوں ہو جاتی ہیں۔ دے دیں نا......"

"نہیں دوں گی بس کہہ دیا......مجھے پتہ ہے تو جس طرح اڑائے گا ان پیسوں کو...."

"دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں.....امی"

"تو ان سے کہہ نا خرچہ کریں وہ"

"وہ بھی کریں گے......"

"بس۔ نہیں دینا پیسے۔ اور ہاں دوستوں کے ساتھ بھی آوارہ گھومنے کی ضرورت نہیں۔ تجھے کچھ فکر ہے اپنی پڑھائی کی"

"فکر ہے۔ پیسے دے دیں ساری فکریں دور ہو جائیں گی۔ اور ہاں امی میرے دوست سب کے سب لائق فائق ہیں۔ ایرے غیرے نہیں ہیں۔ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں پلیز امی اب تو دے دیں"

"نہیں دوں گی......"

"امر منت سماجت کرتے تھک جاتا تو پھر اپنا حربہ استعمال کرتا۔

چلیں امی پرچی ڈال لیتے ہیں۔ ہاں نکلا تو پیسے دے دیجئے گا۔ نہ نکلا تو میں بالکل بھی مطالبہ نہیں کروں گا۔ ٹھیک......

وہ امی کو پرچی ڈال کر ہاں نہ کا فیصلہ کرنے پر راضی کر لیتا۔

"کاغذ قلم لیتا۔ بڑی احتیاط سے چوکور کاغذ کا سا۔ پھر دونوں پر لکھتا۔ مٹھی میں طے شدہ پرچیاں بند کر کے ہلاتا۔ پھر ایک پرچی اٹھواتا۔

"پرچی کھلی"

"ہاں" وہ اچھل پڑتا......

امی اس کے ہاتھ سے پرچی چھین کر اعتبار کرنے کو خود پڑھتیں ہاں ہی لکھا ہوتا۔

"مجبوراً انہیں امر کو پیسے دینا پڑتے۔ امر مسکراتے ہوئے دوسری پرچی جلدی سے پھاڑ دیتا۔ کیونکہ اس نے اس پر بھی ہاں ہی لکھا ہوتا۔ بے ضرر سی ٹھگی وہ اکثر امی سے پیسے

بٹورنے یا باہر دوستوں کے ساتھ جانے کی اجازت لینے ہی کے لیے کیا کرتا تھا۔

ایک بار ابو سے بھی اس نے ایسی ہی ٹھگی کی۔ کالج میں داخلہ لینا تھا۔ ابو چاہتے تھے۔ کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ لیکن اسے خود یہ لائن پسند نہ تھی۔ انجینئر بننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی پسند ابو پر ظاہر بھی کی لیکن وہ ماننے کو تیار نہ تھے زبردستی اپنا فیصلہ اس پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ اک باپ ہونے کے ناطے یہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ خاصے بارعب اور سخت قسم کے انسان تھے وہ۔

امر کو کسی طور گلو خلاصی کی امید نظر نہ آئی۔ تو اس نے سنجیدگی سے ابو سے کہا۔

”ایک بات کہوں ابو“

” ہوں“ وہ بولے۔

” آپ میری بات مانیں گے۔“

” کیا؟“

” پرچی؟“

” ٹھیک ہے“

” فیصلہ آپ مان لیں گے نا“

” مان لوں گا۔ لکھو میری پرچی۔“

امر نے جھٹ سے دو پرچیاں لکھیں۔ دونوں پر ہی ”انجینئرنگ لکھ دیا“

ابو نے خود ہی اس کی ہتھیلی سے پرچی اٹھائی۔ امر ڈر رہا تھا۔ کہیں دوسری پرچی بھی نہ کھول لی جائے۔ ادھر ابو نے پرچی کھولی ادھر اس نے دوسری مسل کر پھینک دی۔

ابو ”انجینئرنگ“ کا لفظ پڑھ کر ایک لمحہ کچھ مایوس سے ہوئے پھر مسکراتے ہوئے بولے ”تم جیت گئے بھائی“

” امر جو دم سادھے کھڑا تھا۔ خوشی سے اچھل کر بولا ”کیا نکلا ابو.....“

” انجینئرنگ“ وہ پرچی پھینکتے ہوئے بولا۔

”ابو“ وہ خوشی سے بولا۔ ابو نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے کو تھپکا۔ وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔

پرچی کے فیصلے مستند ہوتے گئے۔ اس میں کوئی کمال کی بات نہیں تھی۔ ہر کوئی دو پرچیاں ڈال کر ہاں نہ کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ جس کو تصفیے کی ضرورت ہوتی وہ امر ہی کی طرف رجوع کرتا۔ اس سے پرچیاں ڈلواتا اور پھر اسی کا فیصلہ دل و جان سے قبول کرتا۔

اکرم اس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھے۔ اکرم کی تیاری امتحان کچھ تسلی بخش نہ تھی۔

” امر میرا خیال ہے میں اس دفعہ امتحان نہ دوں“ اس نے مشورے کے لیے امر سے بات کی۔

” کیوں“

” تسلی نہیں۔ پوری طرح تیاری نہیں کر سکا۔“

” ابھی وقت ہے کر سکتے ہو......“

” یقین نہیں.......“

” امتحان ضرور دو۔ کیوں وقت ضائع کرو گے۔

” فیل ہو گیا تو......“

” اس کی نوبت ہی کیوں آئے۔ ابھی سے دن رات ایک کر دو......“

” پتہ نہیں کیوں اطمینان نہیں ہوتا۔ پڑھتا بھی ہوں۔ تو بھی لگتا ہے پاس نہیں ہوؤں گا۔“

” خواہ مخواہ ڈر بیٹھ گیا ہے۔ تمہارے دل میں“

” اسی لیے تو کہتا ہوں۔ اس دفعہ امتحان میں نہ بیٹھوں۔“

"پرچی ڈال لیں؟"

"ہاں نکل آیا تو"

"تو پھر تم ضرور امتحان دو گے۔ اور انشاء اللہ پاس بھی ہو جاؤ گے۔"

"پرچی ڈالی گئی..... اتفاق سے ہاں نکلا....."

"مارے گئے" اکرم نے پرچی پڑھ کر کہا۔

"نہیں دوست، خلوص نیت سے تیاری کرو کامیاب ہو جاؤ گے۔ اللہ میاں نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے۔ اس میں بہتری ہی ہو گی....."

اکرم نے امتحان دے دیا اور وہ پاس بھی ہو گیا۔ امر کو پرچی ڈالنے کی کامیابی کی ایک اور سند مل گئی۔ خاندان کی لڑکیاں بھی پاس فیل ہونے کی پرچیاں اس سے ڈلوایا کرتی تھیں، وہ ان سب میں بڑا مقبول تھا۔ اکثر اپنے من پسند رشتوں کے لیے بھی وہ اس سے چپکے چپکے پرچی ڈلوایا کرتی تھیں۔ وہ کبھی سنجیدگی سے کبھی شوخی اور مذاق سے ہاں نہ کی پرچیاں ڈال دیا کرتا تھا۔ شغل کا شغل رہتا۔ مذاق کا مذاق۔ یوں وہ اپنی سب کزنوں میں بڑا مقبول اور سب سے خاصہ فری تھا۔ وہ بھی اس سے عزیز ترین سہیلیوں کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔ اپنی پسند ناپسند کے لڑکوں کا اس سے بے دھڑک کہہ دیا کرتی تھیں۔

ایک دن وہ اپنی قریبی کزنوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ عاصمہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ اسے یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ لیکن ماں باپ کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ پرچی کا سہارا ہی لینا پڑا تھا۔ ہاں نکلنے کی صورت میں اسے اسی جگہ رشتہ کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ کرنا تھا۔

سب اس کے گرد جمع تھیں۔ ہنسی مذاق بھی ہو رہا تھا۔ عاصمہ کو نصیحتیں بھی کی جا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ پرچیاں ڈالی جا رہی تھیں۔

"نہ نکلا تو....." فریحہ نے امر سے پوچھا۔

"تو نہ کر دے گی عاصمہ" امر نے جھٹ سے کہا۔

"ماموں ممانی مانیں گے" فریحہ بولی۔

"میں منوا لوں گا....." اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"وہ یہ رشتہ کبھی نہیں چھوڑیں گے" عاصمہ نے سر ہلایا۔

"پرچی نکلنے تو دو..... ہاں عاصمہ تم ہاں نکلنے کی صورت میں ہتھیار ڈال دو گی سمجھیں" وہ عاصمہ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"عاصمہ نے سر ہلایا۔

پرچیاں تہہ کی گئیں۔ پھر امر نے ہتھیلی پر رکھیں۔ اور ہتھیلی حمیرا کے آگے کر دی۔ سولہ سترہ سالہ حمیرا اس کے چھوٹے ماموں کی بیٹی تھی۔ شروع ہی سے امر کو بہت پسند تھی۔ اور اب یہ پسند رنگ بدلتی جا رہی تھی..... وہ اسے پیار کرنے لگا تھا..... لیکن اس پیار کا اظہار اس نے حمیرا سے کبھی نہیں کیا تھا۔

حمیرا اس کی ہتھیلی سے پرچی اٹھانے لگی تو امر نے شوخی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ حمیرا کانوں تک سرخ ہو گئی۔

"سوری" امر نے شوخ اور پیار بھری نظروں سے حمیرا کو دیکھ کر کہا۔

لڑکیاں امر کے جذبات کو سمجھ گئی تھیں..... ان میں سے ایک شوخی سے بولی" بھئی امر عاصمہ کی پرچی کے بعد حمیرا کی پرچی ڈالنا"

حمیرا شرما کر گھبرا کر اسے تیز نظروں سے دیکھتی اُٹھ کر چلی گئی۔

"حمیرا تمہیں بہت پسند ہے....." لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔

"اچھی لڑکی ہے" وہ عاصمہ کی پرچی کھولتے ہوئے بولا۔

پرچی میں ہاں نکلا تھا۔ سب لڑکیاں عاصمہ کے گرد ہو گئیں..... یہ فیصلہ اس نے منظور کرنا ہی تھا۔

امر نے انجینئرنگ کر لی۔ اب مسئلہ نوکری کا تھا...... امی ابو چاہتے تھے کہ جو بھی نوکری ملے وہ کر لے لیکن امر چاہتا تھا۔ وہ بیرون ملک جا کر ایم ایس سی کرے۔ اس سلسلے میں اس نے کافی معلومات حاصل کر لی تھیں...... والدین صاحب حیثیت تھے۔ باہر بھجوانا اور اعلیٰ تعلیم کا حصول ان کی نظر میں بھی مستحسن تھا۔ لیکن امی ابو دونوں ہی چاہتے تھے۔ کہ وہ یہیں نوکری کر لے۔ باہر جا کر لڑکوں کا آزاد و آوارہ ہو جانا ایسا تجربہ تھا۔ جس سے ان کے دو ایک ملنے والوں پر گزر چکے تھے۔ اسی لیے وہ گریزاں تھے۔ لیکن امر بضد تھا...... اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا تھا...... اپنے پاؤں پر مستحکم انداز میں کھڑے ہونے کا متمنی تھا...... اس نے امی ابو کی بات ماننے سے بڑی ملائمت سے انکار کیا۔ اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ کئی دن بحث و تکرار ہوتی رہی..... یہاں بھی پرچی کام آئی۔ اس دفعہ پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے ماں باپ سے ٹھگی کی۔ دونوں پرچیوں پر ہاں لکھ دیا۔

امی ابو اس کی بات مان گئے۔

لیکن

جانے سے پہلے امی نے یہ شرط لگا دی۔ کہ وہ منگنی نکاح کر کے جائے گا۔ وہ اسے اس مقدس اور مضبوط بندھن میں باندھ کر دیارِ غیر میں بھیجنا چاہتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اس بندھن کی ڈوریاں اسے وہاں بھٹکنے نہیں دیں گی۔

امر سٹپٹایا تو بہت۔ لیکن بات غیر معقول بھی نہیں تھی۔ دل کے بندھن تو جانے کب سے حمیرا سے بندھ چکے تھے۔ ہرج ہی کیا تھا۔ جو اس بندھن کا اعلان ہو جاتا۔

امیّ نے خاندان کی چند خوبصورت سلیقہ شعار اور خوش ذوق لڑکیوں کے نام اس کے سامنے رکھے۔ ان میں حمیرا کا نام بھی تھا.....

"پرچی ڈالو گے؟" امیّ نے مسکرا کر پوچھا.....

"وہ مسکرا کر بولا" بے شک ڈال لیں....."

"تمہاری مرضی۔ اچھا ہے پرچی ڈال کر فیصلہ کر دو۔..."

اس نے جیب سے قلم کاغذ نکالا سات آٹھ پرچیاں بنائیں۔ سب پر حمیرا کا نام لکھا۔ حسب عادت اپنی غرض کے لیے ٹھگی کی اور

پھر

امی نے اس کے نام کی انگوٹھی حمیرا کی انگلی میں پہنا دی۔ گھر کا معاملہ تھا نہ اس کے والدین کو پوچھ گچھ کرنا تھی۔ نہ ہی حمیرا کے والدین کو جانچ پڑتال۔ رشتہ طے ہو گیا......

وہ تین سال کے لیے امریکہ چلا گیا...... پڑھائی کی۔ نوکریاں کیں۔ اس ماحول کا لطف اُٹھایا۔ لیکن اپنی محبت کو سینچ سینچ کر ہی رکھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ محبت کی جڑیں گہری ہوتی گئیں...... حمیرا اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی.....

جب وہ کامیاب و کامران ہو کر واپس لوٹا۔ تو حمیرا سے ملن کی لگن بے تاب تھی۔ اس کی آنکھیں حمیرا کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ لیکن اسے پتہ چلا۔ کہ ماموں کی ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ اور ان دنوں وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دوسرے شہر میں بس رہے ہیں....

پہلی فرصت میں وہ ماموں کے ہاں پہنچا۔ جوش و جذبات سے مغلوب تجسس سے بیقرار اک دنیا من میں سمیٹے اضطرابی کیفیت سے دوچار......

لیکن۔

حمیرا نے اس کا استقبال بڑے سفاکانہ سرد رویّے سے کیا۔ وہ سہم گیا ڈر گیا۔ وہ تنہا لمحوں کا منتظر تھا۔ کہ اس سفاکانہ سرد مہری کی وجہ اس سے پوچھے..... اس کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی شام حمیرا اس کے کمرے میں آ گئی..... کچھ نادم نادم لیکن جرأت مندانہ انداز لیے بولی" امر..... تم جانے سے پہلے مجھے پوچھے بغیر جس بندھن میں باندھ گئے تھے۔ میں......"

"کیا..... حمیرا....." وہ بے اختیارانہ لہجے میں بولا۔

"میں اس بندھن کو قبول نہیں کر سکتی......" وہ ہمت سے بولا۔

"کیوں!"

"میں کسی جواب کے لیے تیار نہیں۔"

"حمیرا...... تم......"

"میں نے جو کہنا تھا۔ کہہ دیا" وہ جانے کو مڑی۔

"لیکن......" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا" ہماری منگنی ہو چکی ہے۔

"پرچی ڈال کر تم نے زبردستی فیصلہ مجھ پر مسلط کر دیا تھا......"

"لیکن یہ فیصلہ تمہیں قبول کرنا پڑا تھا......"

"تین سال پہلے میں انکار کی جرأت نہ کر سکی تھی"

"اب؟"

"کہہ دیا نا یہ فیصلہ مجھے منظور نہیں......"

"تم...... تم کسی اور سے......"

"یہی سمجھ لو......"

"ناممکن......" وہ چلایا......" تم میری منگیتر ہو...... یہ بندھن توڑنے کا تمہیں کوئی حق......"

"ہے...... حق ہے...... میں اب ناسمجھ لڑکی نہیں ہوں امر...... بیس اکیس سالہ ہوشمند لڑکی ہوں۔ اور اپنی پسند کا انتخاب کرنے کا مجھے پورا حق ہے......"

" وہ جتنی جرأت اور دلیری سے کمرے میں آئی تھی۔ اسی طرح کمرے سے نکل گئی۔

امر حواس باختہ سا کھڑے کا کھڑا رہ گیا......

پھر رات اس پر کیسے اُتری کیسے کیسے ظلم ڈھائے اس کی ذات پر...... کتنا دکھ سہا اس نے کتنے صدموں کا بوجھ سہا یہ وہی جانتا تھا......

لیکن رات کے لمحے لمحے سے نبٹ کر وہ سوچ کی راہیں استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے دن وہ حمیرا سے ملا...... اور دوٹوک فیصلہ سنا دیا......" تم میری منگیتر ہو...... اور میں یہ منگنی توڑنے کے خلاف ہوں......"

"امر" حمیرا اس کے فیصلے سے ڈر سی گئی...... یہ مت بھولو، زبردستی کے فیصلے اور تباہی اور بربادی پر منتج ہوتے ہیں...... میں ندیم کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

"تو نظر انتخاب ندیم پر ہے" امر کو دھچکا سا لگا...... ندیم بڑے ماموں کا چھوٹا بیٹا تھا...... لیکن اس نے حمیرا پر اس دھچکے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

حمیرا اس کی منتیں کرنے لگی۔ اور وہ سختی سے اپنی بات پر اڑا رہا......

حمیرا رو دی......

اس نے بالکل ترس نہیں کھایا......

"اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے...... لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

وہ اس سے الجھ پڑی۔ برا بھلا کہا۔ لیکن اس نے اپنے موقف میں تبدیلی نہیں کی۔

تھک ہار کر وہ بولی "تم مجھے کبھی نہیں پا سکو گے......"

وہ جلدی سے بولا" چلو اس بات کا ابھی فیصلہ کر لیتے ہیں......"

"کیسے......"

"پرچی ڈال لیتے ہیں......"

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں......"

" وہ سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ پرچی ڈال لیتے ہیں۔ جس کا نام نکلا اس کے حق میں تمہیں

فیصلہ کرنا پڑے گا۔۔۔۔

"یہ ایک اور زبردستی ہے..... تمہارا نام نکل بھی آیا تو میں تمہارے حق میں....."

"میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم بھی جانتی ہو۔ کہ جب کوئی متنازعہ مسئلہ ہو۔ یا فیصلہ نہ ہو سکتا ہو۔ میں پرچی ڈال کر فیصلہ کر لیتا ہوں....."

"لیکن...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بیٹھو یہاں....."

وہ میز کے پاس پڑی دوسری کرسی اس کے لیے گھسیٹ لایا۔ حمیرا مٹی کے ڈھیر کی طرح کرسی میں گر پڑی۔ امر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر...."

اس نے جیب سے کاغذ قلم نکالا.... دو چھوٹے چھوٹے چوکور کاغذ کے ٹکڑے کیے۔ ان پر نام لکھے۔ پھر ان ٹکڑوں کو احتیاط سے طے کیا۔ دونوں تہہ شدہ پرچیاں رکھ دیں۔ ہتھیلی اس کی طرف بڑھا دی

"ایک اٹھا لو.... اس نے کہا۔

"امر.... خدا کے لیے" وہ رو دینے کو تھی....

"خدا ہی فیصلہ کرے گا۔ اور جو فیصلہ ہوگا تمہیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ سمجھیں....؟"

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا.....

وہ تذبذب میں رہی۔

"اُٹھاؤ...." وہ گرجا۔

ڈرتے ڈرتے حمیرا نے ایک پرچی لے لی.....

حمیرا کا دم ہوا ہوا جا رہا تھا۔ بھربھری مٹی کے ڈھیر کی طرح کرسی میں پڑی تھی کس کا نام نکلنے والا تھا..... امید و بیم کی راہوں میں بھٹکنے کی بھی ہمت نہ تھی اس میں.....

امر نے اس کے ہاتھ سے پرچی لے لی۔

ہولے سے......

"پھر اس پر اک دلدوز نگاہ ڈالی...."

دونوں ہاتھوں سے تہہ شدہ پرچی کو پکڑا..... اور پھر آہستہ آہستہ اسے کھولا.....

حمیرا نے خوفزدہ ہو کر اک لمحہ کو آنکھیں بند کر لیں.....

"لو...." امر نے پرچی اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہی نام پڑھ دو...." وہ جیسے قبر سے بول رہی تھی۔

"ندیم....." مستحکم اور مضبوط لہجہ بنانے کے باوجود اس کی آواز ڈول گئی۔

"سچ..... حمیرا اچھل پڑی۔ اس کے ہاتھ سے پرچی چھین کر نام پڑھا۔

"ندیم..... واقعی ندیم...." وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو گئی..... پرچی سینے سے لگا لی۔ پھر کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی..... خوشی سے جیسے اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر امر سے بولی" دیکھا۔ ندیم نام نکل آیا..... جذبے سچے ہوں تو.... ہائے میں نے دل سے دعا کی تھی.....کہ..... وہ خوشی سے بہکتی بہکتی کمرے سے بھاگ گئی۔

امر کرسی میں بیدم سا ہو کر گر گیا.....

جیب سے مسلی ہوئی پرچی ہولے سے نکالی۔ کھولی.... پڑھی۔

اس پر بھی ندیم ہی لکھا تھا.....

اس نے پرچی کے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیئے.....

آج اس نے کسی دوسرے سے نہیں۔ اپنے آپ سے ٹھگی کی تھی۔

پاؤں کی زنجیر

"عثمان کے دونوں بچوں نے خودکشی کر لی۔"

"عمرانہ کے دونوں بچے مر گئے"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"مر گئے دونوں..... خواب آور گولیاں کھا لیں.....؟"

"ہائے ہائے یہ کیا ہوا....."

"کتنے پیارے بچے تھے"

"بچے خودکشی کیوں کرنے لگے۔ غلطی سے کھا گئے ہوں گے..... گولیاں"

"رقعہ چھوڑا ہے لڑکے نے....."

"یا خدا....."

"نو سال کا بچہ اور سات سال کی بچی..... خودکشی"

"ہاں ہاں خودکشی"

نعمان اور ثمرانہ کے مرنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس نے سنا فرطِ حیرت سے سر نفی میں ہلایا۔ اتنے معصوم ایسے پیارے اور اتنے چھوٹے بچے خودکشی کیوں کرنے لگے۔ سب عثمان کے گھر کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ پل بھر میں محلے لوگ راہگیر اپنے پرائے جمع ہو گئے۔ ہر ایک ہراساں تھا..... صحن کمرے باغیچہ سب عورتوں مردوں اور بچوں سے بھر گئے تھے۔ دونوں بچوں کی لاشیں ایک ہی پلنگ پر پڑی تھیں..... عمرانہ پاگلوں کی طرح

سینہ پیٹ رہی تھی۔ بال نوچ رہی تھی۔ چلا چلا کر دہائی دے رہی تھی۔ بچوں پر بار بار گرتی تھی..... بے تحاشہ چومتی تھی...... بیڈ کے دوسری طرف عثمان تھا..... ہوش و حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ کبھی سینے پہ ہاتھ باندھ کر ٹکر ٹکر دونوں کو تکنے لگتا۔ کبھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا..... تسلی دلاسہ دینے کا تو موقع ہی نہیں تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر تو غیر بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

اک کہرام مچا تھا۔

قیامت بپا تھی۔

بچوں کے ننھیال اور ددھیال والے بھی یہ ہوشربا خبر سنتے ہی چاک گریباں نالہ و شیون کرتے چلے آئے تھے معصوم بچے بے خبری کی ابدی نیند سو چکے تھے۔

دونوں بچے اپنے کمرے میں ایک ہی بیڈ پر پڑے تھے..... سکول جانے کے لیے وہ وقت پر نہیں اٹھے..... نوکر نے ناشتہ بھی میز پر لگا دیا..... عثمان دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر آ گیا۔

"نومی اور ثمر تیار ہو گئے....." اس نے پوچھا۔

"جی ابھی تو اُٹھے ہی نہیں....." نوکر بولا۔

"کیا..... جاگے ہی نہیں ابھی تک" عثمان نے گھڑی دیکھی پھر غصے سے نوکر کو دیکھ کر کہا "عجیب بدھو ہو تم..... ساڑھے سات ان کا سکول لگتا ہے..... وہ اٹھے نہیں تو تم نے بھی نہیں جگایا....."

"میں جگاتا ہوں جی"

"جلدی کرو....." وہ چیخا.....رات کا غصہ عود کر آیا تھا.....بیگم کی جگہ نوکر پہ ہی برس کر دل کا غبار نکالتا تھا شاید۔ نوکر ڈر کر کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔

عثمان کی گرج سے عمرانہ کی آنکھ بھی کھل گئی..... جاگ تو پہلے ہی رہی تھی۔ جان بوجھ کر

نہیں اٹھی تھی...... بچے ابھی تک اٹھے نہیں تھے، سکول سے دیر ہو رہی تھی...... وہ جلدی سے اٹھی بال انگلیوں سے ٹھیک کرتے وہ باہر نکلی...... بچوں کے کمرے کی طرف جانے سے پہلے وہ کھانے کے کمرے میں آئی۔

عثمان ناشتہ کرنے میز پر بیٹھ چکا تھا۔

"کیا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ بچے رات گئے تک تو تمہاری بک بک سنتے رہے ہوں گے...... دیر سے سوئے تو دیر ہی سے اٹھیں گے نا......"

"بکواس بند کرو......" عثمان نے چائے کی پیالی پر ہاتھ مارا...... پیالی میز سے نیچے گر کر چکنا چور ہو گئی......

عمرانہ غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ زور سے چلائی "تمہارے دماغ کا فتور بڑھتا ہی جا رہا ہے"

"دفع ہو جاؤ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا......"

"دفع ہوؤں گی یا تمہیں دفع کروں گی...... اب تو فیصلہ ہو ہی جائے گا......"

"یہ بچے نہ ہوتے تو میں اب تک فیصلہ کر بھی چکا ہوتا......"

"تو تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں برداشت کیسے جاتی...... بچے ہی پاؤں کی زنجیر ہیں ورنہ تم جیسے آدمی کے ساتھ اتنے سال تو کیا اتنے دن بھی نہ گزارتی......"

عثمان کو بھی تاؤ آ گیا تھا عمرانہ بھی غصے سے بے قابو ہو رہی تھی۔ تو تکار بڑھی......

عثمان غصے سے بل کھاتا کرسی سے اٹھا اور عمرانہ کو مارنے کے لیے اس نے ہاتھ اٹھایا......

لیکن

تھپڑ ہوا ہی میں لہرا گیا......

نوکر بدحواس سا دوڑتا ہوا آیا "صاحب جی...... بیگم صاحب جی...... وہ...... وہ بچے......"

"کیا ہوا بچوں کو" دونوں غصہ بھول کر نوکر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہ...... وہ جی......" نوکر کا رنگ فق تھا۔ دونوں ہاتھ بے تابی سے مل رہا تھا...... وہ کانپ بھی رہا تھا......

"کیا ہوا بچوں کو......" عثمان نے بے تابانہ اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

عمرانہ نوکر سے سوال کرنے کے بجائے بچوں کے کمرے کی طرف دوڑی۔

"نومی"

"ثمری"

اس نے دروازے میں داخل ہوتے ہی زور زور سے آوازیں دیں۔

دونوں ہلے تک نہیں تو وہ لپک کر ان کی طرف آئی......

"نومی...... نعمان بیٹے...... ثمرانہ......" اس نے جلدی جلدی دونوں کے چہروں کو ہاتھوں میں لے کر پکارا...... چہروں کی ٹھنڈک ہاتھوں سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی دوڑا گئی...... وہ چند لمحوں کو پتھرا سی گئی......

عثمان بھی کمرے میں آ گیا۔ دونوں بچوں کو اس نے بھی بڑے پیار سے پکارا......

جواب نہ پا کر اس نے ششدر کھڑی عمرانہ کو دیکھا۔

جلدی سے بولا...... "کیوں...... کیا ہوا......"

اس نے بھی جھک کر بچوں کے چہروں کو ہاتھوں سے چھوا...... آنکھیں پھٹنے کی حد تک کھلی رہ گئیں...... بدحواسی میں مڑ کر نوکر کو دیکھا اور پوچھا "کیا ہوا انہیں...... بے ہوش ہیں؟"

"مر گئے ہیں......" نوکر بھی بدحواس تھا۔

"کیا؟" عمرانہ نے سینے پر دوہتڑ مارا۔

"بکتے ہو......" عثمان نے جلدی سے بچوں کے ماتھے چھوئے...... جسم ٹٹولے...... سر اِدھر اُدھر ہلانے کی کوشش کی......"

"میرے بچے" عمرانہ تیورا کر گری..... عثمان نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ کرسی میں ڈالتے ہوئے پاگلوں کی طرح چلایا..... "کچھ نہیں ہوا..... بچے نہیں مر سکتے..... حوصلہ رکھو ..... سوئے ہوئے ہیں....."

"صاحب جی" نوکر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا..... بچوں کے سرہانے پڑی سکول کی کھلی کاپی پر اس کی نظر پڑی۔

وہ جلدی سے اٹھالی.....

نومی کی تحریر تھی.....

"یہ..... یہ صاحب جی....." اس نے کاپی عثمان کی طرف بڑھائی۔

عثمان نے بے تکی نظروں سے کاپی پر لکھی دو لائنیں دیکھیں۔

پنسل سے کاپی پر لکھے حروف گڈمڈ ہو کر پھیلنے لگے..... روشنی اندھیرے کی چادر بن کر پھیل گئی..... عثمان کے کانوں میں جھکڑوں اور آندھیوں کا شور گونجنے لگا..... وہ پچھاڑ کھا کر گرا.....

چند لمحے دونوں ہی بے سدھ سے ہو گئے۔

"صاحب جی..... صاحب جی....." نوکر نے روتے ہوئے اسے جھنجھوڑا..... عمرانہ نے بھی آنکھیں کھولیں..... عثمان بھی.....

"عثمان" عمرانہ چیخی۔

"یہ کیا ہو گیا عمرانہ" عثمان نے تھر تھر کانپتی عمرانہ کو بازوؤں کا سہارا دیا..... اور

پھر جو دونوں بے اختیارانہ تڑپے۔ چیخیں ماریں..... بے تحاشہ چلائے..... بال نوچ لیے..... سینے پیٹ لیے.....

نوکر دھاڑیں مار مار کر روتا باہر بھاگا..... ہمسائے چیخ و پکار سن کر دوڑے آئے.....

اک کہرام مچ گیا۔

قیامت بپا ہو گئی.......

کوئی سوال پوچھ رہا تھا۔

کوئی جواب دے رہا تھا۔

کوئی بچوں کے ماتھے چوم رہا تھا۔

کوئی سانس کی آس میں ان کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا.....

کسی کے ہاتھ میں نومی کی وہ کاپی تھی۔ جس پر اس کے تحریر کردہ الفاظ تھے۔

کسی کے ہاتھ میں خواب آور گولیوں کی خالی شیشی تھی۔ جو میز پر سے ملی تھی۔

کمرے لوگوں سے بھر گئے تھے..... برآمدوں میں لوگ کھڑے تھے۔ لان میں سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر آ گئے..... پولیس تک خبر پہنچ گئی۔

اک ہنگامہ بپا تھا۔

کہرام مچا ہوا تھا۔

ہر آنکھ پُرنم تھی۔

ہر ذہن بوجھل تھا۔

بچوں نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا..... لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ تاویلیں گھڑ رہے تھے قیاس آرائیاں کر رہے تھے.....

دس برس پہلے عثمان اور عمرانہ کی شادی ہوئی تھی۔ عمرانہ کا خاندان مالی لحاظ سے عثمان کے خاندان سے کچھ آگے نکلتا تھا۔ دونوں بڑے بھائی دونوں ہاتھوں دولت سمیٹ رہے تھے۔ حلال حرام کی کوئی حد بندی نہ تھی..... باپ بھی اک سرکاری عہدے پر تھا۔ اس عہدے کی کلیدی حیثیت تھی۔ اس نے بھی خوب مال بنایا تھا۔

پیسہ جیسے اندھا دھند آتا تھا۔ اخراجات بھی اسی بے دردی سے کیے جاتے تھے۔

عمرانہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا پیسے کی کمی نہ دیکھی تھی اس لیے اس کے ذہن میں پیسے کی اہمیت ہی نہ تھی۔ اہمیت تھی تو اپنی خواہشات کے مطابق خرچ کرنے کی۔ جو چاہا تھا پایا تھا۔ بھائیوں اور باپ کی لاڈلی تھی..... اسی لیے بھابیوں کے ہوتے ہوئے بھی بھائیوں سے جو چاہتی لیتی اور لے کر جس طرح چاہتی خرچ کرتی۔ سہیلیوں پر پیسہ اڑانے میں پیش پیش رہتی..... اچھے ڈریسز کی شوقین تھی۔ جوتے تو امپورٹڈ ہی اچھے لگتے تھے اسے...

عثمان ایک خوش شکل اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ سرکاری ملازم تھا تنخواہ محدود تھی لیکن کم نہ تھی۔ ماں باپ اور دو بہنیں تھیں۔ ایک بڑا بھائی تھا جو شادی شدہ تھا۔ امریکہ ہی میں سیٹل ہو گیا تھا۔ ماں باپ کو ہر ماہ باقاعدگی سے اتنے پیسے ضرور بھیجتا تھا کہ وہ اپنے اخراجات سے نپٹ لیتے تھے۔ اماں تھوڑا بہت پس انداز کر کے لڑکیوں کے جہیز کی کوئی نہ کوئی چیز بنا لیتی تھیں..... بڑی بہن نے ایم اے کر کے جاب کر لی تھی۔ چھوٹی بھی بی اے کے بعد بی ایڈ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس لیے عثمان پر گھر کے افراد کا کوئی خاص بار یا ذمہ داری نہ تھی۔

..... تنخواہ کا بیشتر حصّہ وہ اپنے اوپر ہی خرچ کر ڈالتا..... جو بچتا اماں کے ہاتھ پر دھر دیتا۔

امّاں اکثر سمجھاتیں "بیٹے کچھ جمع بھی کیا کرو۔ کل کو پیسے کام آئیں گے۔ کب تک یوں اکیلے رہو گے۔ سگریٹ پر ہی سینکڑوں روپے اڑا دیتے ہو..... شادی نہیں کرنی کیا، عادتیں یہی رہیں تو گھر گرہستی کیسے چلے گی....."

وہ ماں کی سنی ان سنی کر دیتا..... "دیکھا جائے گا اماں....." یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔

شادی کا چکر بھی اچانک ہی چل گیا..... اماں نے کسی تقریب میں عمرانہ کو دیکھا۔ بے حد پیاری اور سمارٹ سی لڑکی پسند آ گئی.....

"یہ لڑکی کون ہے" اماں نے اپنی دیورانی سے پوچھا جن کے ہاں فنکشن تھا۔

"میری ساحرہ کی دوست ہے اس کے ساتھ پڑھتی ہے....."

"بیٹی کس کی ہے"

"کیوں نظر انتخاب پڑ گئی"

"ہاں مجھے بہت اچھی لگی ہے"

"اچھے امیر گھرانے کی لڑکی ہے....."

"رشتہ وشتہ تو نہیں ہوا کہیں"

"ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی ہوا نہیں"

"اپنے عثمان سے کروا دو نا..... پڑھا لکھا برسر روزگار ہے جوان خوبصورت اور شریف ہے....."

"اچھا بات کروں گی....."

بات کیا چلی چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔ عثمان کو بھی عمرانہ پسند آ گئی تھی۔ عمرانہ کے گھر والے تو رشتے کے انتظار ہی میں تھے۔ ہر لحاظ سے عثمان موزوں ہی تھا۔ آمدن گو کم تھی لیکن عمرانہ کے گھر والوں کے پاس دولت سمیٹنے کے جو گر تھے اور اس کے ابا جس طرح مال بنانے کے فارمولے سے آگاہ تھے۔ وہ عثمان کو بھی سکھایا جا سکتا تھا۔ اس لیے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

اس شادی سے عمرانہ اور عثمان دونوں ہی خوش تھے۔ جب عمرانہ لدی پھندی دلہن بن کر عثمان کے پہلو میں آ بیٹھی تو اس وقت عثمان سرشار تھا۔ اسے یہ خیال نہیں تھا کہ عمرانہ بھاری بھر کم جہیز لے کر آئی ہے۔ اسے تو صرف یہی احساس تھا کہ ایک خوبصورت طرحدار اور چنچل سی لڑکی نے اس کی نامکمل زندگی کی تکمیل کر دی ہے۔ عمرانہ بھی اس ہینڈسم سے نوجوان کی قربت میں مالی تفاوت کو بھول گئی۔

ہر نوجوان جوڑے کی طرح انہوں نے بھی مسکراہٹوں اور خوشیوں کی پڑتی پھوار تلے نئی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا..... ہنی مون منایا..... ایک دوسرے سے والہانہ جذباتی وابستگی

کا پورے طور سے اظہار کیا۔ دو تین ماہ تو دونوں ایک دوسرے میں اس طرح کھوئے رہے کہ گرد و پیش کی جیسے خبر ہی نہ رہی۔

عمرانہ عثمان کی جان تھی۔

عثمان عمرانہ کی زندگی تھا......

وقت اپنی تمام تر رعنائیاں اور دلفریبیاں ان پر نچھاور کر رہا تھا..... زندگی حقائق کا سامنا کیے بغیر بہت آگے نکلتی گئی۔

لیکن طغیانی سدا ہی تو نہیں رہتی۔ سیلاب کناروں میں سمٹنے لگتے ہیں۔ جوش کو ہوش آنا ہی ہوتا ہے۔ زندگی کے معمولات اپنے تقاضے رکھتے ہیں..... جو سنجیدہ بھی ہوتے ہیں تلخ بھی اور ہلکے پھلکے بھی...... ان پر پوری پوری توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔

عمرانہ اپنے آپ میں لوٹی تو پہلی بات جو ذہن نے گوارہ نہ کی اور من میں کانٹوں کی طرح چبھی وہ ساس اور نندوں کی چبھتی باتیں تھیں۔

عمرانہ نے گھر کا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا..... ماں بھابیاں اور نوکر چاکر تھے گھر میں۔ اسے کبھی کسی نے کہا نہ کروایا۔ کبھی امی کہتی بھی تو بھابیاں ٹوک دیتیں" ساری عمر کام ہی کرنے ہیں نا کر لے گی...... یہ دن لوٹ کر پھر نہیں آئیں گے عمرانہ جتنا انجوائے کر سکتی ہے کر لے۔"

امی دل ہی دل میں بہوؤں کے اس رویے سے خوش ہوتی لیکن لاڈ سے کہتی "تم اس کا دماغ خراب کر دو گی" ماں اور بھابیاں تو لاڈ دیکھتی تھیں۔

لیکن

سسرال میں آکر یہ اللے تللے نہیں چلنے کے تھے۔ ساس نے اب تک بیٹے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اب اسے عمرانہ نے سنبھالنا تھا۔ صرف عثمان ہی کی نہیں پورے گھر کی ذمہ داری بہو پر ہی تو ڈالنا تھی۔

ساس توقع رکھتی تھی کہ بہو ہاتھ بندھی غلام بن جائے۔ ساس سسر کو صبح کی بیڈ ٹی سے

لے کر رات کے کھانے تک دیکھ بھال کرے۔ ہر طرح کا خیال رکھے۔ دونوں نندوں کے لیے ناشتہ بنائے کھانا پکائے..... کالج سے واپس آئیں تو چائے تیار ملے..... اور عثمان.... اس کی تو ساری ذمہ داری اسی پر ہونی چاہیے تھی۔

لیکن عمرانہ ان پابندیوں کو قبول کہاں کرنے والی تھی۔ وہ تو سو کر ہی اس وقت اٹھتی جب عثمان دفتر جا رہا ہوتا یا چلا جاتا.....

اس کے بعد بھی وہ دیر تک اپنے کمرے میں ہی رہتی۔ نہا دھو کر کپڑے بدلنے، بال بنانے، ناخن سنوارنے اور میک اپ کرنے میں خاصہ وقت لگ جاتا......

جب وہ باہر آتی تو نندیں کب کی کالج جا چکی ہوتیں۔ ملازمہ لڑکی باورچی خانے کا کام سمیٹ رہی ہوتی اور اماں جمعدارنی سے گھر کی صفائی کروا رہی ہوتی..... ابّا صحن میں کرسی ڈالے بیٹھے بہو کو تند نظروں سے دیکھتے..... جو بہی ٹھنی ملازمہ لڑکی کو ڈانٹنے کے انداز میں کہہ رہی ہوتی..... "میں نے کہا ہے ناشتہ لگا دو میرا...... یہ کام بعد میں نہیں ہو سکتے....."

"اچھا جی....." وہ سارے کام چھوڑ ناشتہ بنانے لگتی۔

کچھ دنوں سے ساس بہو میں سرد سی جنگ جاری تھی۔ ساس کو غصہ آتا۔ لیکن بظاہر مسکراتے ہوئے کہتی" لڑکی کو برتن دھو لینے دو..... بنا دے گی ناشتہ....."

عمرانہ کو بھی تاؤ آجاتا..... "آپ دخل نہ دیا کریں..... میری بات تو وہ سنتی ہی نہیں....."

"بہو ذرا خود بنا لو ناشتہ..... کام کر رہی ہے وہ..... سارے برتن مانجھنے والے پڑے ہیں..... باورچی خانہ الٹ پلٹ ہو رہا ہے..... تمہیں ناشتہ بنانا بھی نہیں آتا....."

عمرانہ ساس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے نوکرانی پہ غصہ جھاڑتی..... یوں ساس بہو میں کھٹ پٹ ہونے لگی تھی..... شروع شروع میں تو بات زیادہ نہ بڑھتی..... کبھی عمرانہ چپ ہو جاتی، کبھی ساس..... لیکن عمرانہ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی شکایت عثمان سے کرتی۔

"آج تیری امّاں نے یہ کہا"

"تیرے ابّا مجھ سے یوں بولے"

"تمہاری بہنوں نے یہ طنز کیا"

عثمان سنتا..... بات ہنس کر اڑا دیتا "عمرانہ..... میرے گھر والے اتنے بُرے بھی نہیں...... تم ان کی باتوں کا اُلٹ مطلب لیتی ہو......"

"میرا دماغ اُلٹا ہے نا......"

"لگتا تو ایسا ہی ہے....." وہ ہنس کر اسے بانہوں میں بھر لیتا..... عمرانہ کا غصہ ہوا ہو جاتا۔

لیکن

اب امّاں بھی بہو کے رویے سے دل برداشتہ ہو گئی تھی..... اٹھتے بیٹھتے وہ بھی عثمان کے کانوں میں شکایتوں کا لاوا اُتارتی رہتی......

"میری تو ہڈیاں دکھنے لگی ہیں۔ بھلا اب گھر کے کام مجھ سے ہو سکتے ہیں..... بہو لائی تھی، سوچا تھا اب سارے کاموں سے دستبردار ہو جاؤں گی۔ ساری عمر خدمت گزاری کی ہے۔ اب کچھ آرام ملے گا لیکن آرام اپنے نصیبوں میں کہاں...... صبح سے کولہو کے بیل کی طرح جتتی ہوں۔ رات گئے کہیں کمر بستر پر ٹکانے کو ملتی ہے......"

امّاں پر عثمان کو ترس آتا لیکن عمرانہ کو ان کی خدمت پر آمادہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا۔

پھر

انہی دنوں عمرانہ امید سے ہو گئی..... عثمان تو خوشی سے باؤلا سا ہو گیا..... عمرانہ بھی بہت خوش تھی۔

"ہمارا بچہ ہو گا عمرانہ۔ ہمارا اپنا بچہ..... میں تو ابھی سے خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں....."

عمرانہ اترا کر اسے دیکھتی..... "مجھے خوش رکھا کرو..... ڈاکٹر کہتے ہیں..... صحت مند

اور خوبصورت بچے کے لیے ماں کے ذہن دل و دماغ پر کوئی بار نہیں ہونا چاہیے....."

"تم پر بھی تو کوئی بار نہیں....."

"اچھا جی..... یہ جو ہر وقت تمہاری ماں بہنیں چخ چخ کرتی رہتی ہیں وہ میرے ذہن پر بار نہیں ہوتا"

"میں انہیں منع کر دوں گا..... مجھے پیارا پیارا موٹا تازہ بچہ چاہیے عمرانہ....."

"مجھے آرام کی بھی اشد ضرورت ہے....."

"میں ہر طرح سے خیال رکھوں گا....."

عثمان واقعی اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا۔ اس نے گھر والوں کو سختی سے کہہ دیا "عمرانہ کے ساتھ کسی تلخ ترش رویے میں بات نہ کیا کریں۔ نہ ہی اس سے کام کرنے کو کہا کریں..... ڈاکٹر نے اسے خوش رہنے اور آرام کرنے کی ہدایت کی ہے....."

"کون کرتا ہے اس سے تلخ ترش باتیں..... اور آرام..... آرام تو جس دن سے آئی ہے وہ کر رہی ہے..... بے آرامی تو ہمارا مقدر ہے....."

عثمان عمرانہ کے چاؤ چونچلے کرتا..... اماں کو یہ بات اچھی نہ لگتی جل بھن کر کہتیں "اس کے انوکھا بچہ ہونے والا ہے نا۔ ہم نے بھی یہ دن گزارے ہیں بچے جنے پالے پوسے اس طرح کے نخرے تو نہ دکھائے تھے کبھی....."

پھر وہ عثمان کے ابا سے شاکی انداز میں کہتی "کیوں جی..... تم کو ہوش نہ آئی تھی کبھی..... یوں ناز اُٹھائے تھے ہمارے..... بیٹے نے تو حد ہی ختم کر دی ہے۔ ہتھیلی کا چھالا ہی بنا لیا ہے بیوی کو۔ پہلے کیا کم تھی اب تو خیر سے ماں بننے والی ہے..... ناز برداریاں کیسے کرواتی ہے۔ توبہ....."

دن گزر رہے تھے۔ عمرانہ عثمان سے جتنی خوش تھی ساس سسر سے اتنی ناخوش۔

ایک دن اس نے عثمان سے کہہ ہی دیا۔

"عثمان..... میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔"

"کیوں..... کیا ہوا......"

"کوئی بات ہو تو کہوں بھی۔ ہر وقت کی بک بک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی....."

"اماں نے کچھ کہا....."

"سب کچھ تو تمہیں بتاتی ہوں"

"لیکن عمرانہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے یوں بد دل تو نہیں ہوتے نا....."

"دیکھو عثمان..... خوش رہنا اور مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو نا..... تو الگ گھر لے لو....."

"الگ گھر...."

"ہاں الگ گھر..... جو ہمارا اپنا ہوگا..... جس میں میں تم اور ہمارا بچہ رہے گا..... جانتے ہو اس طرح کے ماحول میں بچے پر بھی کیا اثر پڑے گا۔ اس کی اچھی تربیت کیسے ہوگی....."

عمرانہ اسی حوالے سے عثمان کو اکساتی رہی..... عثمان بھی اب بات بے بات ماں بہنوں سے الجھنے لگا۔ اور اس دن اماں نے تنگ آکر خود ہی کہہ دیا "الگ گھر لے لو..... روز کی کلکل ہم سے سہی نہیں جاتی..... ہماری جوان بیٹیاں ہیں۔ ان کے رشتے ناطے بھی تو کرنے ہیں..... پیشتر اس کے کہ گھر میں تو تکار لڑائی کی صورت اختیار کرلے..... بہتر ہے تم اپنا ٹھکانہ کر لو....."

عثمان نے ماں ہی کو مورد الزام ٹھہرایا..... عمرانہ نے اور بھڑکایا..... لڑائی جھگڑا ہوا جس کے نتیجے میں عثمان نے ایک چھوٹا سا بنگلہ کرائے پر لے لیا..... عمرانہ اور وہ اپنے سارے سازوسامان سمیت نئے گھر میں شفٹ ہوگئے..... جہیز کا کافی سامان تھا..... ہر کمرہ آراستہ ہوگیا.....

گھر الگ ہوگیا تھا۔ اب عمرانہ بے روک ٹوک اپنی سہیلیوں کو مدعو کرسکتی تھی۔ ماں باپ بے جھجک آسکتے تھے۔ بھائی بھابیوں کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کرسکتا تھا۔

"اب تو خوش ہو نا....." عثمان نے ایک دن عمرانہ سے کہا۔

"ہاں بالکل....." وہ اٹھلائی۔

"لیکن عمرانہ....."

"کیا؟"

"مجھے تم خوش نہیں رکھتیں....."

"وہ کیسے؟"

"کبھی میرے ماں باپ اور بہنوں کو بھی بلا لیا کرو....."

عمرانہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی "وہ خود نہیں آسکتے..... میں انہیں اٹھا کر لے آؤں"

"جانتی ہو لڑائی جھگڑے کے بعد ہم لوگ الگ ہوئے ہیں..... ہم چھوٹے ہیں ہمارا فرض ہے ہم انہیں منانے جائیں....."

"میری تو جوتی بھی نہیں جاتی....."

"عمرانہ....."

"زیادہ چیخو نہیں۔ جانا ہے تو خود چلے جاؤ..... میں نہیں جاؤں گی..... میری بلا سے..... آئیں نہ آئیں....."

عثمان کو اک دھچکا سا لگا..... عمرانہ یہ رویہ اختیار کرے گی اور اتنی بدتمیزی دکھائے گی۔ اسے بہت صدمہ ہوا..... اس وقت تو چپ ہوگیا لیکن دل میں گرہ سی بیٹھ گئی.....

"عمرانہ....." ایک بار اس نے کہا۔ دونوں اپنے ہونے والے بچے ہی کی باتیں کر رہے تھے۔

"ان دنوں..... اماں کو نہ بلا لیں"

"لے آؤ اماں کو۔ بٹھا دو میرے سر پر....."

"تمیز سے بات کیا کرو..... میری اماں کو تم..... اس طرح..... ذلیل....."

"وہ..... ہے ہی ایسی۔ کہ....."

"بکو مت......"

"رعب جھاڑتے ہو۔ کس بات کا..... گھر الگ لے کر دیا ہے اس لیے....."

"تم اس طرح کی کیوں ہوتی جا رہی ہو....."

"تم جیسے لوگوں میں آکر ایسی نہ ہوتی جاؤں تو کیسی ہوتی جاؤں..... شکر کرو گزارہ کر رہی ہوں..... تمہاری محدود تنخواہ میں....."

عثمان نے حیرانگی سے اسے دیکھا وہ غرائی "کبھی پوچھا بھی ہے گھر کیسے چل رہا ہے....."

"تم کہاں کی بات کہاں لے جا رہی ہو....."

"اس لیے کہ تم کچھ کے لگاتے رہتے ہو..... امّاں ہی کو بھول نہیں پائے..... چلے جاؤ اسی کے پاس رہا کرو..... وہاں تمہیں زیادہ سکون اور آرام ملے گا....."

وہ رونے لگی، عثمان اُٹھ کر باہر چلا گیا.....

لیکن پھر منانا اسی کو پڑا..... عمرانہ کی زچگی قریب آ رہی تھی۔ وہ اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ عورت اپنی جان پر کھیل کر ہی اک نئے وجود کو دنیا میں لاتی ہے، یہی سب سوچ کر عثمان نے اسے منا لیا۔ اس کی بدتمیزی اور اکھڑپنے کو نظرانداز کر دیا.....

"عثمان....." اس دن عمرانہ کا موڈ بہت اچھا تھا.....

"ہوں"

"بیٹا ہوا تو مجھے کیا دو گے؟"

"کیا دوں گا"

"ہاں......"

"اپنا آپ تمہیں دے دیا..... اب اور کیا لو گی"

"نہیں عثمان..... تحفہ کیا دو گے"

"جو چاہو لے لینا....."

"یہ کیا بات ہوئی..... کوئی ڈائمنڈ کی انگوٹھی۔ پرل کے کڑے..... بڑے بھیا نے بھابی کو ڈائمنڈ کا لاکٹ دیا تھا۔ تیس ہزار کا۔ چھوٹے بھیا نے دس تولے کے کڑے پہنائے تھے بھابی کو..... تم..... کیا دو گے"

"ساری تنخواہ تمہیں دے دیتا ہوں..... پیسے بچے ہوں تو تم بھی لے لینا....."

"ہونہہ....." عمرانہ کا موڈ بگڑ گیا۔ طنز سے بولی "تنخواہ ہوتی کتنی ہے تمہاری..... گزارہ بھی نہیں ہوتا..... امی پیسے نہ دیں یا بھابیاں آتے جاتے پانچ سو ہزار نہ پکڑا جائیں تو روٹی بھی نہ چلے....."

عثمان طنز سے دکھی ہوا..... گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا..... "تو پھر میں کیا کر دوں..... کہاں سے لاؤں پیسہ....."

عمرانہ بڑبڑ کرنے لگی تو عثمان کو بھی غصہ آ گیا..... بولا "جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہارے باوا کی طرح اُوپری آمدنی کھاتا ہوں نہ تمہارے بھائیوں کی طرح کالے دھندے کرتا ہوں..... حلال کی روزی کھاتا ہوں اور کھاتا رہوں گا یہ بات ذہن نشین کر لو....."

باپ بھائی کا حوالہ عمرانہ کو کیسے بھاتا۔ خوب بھڑکی..... اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ اسے خیال رہا نہ عثمان کو کہ آخری دنوں میں تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

نومی ہسپتال میں پیدا ہوا..... کیس نارمل ہی تھا۔ سارا خرچہ عمرانہ کی امی نے کیا۔ وہیں سے وہ اسے اپنے گھر لے گئی۔ سوا مہینے کے بعد عمرانہ نومی کو لے کر گھر آئی..... امی اور بھابیوں نے بچے کے کپڑے لتے دودھ کی بوتلیں جھولا کاٹ اور بہت کچھ دے کر بھیجا..... عمرانہ ہر ایک کو یہ چیزیں اترا اترا کر دکھاتی..... عثمان تو بچے کو پا کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا ہنس کر کہتا "ہمارے لیے تو سب سے قیمتی اور نایاب چیز یہ لائی ہو....."

بہت دن خوشگوار گزر گئے۔ عمرانہ بچے کی وجہ سے خاصی مصروف ہوگئی۔ عثمان بھی بچے سے لگا رہتا دونوں جیسے اپنی اپنی ذات کو بھول کر بچے کی ذات میں گم ہوگئے تھے لیکن یہ کچھ زیادہ عرصہ نہ چلا..... میاں بیوی کے نظریات میں اختلاف پیدا ہوجائے تو دوری کی خلیج پھیلتی چلی جاتی ہے۔ بچے کی آمد سے اخراجات بڑھے تھے کچھ عمرانہ نے بڑھا لیے تھے۔ اب چخ چخ اسی خرچے پر ہوتی رہتی..... عمرانہ کا تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا تھا اور عثمان فالتو آمدنی کا قائل نہیں تھا۔ اس نے تو یہی کیا کہ اماں کو جو دو تین سو روپیہ ماہوار دیا کرتا تھا وہ بھی بند کر دیا لیکن عمرانہ تو ابا اور بھائیوں کی سی کھلی آمدنی چاہتی تھی جس پوسٹ پر عثمان تھا مار دھاڑ کی جا سکتی تھی لیکن عثمان کردار کا جیسا بھی تھا کم از کم رشوت اور حرام کی کمائی سے گریزاں تھا۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں روز کا معمول بن گئیں...... نومی کی سالگرہ کے سلسلے میں تو خاصی لڑائی ہوئی۔ جس دھوم دھڑکے سے سالگرہ عمرانہ کرنا چاہتی تھی۔ عثمان اسے خرافات کہتا تھا۔ عمرانہ نے بھابی سے قرض لے کر یہ سالگرہ اس طرح منائی کہ کسی شادی کا گمان ہوا..... اس پر ستم یہ کہ اس نے ساس سسر کو بلایا نہ نندوں کو..... تڑاخ سے عثمان سے کہا "جب تمہارے پیسے سے کروں گی سالگرہ تو بلالوں گی انہیں بھی....."

جھگڑے اور اختلافات بڑھتے گئے..... عقلمندی سے عمرانہ کام لیتی تھی نہ عثمان ہی ادھار رکھتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی..... غصہ ناک پہ دھرا رکھتا تھا..... عزت و لحاظ نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی..... ہاں جب صلح ہوتی تو دونوں شیر و شکر ہوجاتے۔ ایسے لگتا جیسے ان میں کبھی کوئی جھگڑا ہوا ہی نہیں....."

ثمرانہ نومی کے دو سال بعد پیدا ہوئی..... گھریلو حالات وہی رہے۔ چار دن صلح تو آٹھ دن لڑائی..... ایک بار تو جھگڑا اتنا بڑھا کہ علیحدگی پر دونوں پل پڑے..... عمرانہ غصے میں گھر چھوڑ کر ماں کے گھر آگئی.....

عثمان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بچوں بنا گھر سونا لگا..... دو ہفتے بھی گزارہ نہ پایا..... سسرال

جا پہنچا اور منت سماجت کر کے عمرانہ اور بچوں کو لے آیا..... عمرانہ کی جیت ہوئی تو دماغ ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔

بچے اسی لڑائی جھگڑے کی فضا میں پلنے بڑھنے لگے۔ جو ان کی نشوونما کے لیے کسی طور اچھا نہیں تھا۔ عمرانہ کی ہمسائی مسز ارشد بہت اچھی عورت تھی۔ وہ اکثر عمرانہ کو سمجھاتی "بی بی..... تم ہی حوصلے اور صبر سے کام لیا کرو اپنے بچوں کا خیال کیا کرو۔ اس قسم کی فضا میں وہ نفسیاتی کیس بن جائیں گے..... بچوں کی خاطر ہی لڑائی جھگڑے سے اجتناب کیا کرو۔"

عمرانہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے سارا دوش عثمان کا ٹھہراتی "میرے ہی بچے تو نہیں اس کے بھی ہیں۔ وہ کیوں نہیں سوچتا۔"

"تم سوچو تو شاید وہ بھی سوچے....."

"میں..... میں ان بچوں کی خاطر ہی تو یہاں بیٹھی ہوں۔ ورنہ..... ایک دن نہ رہتی اس گھر میں....."

"جہاں اتنی قربانی دے رہی ہو وہاں یہ بھی کیا کرو کہ گھر کی فضا خوشگوار رہے۔ بچوں کی یہی عمر ماحول کا بہت اثر قبول کرتی ہے..... خدا نے تمہیں اتنے پیارے بچے دیئے ہیں..... تم نہیں چاہتیں کہ ان کی پرورش اور تربیت اچھی ہو....."

لیکن کسی کے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوتا..... عثمان کو بھی دوست یار سمجھاتے۔ اب تو اماں تک بھی لڑائی جھگڑے کی باتیں پہنچتی تھیں وہ بھی متفکر رہتیں جب بھی عثمان ملنے جاتا اسے سمجھاتیں..... "بیٹا اب بال بچے دار ہو..... سوچا سمجھا کرو کیوں بچوں کو بھی برباد کرنا ہے۔ غصہ حرام ہوتا ہے بیٹے..... عمرانہ بدتمیز ہے لڑاکی ہے زبان دراز ہے تو تم ہی منہ بند رکھا کرو۔ بول بال کر خود ہی چپ ہوجایا کرے گی..... لیکن تم تو شاید اس سے بھی زیادہ بھڑک اٹھتے ہو..... بچوں کی خاطر بیٹے..... بچوں کی خاطر برداشت کیا کرو۔"

نصیحتوں کا اثر چند دن رہتا..... گھر کی فضا خوشگوار ہوجاتی.....

لیکن پھر وہی کل کل وہی بک بک ۔

بچے اب بڑے ہو گئے تھے ۔ نومی تو خاصہ سمجھدار ہو گیا تھا ۔ ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے دیکھتا تو سہم جاتا ۔ زور زور سے چلانے لگتا ۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اتنا چیختا کہ ماں باپ کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ۔ ثمرانہ بھی یہی کرتی ۔ عثمان ثمرانہ کو گود میں اُٹھا لیتا عمرانہ نومی کو پیار کرنے لگتی ۔

" یہ بچے ہی تو پاؤں کی زنجیر ہیں ....." دونوں اکثر کہتے " ورنہ زندگی کی گاڑی کب کی پٹڑی سے اُتر گئی ہوتی "

نومی چھ سال کا تھا جب عثمان اور عمرانہ میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی ۔

" میں ایک دن نہیں رہوں گی یہاں ..... جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا گھر ....." عمرانہ نے چلاتے ہوئے کہا اور سوٹ کیس میں کپڑے بھر کر گھر سے نکلنے کو تیار ہو گئی ۔ دونوں بچوں کو بھی ساتھ لیا ۔

عثمان نے جھپٹ کر بچوں کو چھیننا چاہا ۔ عمرانہ نے شور مچا دیا ۔ بچے چیخ چیخ کر رونے لگے ۔ ہمسائے آ گئے ۔ دونوں کو بہت سمجھایا ..... لیکن سنی ایک نے بھی نہیں .....

" اچھا ہے سنبھالو انہیں ..... میں بچوں کے بغیر بھی رہ لوں گی ....." عمرانہ بچے چھوڑ کر ماں کے گھر آ گئی ۔

لیکن بچوں کے بغیر تو وہ ایک پل بھی نہ جی سکتی تھی ۔ جان چھڑکتی تھی دونوں پر ۔ ماں کے گھر آ تو گئی لیکن ساری رات روتی رہی ..... ادھر بچوں نے تالو سے زبان نہ لگائی ساری رات عثمان انہیں پیار کرتا رہا سمجھاتا بجھاتا رہا لیکن بچے ممی ممی پکارتے رہے ۔ ثمرانہ کو تو پھونک کر بخار چڑھا ..... مجبور ہو کر دوسرے ہی دن اس نے ثمرانہ کو عمرانہ کے پاس بھجوا دیا ۔ اب نومی اکیلا رہ گیا ..... ماں کے ساتھ بہن کی یاد بھی شدت سے آتی ۔ سارا دن رو رو کر بُرا حال کر لیتا عمرانہ نومی کے بغیر پریشان رہتی ماں باپ بھائی بھابیاں کوئی بھی اس کے اس طرح گھر چھوڑ آنے سے خوش نہیں تھے ۔ عمرانہ اپنے آپ کو یہاں اجنبی اجنبی محسوس کرتی ..... اسی لیے ایک ہفتے

کے بعد ہی جب اسے نومی کے متعلق ہمسائی نے خبر دی کہ وہ ہر وقت روتا رہتا ہے تو وہ کھنچی چلی آئی ۔ عثمان اسے دیکھ کر حیران رہ گیا ۔

وہ بچے سے لپٹ گئی ۔ ثمرانہ پپا کے بغیر اُداس تھی وہ باپ کے بازوؤں کی زنجیر ہیں .....

یہ نہ ہوتے تو وہ یہاں تھوکتی بھی نہیں ....." عمرانہ نے غصے سے کہا ۔

" میں بھی ان بچوں کی خاطر تمہیں برداشت کر رہا ہوں یہ نہ ہوں تو کھڑے کھڑے تم سے چھٹکارا پا لوں ۔"

عثمان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ...." یہی پاؤں کی زنجیر ہیں ..... ان کی وجہ سے بندھا ہوں تم سے ..... یہ نہ ہوتے تو اس عذاب سے دوچار نہ رہتا ....."

صلح صفائی ہوئی ...... اس دفعہ عثمان نے تہیہ کیا کہ بچوں کی خاطر وہ درگزر کیا کرے گا یہی عہد عمرانہ نے بھی کیا ۔ چند ماہ اسی پر کاربند بھی رہے ۔ بچے ہمکتے دمکتے رہے ۔ چہکتے مہکتے پھرے لیکن ایک دن معمولی سی بات پر جھڑپ ہو گئی ۔ عثمان نے زوردار تھپڑ بھی عمرانہ کے منہ پر جڑ دیا جواباً عمرانہ نے ہاتھ میں پکڑا گلاس اس پر دے مارا ..... بچے سہم کر کمرے میں پردوں کے پیچھے چھپ گئے ...... آج بھی زوردار لڑائی کی تان اسی بات پر ٹوٹی

" بچے ہی پاؤں کی زنجیر ہیں ....."

" یہ نہ ہوں تو ایک منٹ یہاں نہ رکوں "

عثمان بک بک کرتا باہر چلا گیا ۔ عمرانہ غصے سے پھنکارتی بک بک کرتی رہی ۔

دونوں کو بچوں کا خیال نہیں آیا کہ وہ کیا سوچتے ہوں گے ۔ کیا سمجھتے ہوں گے ۔ یوں ہی دن گزرتے چلے گئے ۔ ماں باپ کا وطیرہ وہی رہا ۔ اور بچوں کے ذہن میں گرہیں بڑھتی گئیں نومی خاصا سیانا ہو چکا تھا ۔ ثمرانہ بھی جھگڑے اور صلح کے اثرات قبول کر رہی تھی ..... دونوں بہن بھائی جب ممی پپا کی باتیں کرتے تو ایک بات ان کی سمجھ میں نہ آتی .....

ہم تو بچے ہیں..... زنجیر تو نہیں ہیں..... نومی کہتا

"ہاں..... لیکن ممی پپا کہتے ہیں ہم ان کے پاؤں کی زنجیر ہیں..... ثمرانہ جواب دیتی۔

"ویسے بھی تو کہتے ہیں کہ ہم دونوں نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

"ہم نہ ہوتے نا..... تو ممی یہاں سے چلی جاتی"

"کہاں"

"کسی اچھی جگہ"

"یہ اچھی جگہ نہیں ہے"

"یہاں پپا ممی کو مارتے ہیں لڑائی کرتے ہیں....."

"ممی بھی تو لڑتی ہیں۔ پپا کو وہ بھی تو مارتی ہیں"

"ہم نہ ہوتے تو اچھا تھا....."

"اب سوچنا چاہیے ہمیں....."

"کیا؟"

"ہم دونوں کہیں چلے نہ جائیں....."

"کہاں جائیں گے.....؟"

"پتہ نہیں....."

دونوں بہن بھائی اکثر ایسی ایسی باتیں کرتے۔ سوچیں ان کے ذہن کو الجھائے رکھتیں۔

ممی اور پپا کا جب موڈ ٹھیک ہوتا تو وہ دونوں سے خوب پیار کرتے۔ بازار لے جاتے، کھلونے اور ٹافیاں دلواتے۔ بچوں کا ذہنی الجھاؤ اور بڑھ جاتا..... یہ الجھاؤ بڑھتا ہی گیا۔

اور ابھی پچھلے ہفتے جو ہنگامہ ہوا..... نومی نے ممی سے پوچھا "ممی..... آپ لڑتی ہیں پپا سے؟"

"وہ لڑتے ہیں مجھ سے..... تم دونوں کی وجہ سے میں تو جھگڑا نہیں کرتی..... نہیں کرنا چاہتی

..... لیکن....."

"ہماری وجہ سے کیوں؟"

"اس لیے کہ تم پاؤں کی زنجیر ہو..... ہم دونوں تمہاری وجہ سے الگ نہیں ہو سکتے۔ باندھ رکھا ہے تم دونوں نے ہمیں"

"ہم نہ ہوں تو آپ الگ ہو جائیں"

"بالکل..... ایک دن بھی اس گھر میں نہ رہوں..... چلی جاؤں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر.....

"کہاں؟"

جہاں میری مرضی..... خوش تو رہوں گی نا....."

نومی چند لمحے چپ رہا پھر بولا "ممی پاؤں کی زنجیر کیوں کہتی ہیں ہمیں....."

"زنجیر تو ہو باندھ رکھا ہے ہمیں..... کہا نا تم نہ ہوتے تو میں آزاد ہو جاتی اس قید سے....."

"پپا بھی یہی کہتے ہیں....."

"عمرانہ پھنکاری" تیرے پپا نے تو زندگی تباہ کر دی میری۔ خدا جانتا ہے تم دونوں کی وجہ سے میں یہاں رہ رہی ہوں اور اس بد دماغ آدمی کے ساتھ گزارہ کر رہی ہوں....."

"ہم نہ ہوتے تو....."

"تو خوش رہتی میں....."

نومی چپ ہو گیا سارا دن سوچتا رہا۔ ساری رات سوچتا رہا۔ پھر اگلے دن اس نے پپا سے بھی ایسے ہی سوال کیے ان کا جواب بھی یہی تھا.....

نومی اُلجھ گیا۔ اپنے آپ سے۔ ساری سوچوں کا نتیجہ اس کے چھوٹے دماغ نے یہی نکالا کہ ممی پپا محض ان دونوں کی وجہ سے آپس میں بندھے ہیں وہ دونوں نہ ہوتے تو ان کی

زندگی بہت خوشگوار ہوتی۔

اس نے ثمرانہ سے بھی یہی کہا۔ ثمرانہ ہم دونوں نہ ہوتے تو ممی پپا بہت خوش رہتے لڑتے بھی نہیں الگ الگ ہوجاتے۔

"اچھا"

"ہاں"

پھر ہم کیا کریں؟"

"ہم دونوں کہیں چلے جاتے ہیں"

کہاں جائیں گے؟

میں سوچوں گا!

"ضرور سوچنا"

نومی سوچتا رہا۔ اس کا دماغ الجھتا گیا۔ کئی ترکیبیں سوچیں کئی خیال ننھے سے دماغ میں آئے۔ دادی دادا کے پاس چلے جانے کا سوچا۔ نانی نانا کے ہاں جانے کا خیال آیا۔ لیکن دونوں جگہ ماں باپ پہنچ سکتے تھے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔

ثمر..... کل شام اس نے بہن سے کہا.....

"کیا ہے"

ہم دونوں مر نہ جائیں۔

"مرجائیں"

ہاں اللہ میاں کے پاس چلے جائیں۔ جیسے میرے دوست شانو کا چھوٹا بھائی مر کر اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے۔

"لیکن مر کیسے جائیں؟

یہ مسئلہ سوچنے کا تھا لیکن نومی نے جلد ہی حل کرلیا ممی کے سرہانے بھی اور پپا کے سرہانے

بھی خواب آور گولیوں کی شیشیاں رکھی ہوتی ہیں ایک دن نومی نے گولیاں نکالی تھیں تو ممی نے ڈانٹا تھا۔ پھر سمجھایا تھا یہ گولیاں کھانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ نومی نے جھٹ سے کہا تھا آپ اور پپا تو روز رات کو کھا کر سوتے ہیں.....

ایک دو گولی کھانے سے نیند آتی ہے زیادہ کھالیں تو بندہ مرجاتا ہے۔ خبردار آئندہ ان گولیوں کو نہیں چھیڑنا....."

نومی کو ان گولیوں کا خیال آیا۔ اور مرجانے کا مسئلہ حل ہوگیا۔

رات عمرانہ اور عثمان میں پھر طوفانی لڑائی ہوئی تھی۔ عثمان نے اپنی اماں کے ہاں دیر لگا دی تھی اور عمرانہ نے سہیلیوں کو جوڈنر دیا تھا۔ دونوں ہی غصے میں آگئے تھے۔

آج بھی بار بار وہی جملے دہرائے گئے تھے۔

"بچے نہ ہوتے تو دیکھتی..... ایک پل نہ رہتی یہاں..... ہر وقت کی بے عزتی کروانے کو....."

یہی تو پاؤں کی زنجیر ہیں..... جو تمہیں گھر رکھنے پر مجبور ہوں..... یہ زنجیر نہ ہوتی تو سمجھ لیتا تم سے۔

نومی اور ثمرانہ بستروں میں دبکے سن رہے تھے۔ پپا نے شاید آج پھر ممی کو مارا تھا ممی نے بھی جواباً کوئی چیز پپا پر پھینکی تھی۔ ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ دونوں کھانے کی میز پر ہی معرکہ مار رہے تھے۔

نومی جلدی سے اٹھا بیڈروم میں گھسا دونوں خواب آور گولیوں کی بھری شیشیاں چپکے سے اٹھا لایا۔ ایک ثمرانہ کو دی دوسری خود لے لی۔ دونوں نے ساری ساری گولیاں اندر انڈیل لیں۔

"اب ممی پپا خوش رہا کریں گے نومی..... ثمرانہ بستر میں اطمینان سے لیٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... دونوں الگ الگ رہا کریں گے۔ لڑائی نہیں ہوا کرے گی ایک دوسرے کو ماریں

گے بھی نہیں ....“

”پپا ممی کو مارتے ہیں تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔“

”ممی پپا کو گالیاں بکتی ہے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر مارتی ہے تو بیچارے پپا پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔“

دونوں چند لمحے باتیں کرتے رہے پھر نومی نے کالی پنسل لی اور الٹی سیدھی تحریر لکھ کر کاپی سرہانے رکھ دی خود بہن کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ال لیں۔ ثمرانہ ڈرنے لگی تھی۔ ڈر نومی بھی رہا تھا لیکن بہن کو تسلّی دے رہا تھا۔ تسلی دیتے دیتے س کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ثمرانہ کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں کبھی نہ کُھلنے کے لیے۔

کاپی دونوں کے سرہانے پڑی تھی۔ جس پر نومی نے لکھا تھا۔ ممّی پپا آج ہم مر جائیں گے نب تو آپ دونوں خوش ہوں گے۔ لڑائی بھی نہیں ہو گی۔ پپا آپ کو ماریں گے بھی نہیں۔ ممی آپ لو گالیاں بھی نہیں دے گی۔ لڑائی ختم ہو جائے گی۔ ہم آپ دونوں کے پاؤں کی زنجیر تھے نا....“ ب خوش ہو جائیں صبح تک ہم مر جائیں گے.... نومی.....ثمرانہ“

نقب

ماسی نعمتے نے جب برقعہ اتارنے سے پہلے ہی ہنس کر رابعہ سے کہا ”لا منہ میٹھا کرا میرا ....“ تو رابعہ خوشی سے گڑبڑا سی گئی......

”کیا واقعی ماسی.....“ اس نے صحن میں پڑی چارپائی گھسیٹ کر چھاؤں میں کرتے ہوئے کہا۔

”تو اور.....“ ماسی نعمتے نے اپنا سفید برقعہ جس کی سفیدی برائے نام ہی تھی اتار کر چارپائی کی ادوائن پر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”تجھے قسم ہے سچ سچ کہو.....“ رابعہ نے معمر ماسی کو کندھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”اے بی بی میں جھوٹ کیوں بولوں گی تیری شبانہ بھا گئی ہے ان کے من کو.....بس اب رشتہ ہوا ہی سمجھ.....“

”یا اللہ تیرا شکر ہے“ رابعہ نے آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر کہا اور پھر ماسی کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”جاپانی جوڑا لوں گی“ ماسی نے باچھیں پھیلا دیں۔

”دوں گی ضرور دوں گی.....خیر سے رشتہ ہو جائے.....“

”بس ان کی طرف سے تو ہاں ہی سمجھ....“

”پکی بات ہے نا.....“

”بالکل پکی..... ہاں لڑکے کے متعلق تم اپنی تسلی کر لو..... بی بی میں رشتے کرواتی ہوں تو سچے اور کھرے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتی..... کل کلاں کو جو بات سامنے آنی ہے آج ہی آجائے تو اچھا ہے.....“

”ہونا ہی چاہیے..... زندگی بھر کے معاملے ہوتے ہیں ماسی.....“

”بالکل..... ان لوگوں کے متعلق میں نے جو کچھ بتایا ہے ایک رائی بھر بھی فرق نکلا تو جو چور کی سزا وہ میری سزا..... نہایت شریف لوگ ہیں کنبہ بھی اتنا بڑا نہیں دو بیٹے دو بیٹیاں باپ اپنا کماتا ہے بیٹوں پر بوجھ نہیں بڑی بیٹی کی شادی کر دی ہے چھوٹی کا رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں..... پھر لڑکا اپنی نوکری پر ہے جہاں جائے گا بیوی کو ساتھ رکھے گا.....“

”ہوں“

”یہ بات اس کی امی نے کہی ہے وہ کہتی ہے شادی کرنی ہے ہم نے اس کے بعد اپنا اپنا بوجھ اُٹھائیں سب..... معقول تنخواہ ہے گھر بھی ملتا ہے کمائیں کھائیں عیش کریں“

”ماسی یہ رشتہ ہو گیا نا تو ساری عمر خدا کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تیرا شکریہ بھی ادا کرتی رہوں گی.....“

”پھر وہی رشتہ ہو گیا تو..... اے بیٹی میں کہتی ہوں رشتہ ہوا سمجھ بات صرف تم لوگوں کی ہے لڑکے کے متعلق پوری تسلی کر لو.....“

”لڑکا کراچی میں ہے“

”ہاں“

”کراچی!“

”کراچی ہی ہے کوئی لندن امریکہ نہیں..... دو دن میں پتہ کیا جا سکتا ہے بی بی اپنی پوری تسلی کر لو..... میں تو کھری بات کرتی ہوں تمہیں بھی یہی کہتی ہوں لڑکے کی اماں سے بھی یہی کہا ہے انہوں نے تو شاید پوری تسلی کر لی ہے جبھی تو کہہ دیا ہے کہ رشتہ انہیں منظور ہے.....“

رابعہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا بات ہے“

”کچھ نہیں سوچ رہی تھی کراچی میں ہے لڑکا کسی کے ذریعے ہی اس کے کردار کا پتہ کرایا جا سکتا ہے نا..... خود تو جانے سے رہے“

”بی بی اب یہ دردسری تمہاری ہے..... تسلی ہو جائے تو مجھے بتا دینا کام منٹوں میں ہو جائے گا..... چل اٹھ اب ذرا گرم گرم چائے تو پلا دے.....“

”ابھی لائی.....“ رابعہ اُٹھ کر سامنے ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔

شبانہ کا رشتہ اک مسئلہ بنا ہوا تھا شکل و صورت حسین نہ سہی اچھی خاصی تھی ایف اے پاس تھی بی اے کرنا چاہتی تھی لیکن رابعہ اور خادم علی نے داخلہ نہیں دلوایا ان کی اپنی ہی سوچ تھی شاید کسی حد تک صحیح بھی تھی۔

رابعہ کہتی تھی ”لڑکی نے بی اے کر لیا تو ایم اے پاس لڑکا ڈھونڈنا پڑے گا..... اپنے ارد گرد تو جتنے لڑکے ہیں میٹرک ایف اے سے آگے نہیں بڑھے کہاں سے ڈھونڈیں گے ایسا رشتہ ..... بی اے کر کے لڑکی کا دماغ اونچا ہو جاتا ہے..... بس ایف اے تک ہی ٹھیک ہے تعلیم برابر کا لڑکا ملا تو ایک دو تین کر دیں گے صرف یہی تو نہیں تین اور بھی ہیں پھر ماشاء اللہ لڑکے بھی ہیں تعلیم ان کے لیے ضروری ہے ان کا سوچیں کہ اسے بی اے کروائیں.....“

دو سال شبانہ گھر بے کار بیٹھی رہی تھی رابعہ رشتے کی آس میں بیٹی کو گھریلو کاموں میں ماہر کر رہی تھی دو تین جگہ بات چلی بھی..... لیکن معاملہ نبھا نہیں.....

شبانہ نے اب ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت کر لی تھی گھر بیٹھ بیٹھ کر تو اکتا گئی تھی وہی معمول کے کام..... وہی رشتوں کے لیے والدین کی دوڑ دھوپ وہی امید و بیم کا چکر بات بنتے بنتے رہ جاتی مایوسی اور افسردگی اپنا تسلّط چپکے چپکے جمائے جا رہی تھی اس کی عمر ابھی بائیس سال

ہی تھی لیکن ان حالات نے چہرے کی ساری شگفتگی چھین لی تھی نا امیدی دھول بن کر اس شگفتگی پر چھا رہی تھی وہ اپنی عمر سے چند سال بڑی ہی لگنے لگی تھی۔

اسی لیے اس نے سکول میں ملازمت کر لی تھی درمیانے طبقے کی آن آڑے آئی تھی ابو نے بُرا منایا تھا "بیٹی ابھی میں اتنا کما لیتا ہوں کہ تم سب آرام سے زندگی گزار سکو....."

ماں نے بھی کہا تھا "تمہیں اس لیے تو نہیں پڑھایا تھا کہ نوکری کروانی تھی....."

لیکن شبانہ نے مخالفت کے باوجود اپنا ارادہ ترک نہیں کیا تھا گو تنخواہ معمولی تھی پھر بھی وقت گزاری کا اچھا ذریعہ تھا تنخواہ سے وہ اپنا ذاتی خرچ چلا سکتی تھی نئے نئے کپڑوں اور جوتوں کا ہر جوان لڑکی کی طرح اسے بھی تو شوق تھا.....

وہ نوکری سے خوش اور مطمئن تھی.....شادی کا خیال اس نے دل سے کسی حد تک نکال ہی دیا تھا مایوسی نے اس کے اندر نا اُمیدی کے بیج بو دیئے تھے اسے یقین ہو گیا تھا کہ رشتوں کی کسوٹی پر وہ کبھی پوری نہیں اُتر سکے گی.....کبھی اس کی معمولی شکل و صورت حارج ہو گئی.....کبھی بڑھتی عمر اور کبھی والدین کے مالی حالات......

لیکن

اس کے باوجود رابعہ نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا.....ہر ملنے والی سے کہتی "کوئی اچھا رشتہ ہو تو شبانہ کے لیے کوشش کرنا....."

"کیوں نہیں ضرور کریں گے کوشش ....."

ہر ایک کا یہی جواب ہوتا.....لیکن اوّل تو کوئی کوشش کرتا ہی نہیں اور اگر کرتا بھی تو بار آور نہ ہوتی ماسی نعمتے کا تعارف جمیلہ کی بیٹی کی شادی پر ہوا تھا نعمتے ہی نے اس کی بیٹی کا اتنا اچھا رشتہ کروایا تھا اس نے رابعہ سے کہا تھا۔

"ماسی نعمتے کے پاس بڑے اچھے اچھے رشتے ہوتے ہیں تم بھی اس سے کہو ضرور کروا دے شبانہ کا رشتہ.....پیسے لیتی ہے لیکن رشتہ کام کا کرواتی ہے آج تک اس نے جتنے نصیبے ملائے

ہیں سب کے سب بہت اچھے ہیں.....خوش باش ہیں سب"

رابعہ نے نعمتے کو گھر آنے کی دعوت دی.....ادھیڑ عمر کی یہ عورت واقعی چلتا پھرتا میرج بیورو تھی اس نے ایک ہی سانس میں پندرہ سولہ رشتے گنوا دیئے.....جو پچھلے ایک سال میں کروا چکی تھی۔

"تمہیں کیسا رشتہ چاہیے" اس نے رابعہ سے پوچھا۔

"بس ہماری طرح ہی کا ہو لڑکا شریف ہو.....تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہو.....دولت مند تو ہم ہیں نہیں.....جو دولت مندوں سے ماتھا لگائیں اپنی طرح ہی کے سفید پوش لوگ ہونے چاہئیں۔

"ہوں"

"جہیز وہیز کے لالچی نہیں چلیں گے ماسی نعمتے....."

"بالکل ٹھیک....."

نعمتے کچھ دیر باتیں کرتی رہی رابعہ نے اسے چائے پلائی سموسے اور برفی کے ساتھ جاتے جاتے بیس روپے بھی دیئے" ماسی یہ کرایہ وغیرہ.....رشتہ لاؤ گی تو پھر....."

"کوئی بات نہیں.....وہ تو لیتی ہی رہوں گی....."

ماسی نعمتے نے شبانہ کو بھی دیکھا خوب ناقدانہ انداز میں شبانہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی چپ رہی.....

نعمتے اگلے دن ہی رشتہ لے کر آگئی.....لڑکے کی ماں اور بڑی بہن آئیں یہ بھی متوسط طبقے کے لوگ تھے ساڑھے سات مرلے کا خاصا کشادہ مکان تھا سفید پوشی کا بھرم خوب رکھا ہوا تھا.....لڑکا ایک غیر ملکی بنک میں ملازم تھا معقول تنخواہ تھی ان دنوں کراچی میں تھا مستقبل قریب میں بیرون ملک اسی بنک کی کسی شاخ میں تبدیلی ہونے کا بھی امکان تھا۔

رابعہ بڑے تپاک سے ملی خوب آؤ بھگت کی اتنا اچھا رشتہ ہو جانے کی توقع تو بہت کم تھی..... پھر بھی..... کوشش یہی تھی کہ لڑکے والے اچھا تاثر ہی لیں۔

شبانہ بھی سکول سے آگئی رابعہ نے اسے دیکھتے ہی راز داری سے کہا "شبانہ کچھ لوگ آئے ہیں ماسی نعمتے لائی ہے تم جلدی سے کپڑے بدل کر آجاؤ..... ذرا..... میرا مطلب ہے ذرا تھوڑا سا منہ جیبت سنوار لینا..... رشتہ بہت اچھا ہے....."

شبانہ نے منہ بنایا..... پھر لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی" ہونا ہوانا ہے نہیں آپ تو خواہ مخواہ امیدیں باندھ لیتی ہیں امی....."

"اے چپ رہ..... منہ سے کوئی اچھی بات بھی کبھی نکال لیا کر ایسی کونسی عمر بیت گئی ہے جو مایوسی کی باتیں کرتی ہے" رابعہ کو بھی شبانہ کی بات بُری لگی تھی بعض اوقات تو جی جلانے والی باتیں کر دیتی تھی وہ.....

شبانہ نے نہ منہ دھویا نہ ہاتھ..... نہ ہی کپڑے بدلے..... جس طرح سکول سے آئی تھی اسی طرح مہمان کے سامنے چلی آئی۔

رابعہ غصے سے اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

پسند کا شاید اپنا ہی پیمانہ ہوتا ہے شبانہ کی جانے کون سی ادا انہیں بھا گئی تھی انہوں نے اسے بیٹے کے لیے پسند کر لیا تھا..... اسی لیے تو آج ماسی نعمتے خوشی خوشی ان کا عندیہ رابعہ کو بتانے آ گئی تھی.....

رابعہ کی خوشی دیدنی تھی..... اس رات اس نے خادم علی سے بات کی" اللہ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا لیکن ماسی نعمتے کہتی ہے کہ انہیں سب کچھ پسند ہے..... شبانہ انہیں بہت اچھی لگی ہے....."

خادم علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی خوش ہو کر بولے" آخر کمی بھی کس چیز کی ہے ہماری بیٹی میں..... پڑھی لکھی..... گھریلو کاموں میں ماہر اور....."

"بس رہنے دو....." رابعہ جلدی سے بولی" خدا کا شکر ادا کرو کہ انہیں رشتہ پسند آگیا....."

"تو پھر اللہ کا نام لے کر ہاں کر دو....."

"لڑکے کے متعلق تو پتہ کروا لو..... ماسی نعمتے نے کہا ہے خود تسلی کر لو یہ ذمہ داری اس کی نہیں....."

"لڑکا کراچی میں ہے"

"ہاں..... امریکن بنک میں....."

"بڑی اچھی پوسٹ ہے"

"سنا ہے..... باہر بھی جانے والا ہے اسی بنک کی کسی برانچ میں"

"پھر تو سونے پر سہاگہ....."

"بس تم کسی طرح لڑکے کے متعلق تسلی کر والو....."

خادم علی چند لمحے سر ہلاتے رہے پھر بولے" اپنے بھائی صاحب کو لکھ دیتے ہیں....."

"ہونہ....." رابعہ نے سر کو جھٹکا دیا....." وہ کر چکے پتہ....."

"بھئی تفصیل سے خط لکھ دیتا ہوں پتہ ہی کروانا ہے کسی کو بھیج کر ہی پوچھ گچھ کروا سکتے ہیں کوئی ایسا بڑا کام تو ہے نہیں کر دیں گے....."

"پہلے کبھی کیا ہے کوئی کام اے میں کہتی ہوں کسی دوست یار کو خط لکھ بھیجو....."

"نہیں رابعہ..... یہ کام کسی اور کے کرنے سے تسلی نہیں ہو گی بھائی صاحب جہاندیدہ آدمی ہیں ذمہ داری سے پتہ کروائیں گے....."

رابعہ نے ناک منہ چڑھایا" تمہیں ان سے امید ہو گی مجھے تو نہیں..... بھائی صاحب تو خیر بھابی صاحبہ نے مت کرنے دیا پتہ؟"

"چلو لکھنے تو دو..... قیاس آرائیاں کرنے کی ضرورت نہیں....."

"تجربے کی بنا پر قیاس آرائیاں کر رہی ہوں کبھی کام آئے ہمارے وہ لوگ؟ کبھی ضرورت پوری

کی ہماری ؟ کبھی بھول کر یاد کیا ہمیں ..... جھوٹی دعوت بھی نہیں دی کبھی کراچی آنے کی غریب غربے تو نہیں پیسے والے ہیں.....''

''اللہ کی بندی کیا کھالے بیٹھی ہے تو..... ساری باتیں سچ سہی لیکن اب بتا کیا کرنا ہے مجھے تو تسلی صرف بھائی صاحب ہی کی تحقیق سے ہو سکتی ہے بیٹی کا معاملہ ہے جیسی ہماری ویسی ان کی اس کام میں تو نہ نہیں کریں گے..... لکھ دینے میں کوئی ہرج تو نہیں.....''

''مرضی ہے تمہاری اتنا اعتماد ہے بھائی پر تو لکھ دیکھو.....''

''تم نعمتے سے کہہ دینا پانچ دس دن انتظار کرے ہمیں بھائی صاحب نے پوری تسلی دے دی تو آنکھیں بند کر کے ہاں کر دیں گے.....''

رابعہ اور خادم علی اس رات دیر تک باتیں کرتے رہے بیٹی کا نصیبہ جاگ اُٹھنے کی خوشی میں سونا تو نہیں جاگنا ہی تھا.....

رابعہ نے اب تک جو کچھ جہیز کی صورت میں بنایا تھا خادم علی کو بتانے لگی یوں لگتا تھا سارے حساب و کتاب وہ آج رات ہی کر ڈالے گی۔

''بیس پچیس جوڑے بنا رکھے ہیں سب کے سب جاپانی کپڑے کے ہیں..... مردانہ سوٹ بھی دو ہیں..... پتلونوں کا کپڑا بھی پڑا ہے..... دو ساٹن اور دو شنیل کی رضائیاں بھی ہیں سلائی کڑھائی کی چیزیں بھی بنا رکھی ہیں..... اے یاد آیا بڑی آپا جب پشاور گئی تھیں چینی کے برتن بھی منگوائے تھے.....''

اس نے خرید خرید کر رکھی ہوئی چیزیں گنوائیں خادم علی کچھ توجہ اور کچھ بے توجہی سے سنتے رہے وہ چند لمحے رکی پھر بولی۔

''لیکن..... یہ تو کچھ بھی نہیں جہیز..... تو.....''

''بن جائے گا خدا کوئی سبب بنا دے گا جیسے رشتے کا بنایا ہے رشتہ نبھانے کا بھی بنا دے گا.....''

''زیور تو ہے ہی نہیں وہی لے دے کے دس بارہ تولے اپنی شادی کا.....''

''رابعہ..... یہ حساب کتاب کرنے کا وقت ہے ؟ فی الحال تو خط لکھنا ہے..... لڑکے کے متعلق پوری تسلی کرنا ضروری ہے.....''

''ہاں وہ تو ہے..... ماں اور بہن اتنی اچھی ہے وہ بھی ویسا ہی ہوگا.....''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا..... بہتر یہی ہے کہ ہم پوری طرح تسلی کر لیں.....''

طے پا گیا کہ کل خادم علی پوری تفصیل سے حاکم علی کو خط لکھ دیں گے درخواست کریں گے کہ پوری ذمہ داری سے لڑکے کا پتہ کروا کر جواب دیں۔

حاکم علی ایک عرصے سے کراچی میں رہ رہے تھے وہاں کاروبار شروع کیا تھا جو خاصہ پھیل چکا تھا ذاتی کوٹھی تھی..... گاڑی تھی..... بھرا پرا کنبہ تھا..... خوب عیش و آرام سے زندگی گزر رہی تھی دو بیٹے ننھے تین بیٹیاں تھیں..... بڑی نے اس سال بی اے کیا تھا دوسری ایف اے میں تھی تیسری نویں جماعت میں..... گھر میں خوشحالی تھی اس خوشحالی کا اثر ان کی شخصیتوں پر نمایاں تھا عام شکل و صورت کی تھیں لیکن سمارٹ اور چاق و چوبند تھیں اچھی اچھی وضع قطع کے لباس بڑے دیدہ زیب ہوتے تھے اور ان کی شخصیتوں کو نمایاں کرتے تھے۔

حاکم علی خط پڑھ رہے تھے کہ بیگم آ گئیں۔

''کس کا خط ہے،، ٹیلی فون کے ہوتے ہوئے اسے خط کا آنا کچھ عجیب سا لگا تھا۔

''خادم کا.....''

''خیریت..... کیسے یاد کیا، وہ تو برسوں.....''

حاکم علی نے جلدی سے بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''گلہ شکوہ نہیں کرنا..... ہر کوئی اپنے حال میں مست ہے نہ وہ کبھی ہمیں خط وغیرہ لکھتا ہے نہ ہی ہم نے کبھی زحمت کی ہے.....''

''خاص انہیں ملنے تو نہیں جاتیں خیر چھوڑو ان باتوں کو.....''

''کیا لکھا ہے.....''

”کوئی رشتہ آیا ہے شبانہ کے لیے لڑکا یہاں ہے اس کے چال چلن کا پتہ کروانا ہے خادم نے لکھا ہے اسے میرے پتہ کرنے ہی سے تسلّی ہو سکتی ہے.....“

”ضرورت آن پڑی نا ہماری بنا لیا بڑا بھائی“

”اوہو ساجدہ......“

”ہونہہ.....“

ساجدہ اٹھ کر چلی گئی اسے شبانہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ خادم علی سے اس لیے کوئی تفصیل پوچھی نہ کوئی اور بات کی......

حاکم علی نے خط تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اگلے دن لڑکے کے متعلق چھان بین کرنے کا ارادہ کر لیا اپنے دو ایک ملنے والوں سے انہوں نے ذکر کیا.... ان کی ڈیوٹی لگائی رپورٹ دوسرے دن ہی مل گئی لڑکا ہر لحاظ سے اچھا تھا صورت و شکل کردار و گفتار کی دونوں نے تسلّی دی۔

ان کی تسلّی مل گئی تو حاکم علی خود بنک جا پہنچے لڑکے سے خود ملاقات کی اشرف انہیں بہت ہی اچھا لگا....

اسی شام وہ گھر آئے تو ارادہ کیا کہ خادم علی کو خط لکھیں گے قلم کاغذ لے کر بیٹھے ہی تھے کہ ساجدہ آگئی.....

”ذرا میرے ساتھ چلئے“ اس نے کہا۔

”کہاں“

”بیگم نسیم ملک کے ہاں جانا ہے.....“

”تم جاؤ.....“

”آپ چھوڑ آئیں“

”کیوں گھر میں اور کوئی نہیں کیا؟“

”نہیں.....“

”انتظار کر لو..... اسد آنے ہی والا ہوگا“

”آپ تکلیف گوارہ نہیں فرمائیں گے“

”مجھے خط لکھنا ہے ذرا.....“

”کسے.....“

”خادم کو.....“

”اچھا جانچ پڑتال کر لی.....“

”ہاں بیگم...... بہت اچھا لڑکا ہے ہر ایک نے تعریف ہی کی ہے جاب اچھی ہے کیریر بننے کا گولڈن چانس ہے“

”واقعی؟“

”ہاں“

”ہائے ہائے اتنا اچھا رشتہ ملا ہے انہیں“

”قسمت کی بات ہے“

”اچھا اٹھو واپس آکر لکھ لینا خط..... پانچ منٹ کا تو راستہ ہے.....“

”اچھا بھئی اچھا“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے گاڑی پورچ ہی میں تھی ساجدہ کو لیا اور بیگم رحیم کے گھر کی راہ لی......

راستے میں مین مارکیٹ تھی..... ساجدہ نے حاکم سے کہا“ ذرا درزی کی دکان کے سامنے دو منٹ رکیے گا.....“

حاکم جیسے حکم کا پابند تھا..... گاڑی روک دی......

وہیں ان کی نظر اشرف پر پڑی جو سامنے والے سٹور سے باہر نکل رہا تھا وہ جلدی سے ساجدہ کا کندھا پکڑ کر بولے ”دیکھو..... دیکھو.....؟“

"کیا؟" ساجدہ نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"وہ وہ آف وائٹ سوٹ اور براؤن جیکٹ والا لڑکا ہے نا وہ جو سٹور سے نکل کر برآمدے میں آیا ہے.....؟"

"ہاں ہاں"

"یہ ہے اشرف..... خادم علی کا ہونے والا داماد.....؟"

ساجدہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی" اتنا خوبصورت اور ایسا سجیلا..... شبانہ کے لیے رشتہ آیا ہے اس کا"

"ہاں ہاں..... کہہ تو رہا ہوں"

ساجدہ نے آنکھیں مٹکائیں۔

"بہت اچھا رشتہ ہے....."

"واقعی..... لڑکا تو بڑا ہی ہینڈسم ہے"

"ملنسار ہے..... بڑا شائستہ ہے......"

پتہ نہیں ساجدہ نے چاہا یا نہیں..... حاکم علی گاڑی سے نکلے اور اشرف کے قریب آتے ہوئے بولے۔

"برخوردار....."

اشرف نے انہیں دیکھا پہچانتے ہی بڑی تعظیم اور مؤدبانہ انداز میں سلام کیا ساجدہ بھی گاڑی سے نکل آئی..... حاکم علی بولے" یہ ہماری بیگم ہیں....."

اس نے انہیں بھی اسی شائستگی سے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

"جیتے رہو" ساجدہ نے دعا دی۔

وہ سر جھکاتے ہوئے مسکرا دیا۔

ساجدہ بولی" ہم تمہارے لیے اجنبی ہیں....."

"خدا کرے گا جلد ہی رشتہ دار بھی بن جائیں گے" حاکم علی مسکرائے" یقیناً تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ میں تمہیں کیوں ملنے بنک آیا تھا۔

وہ قدرے شرمایا پھر ہولے سے بولا" جی مجھے پتہ چل گیا تھا....."

حاکم علی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے ساجدہ اس کا جائزہ ناقدانہ انداز میں لیتی رہی....

اشرف نے جانے کے لیے اجازت چاہی تو وہ بڑے رسان سے بولی" کسی دن ہمارے گھر آؤنا....."

حاکم علی ساجدہ کی بات اور رویے سے خوش ہو کر بولے" کسی دن کیا کل ہی آجاؤ رات کھانا ہمارے ساتھ کھانا....."

"بالکل بالکل....."

اشرف نے ملائمت سے انکار کیا تو ساجدہ سراپا اصرار بن گئی۔

اشرف کو حامی بھرنا پڑی وہ ان لوگوں کے خلوص اور پیار سے خاصا متاثر بھی ہوا اور

ساجدہ گاڑی میں آبیٹھی حاکم علی بھی آگئے..... بولے" درزی کے پاس نہیں گئیں"

وہ سوچتے ہوئے بولی" پھر آجاؤں گی..... اس وقت تو میں اشرف کے بارے میں سوچ رہی ہوں"

وہ ہنس کر بولے" بڑی فیاضی سے دعوت دے ڈالی..... خادم علی کے ہونے والے داماد کو....."

"ہوں....." وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی......

دوسری شب ساجدہ نے بڑی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا بڑی بیٹی عاصمہ کو اس نے اچھی طرح ڈریس اپ ہونے کی تاکید کی......

اشرف آگیا وہ بڑا وجیہ لگ رہا تھا...... ساجدہ اس پر جیسے مفتون تھی اس کی تینوں بیٹیوں دونوں بیٹوں اور حاکم علی کے ساتھ اشرف نے کھانا کھایا......

اشرف کچھ جھجک رہا تھا لیکن جب ادھر سے بے تکلفی برتی گئی تو وہ بھی کھل گیا......

عاصمہ سے تو خوب گپ شپ لگی.....

رات جب ساجدہ سب کاموں سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو حاکم علی نے ہنس کر کہا" اتنے التفات کس سلسلے میں کیے گئے بقول تمہارے غیروں کے رشتہ دار پر....؟"

ساجدہ مسکرائی پھر ان کے قریب بیٹھ گئی...... ہولے ہولے ان کے کان میں کچھ کہا تو وہ اچھل پڑے۔

"نہیں ساجدہ نہیں.....؟"

"نہیں کیوں نہیں اتنا اچھا لڑکا ہے مستقبل شاندار ہے اور پھر کونسا شبانہ کے ساتھ رشتہ طے ہو چکا ہے"

وہ سر نفی میں ہلاتے رہے..... ساجدہ تیزی سے بولی" عاصمہ نے بی اے کر لیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے اشرف نے اسے پسند بھی کیا ہے..... اس سے اچھا رشتہ ہمیں کہاں سے ملے گا.....؟"

"لیکن" وہ بولے

"لیکن ویکن کچھ نہیں..... اس نے جیسے حکم صادر کیا حاکم علی کچھ نہیں بولے۔

ساجدہ نے سب کچھ سوچ لیا..... پلان بنا لیا......

ادھر رابعہ اور خادم حاکم علی کے خط کے انتظار میں پریشان ہو رہے تھے.....

"کچھ تو لکھ دیتے..... چلو جواب ہی دے دیتے.....؟" رابعہ کہتی۔

"معلوم ہوتا ہے لڑکا اچھا نہیں ورنہ بھائی صاحب اتنی زحمت تو کر سکتے تھے۔"

"یہ بات بھی تھی تو لکھ دیا ہوتا ہم صبر شکر کر لیتے۔"

"ہاں اخلاقی فرض تو تھا ان کا.....؟"

لیکن اخلاقی فرض کیا ہوتا ہے؟ اس کا مفہوم جاننے کی بھی ساجدہ نے حاکم علی کو مہلت

نہ دی۔

اپنی بیٹی سے بھائی کی بیٹی کا مفاد زیادہ عزیز تو نہ تھا ساجدہ نے سمجھایا بجھایا نئی راہ دکھائی تو اس کے ہم خیال ہو گئے۔

ساجدہ نے چکر بھی تو خوب چلایا تھا..... اشرف پر التفات اور نوازشات کی اتنی بارش کی کہ وہ انہی لوگوں کا گرویدہ ہو گیا..... پھر عاصمہ جیسی لڑکی سے روابط بڑھانے کا موقع بھی تو ملا تھا۔

ساجدہ اس ہیرا پھیری سے مطمئن تھی۔

ایک دن جب اشرف نے قدرے جھجکتے ہوئے اس سے کہا" آنٹی..... میں ایک بات کہوں"

"ضرور کہو....."

"میرے والدین نے میرا رشتہ شاید لاہور میں آپ کے.....؟"

"ہاں..... لیکن تمہارا کیا خیال ہے.....؟"

"میں..... میں وہاں..... رشتہ نہیں کروں گا.....؟"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی "تو..... کہاں کرو گے"

"وہ بھی ہنس پڑا..... پھر آہستگی سے بولا" یہاں.....؟"

وہ خوشی سے جھوم اٹھی بولی" اپنے والدین کو بلا بھیجو..... ایک بھائی کی بیٹی نہ سہی دوسرے بھائی کی سہی کوئی فرق نہیں ٹھیک؟"

"ٹھیک....."

دونوں مسکرائے۔

پھر اشرف نے کھل کر گھر خط لکھ دیا اس نے بھی ساجدہ والی بات لکھی ایک بھائی کی بیٹی نہ سہی دوسرے کی سہی..... لیکن ساتھ یہ بھی لکھا کہ یہ گھرانہ اور لڑکی اسے پسند ہیں....

والدین آگئے انہوں نے کون سی پکی بات کر ڈالی تھی رشتے کی..... اس سے کہیں زیادہ مالدار گھرانہ مل رہا تھا اور کیا چاہیے تھا.....

اگلے ہفتے

جب خادم علی اور رابعہ سوچ رہے تھے کہ ماسی نعمتے کو بلا کر لڑکے والوں کو جواب دینے کی تاخیر کی معذرت کر بھیجیں۔

انہیں

کراچی سے اشرف اور عاصمہ کی منگنی کا دعوت نامہ ملا۔

جو بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔

دونوں کو یوں لگا...... جیسے کسی نے گھر میں نقب لگا دی ہے.....

شبانہ نے بھی دعوت نامہ دیکھا۔

وہ بڑے استہزائیہ انداز میں ماں باپ کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

منصوبہ

دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ اور پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ کئی محاذ تھے۔ جہاں اتحادی اور جرمنی کی فوجیں برسرِپیکار تھیں۔ آگ و خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی محاذوں پر فوجی کٹ رہے تھے۔ شہری آبادی بمباری سے مر رہی تھی۔ جنگ سے شہر محفوظ تھے نہ دیہات۔ سب جنگ کی ہولناکی کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے کچھ خوش قسمت دور افتادہ گاؤں تھے۔ جہاں بمباری کی وحشت ناکی تو نہیں تھی۔ لیکن جنگ کا اثر وہاں بھی تھا۔ جوان اور ادھیڑ عمر لوگ فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے تھے اور اب تو اتنے فوجی مر چکے تھے۔ کہ ان کی جگہ پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال کے نوعمر لڑکے بھی لیے جا رہے تھے۔ شہروں میں بھی یہی حال تھا گاؤں میں بھی۔

کچھ گاؤں تو ایسے تھے۔ جہاں اب صرف عورتیں معصوم بچے اور بیکار و بیزار بوڑھے ہی رہ گئے تھے عورتوں کے سر پر ہر طرح کی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ گھروں کی دیکھ بھال بچوں کی دیکھ بھال، فارموں اور کھیتوں کی دیکھ بھال سبھی کچھ انہیں کرنا پڑتا تھا۔

بمباری کی وجہ سے چیزوں کی ترسیل بہت متاثر ہوئی تھی۔ شہروں سے دیہاتوں اور دیہاتوں سے شہروں میں چیزیں لانے لے جانے کا سلسلہ اکثر ہی گڑبڑ رہتا۔ کبھی کبھی تو زندگی کی انتہائی ضرورتوں کے لیے بھی سوائے صبر کر لینے کے کوئی چارہ نہ رہتا۔ بہت پریشانی ہوتی۔ لیکن کیا کچھ بھی نہ جا سکتا۔ لوگوں کی کوشش ہوتی کہ بنیادی ضرورت کی چیزوں کو گھر میں جمع کر رکھیں۔

مسز مارٹینا ہمیفرے ایسے ہی اک دور افتادہ گاؤں میں رہتی تھی۔ ہمیفرے اتحادی فوجوں کے ساتھ کسی محاذ پر لڑ رہا تھا۔ مارٹینا اپنے دس اور بارہ سالہ بچیوں اور بوڑھے فالج زدہ سسر کے

ساتھ گاؤں میں رہ رہی تھی۔ ہمیفرے جب قریبی محاذوں پر تھا۔ تو کبھی ایک آدھ دن کے لیے جب اسے موقع ملتا آکر بیوی بچوں کو دیکھ جایا کرتا تھا۔ شہر سے کچھ چیزیں بھی لے آتا تھا۔ جو مارٹینا وقتاً فوقتاً اسے لکھتی رہتی تھی۔ بوڑھے سسر کی دوائیاں تو منگوانا وہ بھولتی ہی نہیں تھی۔

جب سے ہمیفرے دور چلا گیا تھا۔ مارٹینا کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس کا ذریعہ آمدنی کھیتی باڑی سے تھا۔ گاؤں میں ان کی کچھ زمین تھی۔ ہمیفرے اس زمین پر بہت زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ یہ اس کی آمدنی کا وسیلہ بھی تھا اور دل پسند مشغلہ بھی۔ وہ ان کھیتوں سے اتنی آمدنی ضرور حاصل کر لیا کرتا تھا۔ کہ گھر بار کے اخراجات سے بخوبی نپٹ کر وہ بچوں کی تعلیم کے مصارف بھی با آسانی برداشت کر لیتا اور سال میں دو دفعہ اپنے بیوی اور بچوں کے نئے کپڑے بھی بنوا لیتا۔ اپنے فالج زدہ باپ کے لیے وہیل چیئر بھی اس نے خرید لی تھی۔

لیکن جب بھرتی شروع ہوئی اور محب وطن لوگوں نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا شروع کیا۔ تو گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح ہمیفرے بھی بھرتی ہو گیا۔

جانے سے پہلے اس نے مارٹینا کو سب کچھ سمجھا دیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اس کے ذمہ ڈالی۔ باپ کو اس کے حوالے کیا اب یہ سب تم پر پڑے ہیں۔ اُمید ہے اک بہادر عورت کی طرح تم سب کی ذمہ داریاں خوبی سے نبھاؤ گی۔ مارٹینا گیلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی خدا کرے تم ٹھیک ٹھاک واپس آجاؤ۔ تمہاری عدم موجودگی میں میں یہ فرائض نبھانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔

ہمیفرے بیوی بچوں سے جدا ہو گیا۔ تھوڑی سی ٹریننگ کے بعد اسے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ اور پھر وہ اپنی پلٹن کے ساتھ کبھی کہیں اور کبھی کہیں جاتا رہا۔ بیوی بچوں کا اسے ہر

وقت دھیان رہتا تھا۔ اسی لیے وہ بڑی باقاعدگی سے خط لکھا کرتا اور ہر خط میں تاکید کرتا کہ مارٹینا بھی اسے اپنی ساری باتیں لکھ دیا کرے۔ جس جس چیز کی ضرورت ہوتی۔ جو جو چیز درکار ہوتی۔ مارٹینا اس کی ہدایت کے مطابق اسے تفصیل سے لکھ دیا کرتی تھی۔

یہ چیزیں ہمیفرے جب موقع ملتا خود لے کر آجاتا۔ خود نہ آسکتا تو ان علاقوں میں متعین فوجیوں سے رابطہ قائم کرتا اور پھر مارٹینا کی مطلوبہ چیزیں کسی نہ کسی کے ہاتھ بھجوانے کی کوشش کیا کرتا۔

مارٹینا کے دل میں ہمیفرے کی عزت وقدر پہلے ہی کم نہ تھی۔ اس کے اس احساس ذمہ داری نے تو اسے اس پر ہزار جان سے فریفتہ کر دیا تھا۔ ہمیفرے اس سے دور تھا۔ لیکن اسے یوں لگتا وہ اس کے قریب ہی ہے۔ اس کی ہر مشکل کے وقت ہر ضرورت کے وقت وہ اس تک پہنچ سکتا تھا وہ سیانی عورت تھی کوشش یہی کرتی۔ کہ ہمیفرے پر کم سے کم ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالے۔ اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ کوئی ایسی بات نہ لکھے۔ جو اس کے امکان سے باہر ہو۔ یا جسے پڑھ کر وہ پریشان ہو جائے۔

لیکن

اس دفعہ اک مجبوری آن پڑی۔

وہ کچھ بیمار سی رہنے لگی۔ بظاہر کوئی خاص بیماری نہ تھی۔ لیکن طبیعت گری گری اور نڈھال نڈھال رہنے لگی۔ شاید وہ اپنے جیون ساتھی کی وجہ سے پریشان رہنے لگی تھی۔ جنگ زوروں پر تھی۔ اور اس کی ہولناکی اور وحشت ناکی پھیل رہی تھی۔ انسان کا خون بے حد ارزاں ہو گیا تھا۔ اور آئے دن کسی نہ کسی کے مرنے کی خبر گاؤں میں پہنچ رہی تھی۔

ہمیفرے بخیر تھا۔ وہ اب بڑی ہی باقاعدگی سے گھر خط لکھتا تھا۔ ان دنوں ڈاک سنسر ہوتی تھی۔ بعض خط سنسر کی نذر بھی ہو جاتے تھے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر ہمیفرے ہفتے میں دو دو تین تین، خط ایک ہی مضمون کے لکھنے لگا تھا۔ مارٹینا کو بھی وہ روزانہ ہی خط

لکھنے کی تاکید کرتا۔

مارٹینا اس کی ہدایت اور تاکید پر عمل کرتی۔ اسے اپنی بچوں اور بوڑھے سُسر کی خیریت کے خط روز ہی لکھ دیتی۔

اس کی کوشش تو یہی ہوتی کہ ہمیفرے کو کم سے کم اپنی پریشانیوں اور مصائب کے متعلق لکھے۔ لیکن اس دفعہ اسے لکھنا ہی پڑا۔

وہ خود نڈھال سی رہتی تھی۔ اور کھیتوں میں بوائی کا وقت آرہا تھا۔ ان کھیتوں میں ہل چلانا اور بیج بونا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی، کہ وقت پر بوائی نہ ہوسکی، تو اس کے لیے بے شمار مسائل اور مصائب کھڑے ہو جائیں گے۔

اس نے کوشش کی تھی کہ گاؤں ہی سے کسی سے مدد لے۔ کوئی اس کے کھیتوں میں ہل چلا کر مٹی الٹ پلٹ کردے۔ پھر وہ بیج خود بھی بو سکتی تھی۔

اس نے اپنی پڑوسنوں سے مدد چاہی۔

وہ بھی اس کی طرح کی دل گرفتہ عورتیں تھیں۔ اپنی اپنی ذمہ داریوں سے نبرد آزمانہ ہو پاتی تھیں۔ وقت بھی نہ تھا ان کے پاس۔ کسی نے بھی نہ حامی بھری۔

"مسز ہمیفرے اگر بچی بیمار نہ ہوتی تو میں بخوشی تمہاری مدد کرتی۔"

"کئی دنوں سے میرے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن زخمی ہے معذرت خواہ ہوں۔"

"میری ساس ان دنوں میرے ہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ پرہیزی کھانا کھاتی ہے۔ مجھے اس کی وجہ سے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے کلینک میں کام کرنا ہوتا ہے۔ وقت نہیں میرے پاس۔"

"میں پولٹری فارم کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ نہ کروں تو پورے قصبے کو تکلیف ہوگی۔"

سب نے معقول وجہیں بتائی تھیں۔ مارٹینا کا ہاتھ کوئی بھی نہ بٹا سکتا تھا۔ سب کی بات صحیح بھی تھی۔ مردوں کے محاذوں پر چلے جانے کے بعد مارٹینا کی طرح گاؤں کی دوسری

عورتوں کی ذمہ داریاں بھی تو بہت بڑھ گئی تھیں۔

مارٹینا پریشان تھی۔

وہ سوچتی کہ کیا کرے۔ وقت پر کھیت تیار نہ ہوئے تو فصل نہیں بوئی جاسکے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا۔ تو اس کے اور اہل خانہ کے لیے ان گنت مسائل سر اُٹھالیں گے۔

اس کی بڑی بیٹی جولیا نے ماں کو پریشان دیکھا تو بولی ماما۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہم شہر میں کسی کو مدد کے لیے لکھیں۔

"نہیں جولیا۔ شہر کے لوگوں کے اپنے مسائل کم نہیں۔ ہماری مدد کو کون آسکتا ہے۔ پھر لیبر ملنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ہر صحت مند آدمی فوج میں ہے اور جارہا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں ماما"

"یہی سوچ تو مجھے پریشان کررہی ہے۔ کھیتوں کی مٹی کافی سخت ہوچکی ہے۔ جب تک اس میں نیچے تک ہل نہیں چلایا جائے گا۔ کوئی بیج نہیں بویا جاسکتا۔"

"ماما۔ میں آپ کی مدد کروں"

"اوہ جولیا۔ تم اتنا سخت کام نہیں کرسکتیں۔ میں خود بھی نہیں کرسکتی۔"

"تو سیزن ضائع جائے گا"

"کیا کروں۔ ہم اس پوزیشن میں بھی تو نہیں کہ بوائی نہ کی جائے۔ ہمارا انحصار ان کھیتوں پر ہی ہے۔ خصوصاً ان دنوں میں تو قصبے کی ضروریات بھی بہت حد تک ان کھیتوں سے پوری ہو رہی ہیں۔"

"یہ تو بڑی بُری بات ہے"

"ہاں۔ یہی تو پریشانی ہے جولیا"

"کاش گرینڈ فادر ٹھیک ہوتے"

"وہ تو خود بوجھ ہیں جولیا۔ وہیل چیئر کے بغیر تو وہ کمرے سے بھی نہیں نکل سکتے"

"پپا آجائیں تو"

"وہ کیسے آجائیں۔ فوجی محاذوں پر ہیں۔ اور یقیناً تمہارے پپا بھی فرنٹ لائن پر ہیں"

"جنگ کتنی بری چیز ہے ماما۔ مجھے پپا کی زندگی ہر وقت خطرے میں گھری لگتی ہے"

"تمہارے پپا ہی نہیں۔ بے شمار بچوں کے پپا اس وقت محاذوں پر وطن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ جنگ بے شک بُری چیز ہے جولیا۔ لیکن بعض اوقات امن کی خاطر جنگ ناگزیر ہوتی ہے"

"یہ ہماری پریشانی جنگ ہی کی وجہ سے ہے نا"

"ہے تو"

"آپ کیسے اس پر قابو پائیں گی"

"سوچ رہی ہوں۔ کوئی حل نہیں سوجھتا"

"ماما"

"ہاں"

"پاپا کو لکھ دیں۔ وہ بہت عقل مند ہیں۔ ضرور کوئی حل لکھ بھیجیں گے"

"ہاں وہ واقعی عقل مند ہیں۔ لیکن جس بات کا کوئی حل نہیں۔ وہ اس کو لکھنا پریشان کرنے کے برابر ہے جولیا"

"نہیں ماما۔ میرے پپا بہت بہادر ہیں۔ ان کی سوجھ بوجھ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ ہے نا"

ماٹینا نے سر اثبات میں ہلایا۔ اسے ہمیفرے کی یاد آرہی تھی۔ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"کاش تمہارے پاپا چند دنوں کے لیے آسکتے۔ کھیتوں میں ہل چلا کر دے جاتے۔ پھر انہیں ہموار کر کے بوائی کرنا میرے لیے زیادہ مشکل نہ تھا"

"آپ لکھیں تو پاپا کو شاید چھٹی مل جائے"

"مشکل ہے۔ جنگ کا زور ہے۔ فرنٹ لائن پر جو فوجی ہیں۔ انہیں چھٹی کیسے ملے گی"

"پھر بھی لکھیں تو سہی۔ مجھے یقین ہے پاپا ضرور ہمیں اس مشکل سے نکال لیں گے۔"

"اچھا"

"ہاں ماما۔ آپ آج ہی خط لکھیں"

"خط تو میں تقریباً ہر روز لکھتی ہوں۔ خط سنسر ہونے میں اور محاذ تک پہنچنے میں ادھر ادھر بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمہارے پاپا بھی اور میں بھی روز ہی خط لکھتے ہیں"

"چلیے اس بارے میں بھی دو چار خطوں میں لکھ دیں۔ کوئی نہ کوئی خط تو پاپا تک پہنچے گا ہی۔ مجھے یقین ہے کوئی حل وہ نکال ہی لیں گے"

"اچھی بات ہے میں لکھ دیتی ہوں"

"دو چار خطوں میں متواتر لکھتی رہیں"

"یہ بھی ٹھیک ہے"

مارٹینا نے جولیا کی بات سے اتفاق کیا۔ اس نے اسی دن ہمیفرے کو خط لکھا۔ انداز تسلی ہی کا تھا۔ لیکن اس نے اپنی مشکل بیان کر دی۔ اس نے لکھا۔

"میں سخت مشکل میں ہوں۔ کھیتوں میں ہل چلانا میرے بس میں نہیں۔ ان کی مٹی کافی سخت ہے اور یہ خاصہ محنت طلب کام ہے۔ جو مجھ سے نہیں ہو رہا۔ اس بات کی پریشانی بھی ہے۔ اگر وقت پر کھیتوں میں ہل چلا کر بوائی نہ کی تو بہت بُرا ہو گا۔ ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کاش تم چند دنوں کی چھٹی لے کر آسکتے۔ چھٹی تو ملنا مشکل ہو گی۔ یہ میں جانتی ہوں۔ تمہیں شاید میں اپنا یہ مسئلہ بھی نہ لکھتی۔ لیکن کیا کروں۔ میری سمجھ میں کوئی حل نہیں آتا۔ گاؤں میں بھی کوئی ایسا نہیں جو میری مدد کر سکے۔ جولیا بھی ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی کہ کھیتوں میں ہم ماں بیٹی ہی مل کر ہل چلا سکیں"

اس نے خط لکھا۔ پوسٹ کرنے سے پہلے کافی سوچا۔

"کیا ہمیفرے کو چھٹی مل جائے گی؟"

"نہ ملی تو وہ کیا کرے گا یہ خط پڑھ کر پریشان ہی ہوگا"

"مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھا"

"لیکن مسئلہ کیسے حل ہو"

"شاید ہمیفرے کسی طرح آنے کی کوشش کر سکے"

"شاید آ ہی جائے"

مارٹینا نے پورا ایک دن تذبذب میں گزارا۔

پھر

خط پوسٹ کر ہی دیا۔

خط بھیجنے کے بعد اسے اپنے سر سے یوں لگا جیسے کافی بوجھ اُتر گیا ہو۔

اب اسے ہمیفرے کے خط کا انتظار تھا۔ جو وہ بڑی بے صبری سے کرنے لگی۔ یقیناً وہ کوئی تجویز ایسی ضرور پیش کرے گا۔ جس سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہمیفرے کو خط ملا۔

حسب معمول اس نے مارٹینا کا خط بے تابی سے کھولا۔

اس کے ساتھی ہمیشہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بھئی لگتا ہے تم اپنی بیوی سے ضرورت سے زیادہ ہی محبت کرتے ہو۔ اس کے خط پر یوں جھپٹتے ہو۔ جیسے یہ کاغذ کا بے جان ٹکڑا نہیں، پوری کی پوری بیوی تمہارے ہاتھ آن لگی ہے۔ روز ہی خط آتا ہے۔ اور تم روز ہی اسی بے صبری سے خط پڑھتے ہو۔

دوسرے ساتھی کہتے تو خود بھی روز ہی خط لکھتا ہے۔ ہمیفرے میں بڑی ہمت ہے۔ اس افراتفری میں بھی وہ اپنا کاغذ قلم سنبھالے رکھتا ہے۔ چند الفاظ بھی گھسیٹے لیکن گھسیٹتا ضرور ہے۔

"میں اپنی بیوی بچیوں اور اپنے باپ سے اتنی دور۔ ان خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے اپنے ان جان سے پیاروں کی بہت فکر رہتی ہے۔ جنگ میں زندگی کا کیا اعتبار۔ یہ دھڑکا جان لیوا ہوتا ہے" ہمیفرے اپنے ساتھیوں سے کہتا۔ تم لوگ بھی تو اپنے گھروں میں خط لکھتے ہو۔ تمہیں بھی تو گھروں سے خط آتے ہیں۔

"لیکن اتنے تواتر سے نہیں۔ سچ پوچھو تو ہمیں رشک آتا ہے تم پر"

آج بھی وہ ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ ہمیفرے نے مارٹینا کا خط کھولا۔ پہلی چند سطور پڑھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ گھر میں سب خیریت تھی۔ بچیاں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ اور باقاعدگی سے سکول جا رہی تھیں۔ باپ کو وقت پر خوراک اور دوائی مل رہی تھی۔ اور مارٹینا اس کی جدائی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

خط کا اگلا حصہ پڑھ کر اس کی پیشانی پر فکرمندی کے آثار نظر آئے۔

ایک ساتھی بولا "خیریت تو ہے"

"کوئی بُری خبر ہے کیا" دوسرے نے کہا۔

"کیا بتا سکتے ہو۔ کہ خط میں کیا لکھا ہے۔ جو تم فکرمند نظر آنے لگے ہو۔"

ہمیفرے ایک پتھر کے قریب اپنی رائفل ٹکا کر خود پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی فکرمندی کی وجہ ساتھیوں کو بتائی۔

"ہوں" سب نے صرف یہی کہا۔ کسی کے بس میں نہیں تھا کچھ بھی۔

"چھٹی ملنے کا سوال ہی نہیں" ہمیفرے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"قطعی نہیں" ایک ساتھی نے کہا۔

"میں نہ گیا تو کھیت ویران ہو جائیں گے اور سیزن گزارنا انتہائی مشکل ہوگا مارٹینا اور بچوں کے لیے"

"یہ تو ہے"

"کچھ کرنا چاہیئے۔"

"ہاں، سوچو۔ اگر بس میں ہے تو کچھ کرو۔"

ہمیفرے نے سوچا کہ وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر سے یہ بات کرے۔ اور جس طرح ممکن ہو چند دن کی چھٹی لے کر گھر ہو آئے۔

گو اسے چھٹی ملنے کی ایک فیصد بھی اُمید نہ تھی۔ پھر بھی وہ اپنا خط لے کر کمانڈنگ آفیسر کے پاس گیا۔ اپنے مسائل کا ذکر کیا۔

"تم ان مسائل سے بہت بڑے مسائل کے حل کے لیے اس محاذ پر آئے ہوئے ہمیفرے" آفیسر نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"لیکن سر" ہمیفرے نے بڑی منت کی، "صرف چند دنوں کی چھٹی چاہیے۔"

آفیسر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر سرد لہجے میں بولا "سوری مسٹر ہمیفرے۔ چھٹی نہیں مل سکتی۔ چند دنوں کی کیا چند گھنٹوں کی بھی نہیں۔ تم واپس جا سکتے ہو۔"

ہمیفرے کا چہرہ لٹک گیا۔ لیکن وہ آفیسر کی ذمہ داری سے بھی آگاہ تھا۔ اس لیے خاموشی سے اپنے کیمپ میں چلا آیا۔ سوچ سوچ کر بھی اسے اس مسئلے کو حل کرنے کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ تیسرے دن وہ دور تک مائنز مٹی میں دبا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹا۔ تو اسے مارٹینا کا دوسرا خط ملا۔

"کسی وقت بھی حملہ متوقع ہے،" اس کے ساتھی نے کہا۔ ہمیفرے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ معمول کی بے صبری اور بے تابی سے مارٹینا کا خط کھول کر پڑھنے لگا۔

خط میں تقریباً وہی کچھ لکھا تھا۔

"آج کیا لکھا ہے تمہاری بیوی نے،" ایک تھکے ہوئے فوجی نے اپنے مٹی سے بھرے ہوئے بوٹوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو پہلے لکھا تھا۔"

"اچھا۔ تمہاری بیوی کو خدشہ ہوگا۔ کہ محاذ تک پہنچتے پہنچتے وہ خط راستے میں ہی ضائع ہو گیا ہو۔ تو دوسرا مل جائے گا۔"

"دوسرا بھی نہ ملا تو تیسرا،" ہمیفرے نے کہا۔ "ہم دونوں ایک ہی مضمون کے خط دو دو تین تین بلکہ چار چار دفعہ لکھ دیتے ہیں۔ خطوں کی ترسیل محاذوں تک جس طرح ہوتی ہے تم جانتے ہی ہو۔"

"ہاں، ویسے تم ہو عقلمند۔ محاذوں تک ترسیل کے علاوہ سنسر والے بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ خط پھاڑ کر پڑھ تو لیتے ہیں۔ لیکن دوبارہ بند کرنے کی کبھی کبھی زحمت ہی نہیں کرتے۔"

"بھئی جنگ کا زمانہ ہے ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" دوسرا ساتھی بولا۔

لیکن

پہلے ساتھی کے سنسر کی بات کرنے پر ہمیفرے کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ سوچا۔ اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان اور بشاشت کی لہریں دوڑ گئیں۔

"کیوں کیا بات ہے،" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

ہمیفرے نے مسکرا کر کہا "ایک نقطہ ملا ہے اپنی پریشانی کے حل کا۔"

"کیا؟"

"پہلے میں اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ لوں۔ پھر بتاؤں گا۔"

وہ وہیں ایک پتھر کا تکیہ بنا کر مٹی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں اس نقطے کا ہر پہلو آرہا تھا۔ وہ ساری رات بھی اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

پھر

اگلی صبح اس نے مارٹینا کو خط لکھ دیا۔

ڈاک سنسر ہوتی تھی۔

ہمیفرے کا خط سنسر ہونا تھا۔

خطوط کے انبار لگے تھے۔ جنگ کی احتیاطی تدابیر کے سلسلے میں ہر خط سنسر ہو رہا تھا۔ جس خط میں کوئی قابل اعتراض بات ہوتی۔ اس پر لال نشان لگا کر الگ کر لیا جاتا۔ پھر یہ نشان زدہ خط متعلقہ آفیسر کی ٹیبل پر پہنچ جاتے۔ جہاں ضروری کارروائی کی جاتی۔

چند اور خطوں کے ساتھ ہمیفرے کا خط بھی آفیسر کی ٹیبل پر تھا۔ اور خطوں سے یہ خط الگ رکھا گیا تھا۔

آفیسر نے کلرک سے پوچھا "اس خط میں کوئی اہم بات ہے۔"

"یس سر" کلرک نے جواب دیا۔

آفیسر نے باقی خطوط چھوڑ کر ہمیفرے کا خط اُٹھایا۔ اور نشان زدہ پیراگراف پر نظریں دوڑانے لگے۔

"اوہ" وہ کرسی میں بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے بولا "اس پر فوری طور پر ایکشن لینا چاہیے۔"

"یس سر"

دوسرے دن بھی اسی مضمون کا خط آفیسر کی ٹیبل پر تھا۔

"لگتا ہے۔ یہ یقینی بات ہے۔ یہ دوسرا خط بھی اسی مضمون کا ہے" آفیسر نے کہا۔

"یس سر" کلرک نے کہا "ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"کل رابطہ نہیں مل سکا۔ آج یہ کام ہو جائے گا"

آفیسر نے کلرک سے کہا "ایک خط پوسٹ کر دو۔ تاکہ مسز ہمیفرے کو مل جائے۔ یہ نہ ہو۔ وہ اپنے خط کا جواب نہ پا کر کھیتوں میں ہل چلانے کی کوشش کر دیں۔"

"ہاں صاحب۔ خط پوسٹ کرنا بھی ضروری ہے۔ دونوں خطوں کا ایک ہی مضمون ہے۔ دوسرا خط ہیڈ کوارٹر بھجوا دیا جائے۔"

"بالکل"

کلرک نے مارٹینا کے نام ہمیفرے کا خط پوسٹ کر دیا۔ جو اسی ہفتے مارٹینا کو مل گیا۔ خط پا کر وہ اور پریشان ہو گئی۔

ہمیفرے نے جو ضروری بات لکھی تھی۔ وہی پریشان کن تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"مارٹینا۔ کسی کھیت کو بھی ہاتھ نہ لگانا۔ ہمارے ایک کھیت میں شاید کہیں اسلحہ دبایا گیا ہے۔ اس دفعہ فصل بونے کا خیال چھوڑ دو۔ کھیتوں کو جوں کا توں رہنے دو"

مارٹینا حیران تھی۔ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کرے۔

"کیا اسے پولیس کو مطلع کرنا چاہیئے"

"کسی فوجی ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دینی چاہیے۔"

"کھیتوں میں اسلحہ دبا تھا۔ کس کھیت میں تھا۔ یہ بات ہمیفرے نے واضح نہیں کی تھی۔ کس نے یہ اسلحہ چھپایا تھا۔ یہ بھی نہیں لکھا تھا۔ کئی ممالک کی فوجیں ادھر سے آتی رہی تھیں۔ جاتی رہی تھیں۔ دور افتادہ ہونے کی وجہ سے یہ قصبہ براہ راست بمباری کی زد میں نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس جگہ کو محفوظ سمجھ کر اسلحہ یہاں دبایا گیا ہو۔

لیکن مارٹینا کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

وہ ابھی سوچوں ہی میں غلطاں تھی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے" وہ اپنے بالوں کو باندھتے ہوئے اُٹھی۔ اور دروازے پر آ گئی۔ دروازے پر دو فوجی سپاہیوں کو دیکھ کر اس کا دل بے اختیاری سے دھڑکنے لگا۔

"مسٹر ہمیفرے کا گھر یہی ہے نا" ایک فوجی نے تعظیم سے پوچھا۔

"جی" مارٹینا گھبرا کر بولی "خیریت تو ہے نا۔ میرا شوہر محاذ پر ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ اپنے دو بچوں اور سسر کے ساتھ اس گھر میں رہتی ہوں۔ آپ اندر آئیے۔ بیٹھیئے۔"

"شکریہ خاتون" دوسرے فوجی نے کہا۔

"آپ کو مسٹر ہمیفرے کا وہ خط مل چکا ہوگا۔ جس میں انہوں نے آپ کے کسی کھیت میں دبے اسلحے کا شک ظاہر کیا ہے۔"

مارٹینا گھبرا کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی" یقین کیجئے، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں نہ میں جانتی ہوں کہ اسلحہ کس کھیت میں ہے اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ اسے کس نے دبایا ہے"

"آپ گھبرایئے نہیں۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ جو مسٹر ہمیفرے نے آپ کو مطلع کر دیا آپ کا خط سنسر ہونے سے حکام کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے۔"

مارٹینا ان کا منہ تکتے ہوئے بولی" تو۔ تو"

"پریشان نہ ہوں مسز ہمیفرے۔ آپ کو تکلیف دے رہے ہیں ہم۔ لیکن فکر کی بات نہیں، آپ ہمیں اپنے کھیت بتا سکتی ہیں"

"ضرور، ضرور کیوں نہیں۔"

"تو آیئے۔ اسلحے کی تلاش ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ صرف ہمیں اپنے کھیت بتا دیجئے۔ اسلحہ ہم خود کھود کر نکال لیں گے۔"

"لیکن ہمیفرے نے تو لکھا ہے شاید کسی"

"شک ظاہر کیا ہے نا"

"جی"

"اسی لیے تو اب کھیت کھودنا ضروری ہو گیا ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ جنگ کا زمانہ ہے ایسا کوئی رسک نہیں لیا جا سکتا۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔ کہ سارے کھیت ہی اُلٹ پلٹ کرنا پڑیں گے۔ کیونکہ مسٹر ہمیفرے نے وضاحت نہیں کی کہ اسلحہ کس کھیت میں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ بیس فوجی نوجوان آئے ہیں۔ اور ہم بہت جلد سارے کھیتوں کی چھان بین کر لیں گے۔"

مارٹینا کی جان میں جان آئی۔

وہ ان فوجیوں کے ساتھ گئی اور اپنے پانچ سات کھیت انہیں دکھا دیئے۔

"اب آپ جا سکتی ہیں" فوجی نے مارٹینا سے کہا۔

"شکریہ" وہ واپس چلی آئی۔

لیکن وہ متفکر ضرور تھی۔ سوچوں میں بھی گم تھی۔ حیران بھی تھی۔

ہمیفرے نے پہلے تو کبھی اس اسلحے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پچھلی فصل اس نے خود ہی کاٹی تھی۔ تب بھی ہمیفرے نے اسلحے کی بات نہیں کی تھی۔

فوجیوں نے سارے کھیت کھود ڈالے ایک ایک انچ زمین الٹ پلٹ کر دی۔

لیکن

اسلحہ تو کیا۔ ایک بلٹ تک نہ ملا۔

"ہو سکتا ہے مسٹر ہمیفرے کو کسی نے غلط خبر دی ہو۔ فوجیوں کا انچارج ہر طرح سے مطمئن ہو کر بولا" لیکن ہمارا فرض تھا جنگ کے اس زمانے میں ہم جگہ نہ کھودنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ بہر حال تسلّی تو ہو گئی ہے۔ کہ یہ کھیت خطرناک نہیں ہیں۔ ایک گولی تک ان میں سے برآمد نہیں ہوئی۔"

فوجی نے مارٹینا سے بھی یہی کہا۔ معذرت بھی کی" آپ کو ناحق پریشانی ہوئی۔ لیکن اب تسلی بھی ہو گئی کہ کھیتوں میں اسلحہ ہونے کا کوئی خدشہ نہیں۔ ہم نے انچ انچ زمین دیکھی اور کھدائی کی ہے شکریہ"

مارٹینا نے اسی دن ہمیفرے کو خط لکھا۔ اس نے اس کے احمقانہ شک کے اظہار پر اسے سرزنش بھی کیا۔ فوجیوں کے یہاں آنے اور بلاوجہ خجالت اٹھانے پر بھی اسے کوفت ہوئی تھی۔ لیکن خط کے آخر میں اسے یہ لکھنا پڑا۔

"ڈیئر ہمیفرے تم بھی سچے ہو۔ اگر اسلحہ ہوتا اور میں کھیتوں میں ہل چلا دیتی تو کیا بنتا۔ بہر حال شک نکالنا ضروری تھا۔ تمہاری عقل مندی کی میں پہلے بھی معترف تھی۔"

ہمیفرے اس کا خط پا کر خوب ہنسا۔ ہنستا چلا گیا۔

اس کے ساتھیوں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو بولا" اس دن مارٹینا کے خط سے میں پریشان تھا نا"

" ہاں۔ وہ کھیتوں میں ہل چلانے کے متعلق "

" ہاں۔ وہی بات "

" تو" "تو" وہ پھر بے اختیار ہنستے ہوئے بولا۔

" بھئی ہمیں بھی بتاؤ۔ کیوں ہنس رہے ہو"

ہمیفرے ہنس چکا تو خوشدلی سے بولا" خط سنسر ہوتے ہیں نا "

" ہاں"

"بس اسی سنسر سے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تھی۔ اور وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ اب مارٹینا کو ہل چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہ کام میرے فوجی بھائیوں نے کر دیا ہے۔ اب میں مارٹینا کو خط لکھوں گا۔ کہ وہ سہولت سے بوائی کرے۔ اس کا ہل چلانے کا مسئلہ حل ہو گیا ہے"

" لیکن یہ کیسے ہوا"

اور

جیسے ہوا تھا ہمیفرے ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں کو بتانے لگا۔

احساس

کالج کا ہال لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ نشستیں کم پڑ جانے کی وجہ سے بے شمار لڑکیاں دیواروں کے ساتھ ساتھ قطاریں بنائے کھڑی تھیں۔ درمیانی خالی جگہ پر بھی طالبات بیٹھی ہوئی تھیں۔ انٹر کالجیئیٹ مباحثے ہو رہے تھے۔ آج آخری دن تھا۔ اس لیے گہما گہمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ دوسرے کالجوں کی طالبات بھی بڑی تعداد میں آئی ہوئی تھیں۔ مباحثے میں حصہ لینے والی طالبات سٹیج کے قریب پہلی قطار میں بیٹھی تھیں۔ ہاتھوں میں کاغذ پکڑے تھے۔ کچھ نے تو صرف پوائنٹس لکھ رکھے تھے اور کچھ نے پوری پوری تقریر لکھی ہوئی تھی۔ مقابلہ سخت تھا۔ ہر کالج نے اپنی بہترین ڈیبیٹرز حصہ لینے کے لیے بھیجی تھیں..... ٹرافی حاصل کرنے کے لیے سبھی کوشاں تھے۔ سٹیج پر مائیک رکھا تھا..... کرسی صدارت پر شہر کے نوجوان ادب نواز اے سی تشریف فرما تھے احمد ملک خود بھی شاعر تھے..... ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اس لیے انہیں اکثر کالجوں میں مدعو کیا جاتا۔ اہم شخصیت ہوتے ہوئے ان سے کچھ سہولتیں کالج کے لیے حاصل کرنا بھی مقصود ہوتی تھیں۔ اس لیے تقسیم انعامات اور تقسیم اسناد وغیرہ کے لیے انہیں ہی بلایا جاتا۔ کالج کی پرنسپل مسز آسیہ خلیل بڑی چاق و چوبند خاتون تھیں۔ وہ ان کے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ جب بھی موقعہ ملتا وہ کالج کا کوئی سلگتا ہوا مسئلہ احمد ملک کے گوش گزار کر دیتیں۔ اپنی مشکلات بتاتیں۔ مالی دشواریوں سے آگاہ کر دیتیں۔ فنڈ کی کمی کا بتلاتیں۔ احمد ملک بڑی توجہ اور اطمینان سے ان کی باتیں سنتے ہوئے سوچتے کہ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے وہ کیا وسائل استعمال کر سکتے ہیں۔

ان کے بائیں ہاتھ کی کرسیوں پر شہر کے مشہور صنعت کار آغا فضل رحمان بیٹھے تھے، وہ خواتین کے اس کالج کے لیے بڑا کام کر رہے تھے۔ ایک ہوسٹل کی تجویز جو مسز آسیہ خلیل نے پیش کی تھی۔ اس کے قیام کے لیے وہ عملی کام کر رہے تھے۔ زمین خرید کر دی تھی۔ اب بلڈنگ کے لیے پیسہ جمع کر رہے تھے۔ اپنے صنعت کار ساتھیوں سے ہزاروں روپے چندہ جمع کیا تھا...... ان کے برابر میں بیگم سارہ حبیب بیٹھی تھیں، مخلص کارکن تھیں، سوشل ویلفیئر کی ممبر تھیں، کالج کے لیے ان کی کوششیں اور کاوشیں قابل تعریف تھیں۔

سٹیج سیکرٹری کے فرائض کالج کی لیکچرار مس صمد سرانجام دے رہی تھیں، مباحثہ شروع تھا۔ لڑکیاں سٹیج پر آ کر اپنا نقطہ نظر بیان کر رہی تھیں۔ موضوع تھا ”عورت کمزور ہے......“

اس موضوع کے حق میں اور مخالفت میں بڑے زور و شور سے تقاریر کا سلسلہ جاری تھا۔ پر زور دلائل دیئے جا رہے تھے...... مرعوب کرنے کے لیے بھاری بھرکم جملے بولے جا رہے تھے۔ مشاہیر عالم کے نظریات بیان کیے جا رہے تھے۔ حق میں بولنے والی لڑکیاں مخالفت میں بولنے والی لڑکیاں برابر ہی جا رہی تھیں۔ اپنی اپنی طالبات کو ساتھ آنے والی طالبات خوب سپورٹ کر رہی تھیں۔ واہ واہ کر رہی تھیں، داد دے رہی تھیں..... ہمت افزائی کے لیے نعرے لگا رہی تھیں۔

شور شرابا بند کروانے کے لیے پرنسپل صاحبہ کو بار بار اُٹھ کر مائیک پر آنا پڑ رہا تھا۔ لڑکیوں کو خاموش رہنے اور آرام سے تقاریر سننے کی وہ بار بار تاکید کر رہی تھیں۔

احمد ملک طالبات کا جوش و خروش دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ جوان خون میں اُبال آیا ہوا تھا...... شور شرابہ ہلا گلا انہوں نے کرنا ہی تھا.....

ایک بار مسز آسیہ خلیل نے لڑکیوں کو دھمکایا بھی...... مباحثہ بند کر دینے کی دھمکی دی۔ لڑکیاں چند لمحوں کے لیے چپ ہوئیں، تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پریشان ہو کر بولیں۔

”احمد صاحب دیکھ لیں۔ ان لڑکیوں کو کنٹرول کرنا کتنا مشکل ہے.....“

احمد ملک دھیرے سے مسکرائے اور بولے ”عورت کمزور نہیں ہے نا“

مسز آسیہ خلیل مسکرا دیں ”تو گویا آپ بھی موضوع کے حق میں نہیں ہیں“

”دلائل تو دونوں طرف سے بڑے زور دار دیئے جا رہے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں..... ان کا موقف زیادہ توانا اور مضبوط ہے...... آپ کا کیا خیال ہے۔

مسز خلیل آہستگی سے بولیں ”احمد صاحب عورت کمزور نہیں ہے، لیکن ہمارے سماج ماحول اور گرد و پیش نے اسے کمزور بنا دیا ہے.....“

”گویا آپ کہنا چاہتی ہیں کہ عورت نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے ہوئے ہیں۔

”تو اور کیا کرے“

”لڑے..... اپنے حقوق کے لیے لڑے...... بغیر کسی کمزوری کا مظاہرہ کیے..... مجھے ان مطالبات کا موقف اور نقطہ نظر بہت پسند آیا ہے..... جو عورت کو کمزور نہیں کہتیں، ہتھیار ڈالنے کے حق میں نہیں۔ بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتیں.....“

”وہ..... تو.....“ مسز خلیل کی بات ادھوری رہ گئی..... سٹیج سیکرٹری نے اب تقریر کے لیے آنے والی طالبہ کے متعلق مائیک پر بتایا تھا......

”سال چہارم کی طالبہ حنا شاہد موضوع کی مخالفت میں بولنے کے لیے سٹیج پر آ رہی ہیں....“

مسز خلیل نے صنعت کار فضل رحمان کو مخاطب کرتے ہوئے ہولے سے کہا ”شاہد صاحب کو آپ تو جانتے ہیں نا..... شاہد انجینئرنگ ورکس والے.....“

”جی جی.....“ انہوں نے بھی آہستگی سے کہا۔

”حنا انہی کی بچی ہے“

”اچھا.....“

”بہت ذہین لڑکی ہے.....“

”شاہد خود بھی کم ذہین نہیں.....“

مسز خلیل نے حنا کے سٹیج پر آتے ہی احمد ملک کو بھی اس کے متعلق بتایا۔ اس کی ذہانت قابلیت اور خاندانی پس منظر کا بھی چند لفظوں میں ذکر کرتے ہوئے بولیں ”کالج میں چند ہی طالبات ایسی ہوتی ہیں..... جو ہر فیلڈ میں اپنا لوہا منوالیتی ہیں..... حنا بہت اچھی سٹوڈنٹ ہے..... اس کا اخلاق اور رویّہ بھی دوسری لڑکیوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ کھلاڑی بھی بہت عمدہ ہے..... شاعرہ بھی ہے اور ڈبیٹر بھی کمال کی ہے۔“

احمد ملک نے مسکرا کر کہا ”آپ کے خیال میں ٹرافی لے جائیں گی یہ طالبہ.....“

”وہ تو میں نہیں کہہ سکتی.....“ وہ بولی ”بڑے زور و شور سے بڑی دھواں دھار اور مدلل تقاریر ہو رہی ہیں..... فیصلہ تو جج صاحبان کی صوابدید پر ہوگا۔ ویسے یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔“

”آپ کا ووٹ ہوتا تو اس کے حق میں جاتا.....“

”بالکل.....“

فضل رحمان بھی احمد ملک سے باتیں کر رہے تھے..... شاہد صاحب کے ذہین و فطین ہونے کی انہوں نے احمد ملک صاحب کو بہت سی باتیں بتائیں.....

”میں ان سے ملا نہیں.....“ احمد ملک بولے۔

”ہم ملوا دیں گے“ فضل رحمان بولے ”بڑی پیاری شخصیت ہے۔“

ہر طالبہ کے سٹیج پر آنے سے پہلے پرنسپل دو چار جملے اس کے تعارف کے لیے ان صاحبان کے گوش گزار کر رہی تھیں..... حنا کے متعلق تفصیل ذرا طویل ہی ہوگئی..... اس وجہ سے کہ اس کا باپ فضل رحمان کے جاننے والوں میں سے تھا..... اور کالج کے لیے اچھی خاصی رقوم وہ چندے میں بھی دیتا رہتا تھا۔

حنا سٹیج پر آئی تو احمد ملک نے اک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی.....

سفید یونیفارم پر اس نے نیلا ڈوپٹہ گلے میں ڈال رکھا تھا..... فورتھ ائیر کا یہی کلر تھا..... خوش شکل اور سمارٹ سی لڑکی تھی وہ..... سٹیج پر آتے ہی اس نے بڑے مؤدبانہ طریق سے مہمانوں کو سلام کیا اور مائیک کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

اس نے بڑے دھیمے اور سبح انداز میں تقریر شروع کی موضوع کے حق کی حامی لڑکیوں نے کچھ ہلا گلا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حنا بڑے پُرسکون انداز میں بولتی چلی گئی۔ اس نے بڑے خوبصورت انداز میں تقریر کی۔ پُر زور دلائل دیئے..... اس کا انداز خطابت بڑے منجھے ہوئے مقرروں کا سا تھا..... آہستہ آہستہ اس کی باتوں میں جوش ابھرا..... اپنی بات منوانے کے انداز میں وہ بول رہی تھی..... اس کا جوش اور جذبہ متاثر کن تھا۔

جج صاحبان کا فیصلہ اس کے حق میں ہوا..... اس نے کالج کے لیے ٹرافی جیتی اور بیسٹ پرفارمنس کا کپ بھی اسے ملا..... ٹرافی لینے کے لیے اسے سٹیج پر بلایا گیا تو مسلسل دو منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔

ٹرافی احمد ملک صاحب نے اسے دی..... اس نے سر قدرے جھکا کر شکریہ ادا کیا..... احمد صاحب نے اس کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا..... ”تقریر لکھوائی تھی یا خود لکھی تھی.....“

”سر.....“ وہ جھٹ سے بولی ”میں نے تقریر نہ لکھوائی نہ لکھی۔ بلکہ جو میرے ذہن میں آیا کہے گئی.....“

”ویری گڈ.....“

”تھینک یو.....“

”اُمید ہے آپ اصلی زندگی میں بھی انہی خیالات کی حامی ہوں گی.....“

”بالکل ہوں سر..... میں نے کبھی سوچا بھی نہیں..... کہ عورت سوائے جسمانی لحاظ سے کسی طور بھی کمزور ہے..... ذہنی و دماغی اخلاقی کسی لحاظ سے بھی عورت کمزور نہیں ہے.....“

"مجھے آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی ہے...... ہر لحاظ سے جرأت مند عورتیں مجھے بہت پسند ہیں۔ واقعی عورت کمزور نہیں ہے"

"شکریہ.....!" اس نے احمد ملک کو مسکراتے دیکھ کر شوخ لہجے میں کہا "سر عورت واقعی کمزور نہیں ہے"

وہ ٹرافی اُٹھائے سٹیج سے نیچے اُتر آئی.....

احمد ملک اسے دیکھتے رہے...... یہ سمارٹ سی بولڈ سی لڑکی ان کے من کو بھا گئی تھی۔

کئی دن وہ اس کے متعلق سوچتے رہے...... شکل وصورت سے کہیں زیادہ وہ اس کی تقریر سے متاثر تھے..... اس کے خیالات اس کے افکار اور اس کے نقطہ نظر سے متفق تھے..... ان کے ذہن میں ایک آئیڈیل عورت بستی تھی..... لاشعوری طور پر وہ اس کے متلاشی تھے..... حنا ہر لحاظ سے تو ویسی نہ تھی۔ پھر بھی اس آئیڈیل سے بڑی حد تک مطابقت مشابہت رکھتی تھی..... احمد جوں جوں اس سے متعلق سوچنے لگتا عرصے سے اسی کی تلاش میں تھا..... وہ اچانک ہی گرلز کالج کے مباحثے میں انہیں مل گئی تھی.....

شادی انہوں نے کرنا تھی..... اور اس معاملے میں وہ آزاد و خود مختار بھی تھے.....

ماں اور باپ دونوں زندہ تھے..... دو بڑی بہنیں بھی تھیں...... ایک چھوٹی بہن اور بھائی بھی تھا..... لیکن ماں باپ روشن خیال تھے..... بیٹے کو پسند اور انتخاب کے معاملے میں پورے اختیارات دے رکھے تھے...... بیٹا بالغ النظر تھا..... سلجھا ہوا تھا..... اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا..... اس لیے اس کا فیصلہ اور پسند قابل احترام تھے۔

احمد نے بڑی بہنوں سے حنا کا ذکر کیا..... دونوں شادی شدہ تھیں..... بڑی کی شادی پسند کی شادی تھی..... چھوٹی بھی اپنے کزن سے بیاہی تھی..... محبت کا معاملہ تو نہیں تھا..... پھر بھی اس شادی سے خوش تھی..... بھائی کے معاملے میں وہ بھی والدین کی طرح فراخدلی سے آزادی دینے کی قائل تھیں.......

"لڑکی تمہیں پسند ہے تو ہمیں اعتراض کیسا" انہوں نے کہا۔

احمد بولے "معاملہ تو آپ لوگوں نے طے کرنا ہے"

"اتہ پتہ بتا دو..... ہم چلے جائیں گے....."

"اماں سے بھی بات کر لینا.....!"

"ظاہر ہے اماں ساتھ جائیں گی"

"ٹھیک ہے..... احمد نے انہیں حنا کے گھر کا پتہ بتا دیا..... ساری معلومات مفضل رحمان صاحب نے انہیں اکٹھی کر کے دی تھیں..... یہ رشتہ کروانے میں وہی پیش پیش تھے، شاہد تک بھی بات انہوں نے ہی پہنچائی تھی.....

اب رسمی کارروائی تھی..... جو احمد کے گھر والوں ہی نے کرنا تھی.....

دونوں بہنیں اور امی حنا کے ہاں رشتہ لے کر گئیں۔ گھر بار خاندان لڑکی اور اس کے والدین سبھی کچھ ٹھیک ٹھاک تھا..... اور اپنے اسسٹنٹ کمشنر بیٹے کے شان شایان بھی تھا..... حنا بھی انہیں بہت اچھی لگی.......

احمد کو توقع تو تھی..... کہ رشتہ منظور ہو جائے گا..... پھر بھی بے چینی سی لگی تھی..... ماں اور بہنوں کی واپسی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

گاڑی سرکاری بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوئی تو لان میں ٹہلتے احمد لپک کر ڈرائیو وے پر آ گئے.....

دونوں بہنوں نے احمد کو بنانے کا پروگرام گاڑی میں بیٹھتے ہی بنا لیا تھا..... امی سے بھی کہہ دیا تھا..... کہ وہ کچھ نہ بولیں.....

گاڑی سے امی کے بعد دونوں بہنیں بھی اُتریں..... احمد لپک کر ان کی طرف آئے۔

امی اندر چلی گئی تھیں۔

"کیا خبر ہے" وہ بے تابی سے بولے۔

"کوئی خاص نہیں......"

"کیوں"

"بس"

"انکار ہوگیا......"

"ہاں......"

"لیکن کیوں......"

"مرضی لڑکی والوں کی......"

"آپ...... آپ لوگوں نے......"

"بھئی ہم کیا کرتے...... انہوں نے نہ کردی ہم واپس چلے آئے......"

احمد کا منہ لٹک گیا...... کچھ سمجھ نہ پائے کہ کیا کریں...... ایک ہاتھ کا مکہ دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر اپنی شکست پر دانت بھینچ لیے......

"گھبرانے کی کیا بات ہے" بڑی بہن بولی "حنا تمہیں پسند ہے نا......"

دوسری بہن نے منہ بنا کر کہا "پسند ہے جبھی تو ہمیں بھیجا تھا...... لیکن اب کیا کریں......"

"کرنا کیا ہے...... جناب اسسٹنٹ کمشنر صاحب اپنا رعب داب دکھائیں...... بات بن جائے گی"

"نہیں نہیں......" وہ جلدی سے بولے......"میں حنا کو زبردستی...... نہیں......"

دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ احمد ان کا منہ تکنے لگے...... تو بڑی بہن بولیں

"اس لڑکی سے زبردستی کر بھی نہیں سکتے شادی......"

دوسری بہن نے ہنس کر کہا "خاصی تیز لڑکی ہے......"

احمد دونوں کا منہ تکے جا رہے تھے...... بڑی بہن نے ان کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا "مبارک ہو بات بن گئی......"

"سچ......"

"ہاں......"

"لیکن آپ لوگ......"

"تمہارے صبر اور شوق کا امتحان لے رہے تھے...... ہم......"

"رشتہ پکا......"

"منگنی اور شادی کی تیاری کرو......"

تینوں باتیں کرتے ہنستے مسکراتے اندر چلے آئے...... جہاں امی ان کی منتظر بیٹھی تھیں۔ رشتہ طے ہوگیا تھا۔ حنا اور احمد کی جوڑی سبھی کو پسند تھی۔

منگنی کی تقریب بڑی پُرشکوہ تھی...... حنا کے والد شہر کے امیر آدمی تھے...... روپے پیسے کی کمی نہ تھی...... رشتہ اسسٹنٹ کمشنر سے جوڑا تھا۔ اس لیے تقریب دھوم دھام سے ہوئی۔

شادی کی تاریخ طے کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی...... احمد تو جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے قائل تھے...... لیکن لڑکی والے کچھ مہلت چاہتے تھے...... ایک تو تیاریاں کرنا تھیں...... دوسرے حنا مُصر تھی کہ شادی اس کے امتحان دینے کے بعد ہو...... امتحان میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔ انتظار میں صبر و شوق کی آزمائش ہو تو طوالت اور طویل لگتی ہے۔ یہی حال احمد ملک کا تھا...... انہوں نے بہت زور دیا کہ شادی جلدی ہو جائے۔ حنا کے والدین بھی ان کے اصرار کے سامنے جھک گئے...... پیسہ پاس تھا تیاری ہو سکتی تھی...... لیکن حنا نہیں مانی...... اس کا یہی فیصلہ تھا کہ شادی امتحان دے کر کروں گی۔

"امتحان شادی کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے......" احمد کا کہنا تھا۔

لیکن

اس نے جو بات کہہ دی تھی اس پر قائم تھی...... احمد نے ایک دن خود اسے فون کیا......

اپنی بے تابیٔ شوق کا حوالہ دیا۔ ٹرانسفر ہو جانے کا خدشہ بھی ظاہر کیا...... لیکن اس کا وہی جواب تھا...... ”ٹرانسفر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن شادی کے بعد امتحان نہیں دے سکوں گی“

”میرا وعدہ رہا...... میں تمہیں تیاری میں پوری مدد دوں گا...“

”اوں ہوں...... میں اس سلسلے میں آپ کی مدد ضروری نہیں سمجھتی...... میں خود تیاری کر سکتی ہوں......“

”ٹھیک ہے شادی کے بعد خود ہی تیاری کر لینا......“

”نہیں صاحب...... نہیں...... میں اپنی چودہ سالہ محنت ضائع نہیں کروں گی“

”یہ آخری فیصلہ ہے“

”جی......“

”کوئی لچک نہیں......“

”جب فیصلہ یہ آخری ہے تو لچک کی گنجائش کہاں سے نکلے گی“

”میری بات نہیں مانو گی“

”اپنی بات آپ سے منواؤں گی...“ وہ ہنس پڑی...... احمد بھی ہنس کر بولے ”میں بھی اپنی ضد پر آ جاؤں تو......“

”یہ ضد نہیں ہے احمد صاحب...... اصولوں کی طاقت ہے......“

”اصولوں کی طاقت“

”جی ہاں عورت کے اصولوں کی طاقت...... آپ کو ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔

احمد کھلکھلا کر ہنس پڑے......

شادی کی تاریخ حنا کی مرضی کے مطابق ہی طے ہوئی...... احمد کی بہنوں اور امی نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا کہ وہ امتحان دے ہی لے...... احمد جز بز تو بہت ہوئے لیکن کر کچھ

بھی نہ سکے۔ امی اور بہنیں خوشی خوشی شادی کی تیاریاں کرنے لگیں...... شاپنگ شروع ہو گئی...... اکثر وہ حنا کو بھی ساتھ لے جاتیں...... تاکہ وہ اپنی پسند کے رنگ اور کپڑے خرید سکے...... زیور بھی اس کی پسند کا ہی خریدا جا رہا تھا......

اس سارے عرصے میں احمد ایک بار بھی حنا سے نہ مل سکے...... کبھی کبھی فون کر لیتے اور بس...... ایک شام

فون پر باتیں ہو رہی تھیں...... کہ احمد نے کہا ”حنا......“

”جی......“

”کسی دن میرے ساتھ گھومنے چلو گی“

”جی نہیں......“

”کیوں؟“

”یہ بات ہمارے گھرانوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے......“

”قدامت پسندی ہے“

”جو کچھ بھی کہہ لیں...... مجھے بھی بات پسند نہیں......“

”یعنی میں تم سے مل نہیں سکتا......“

”فون ہی کافی ہے“

”لیکن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں......“

”اس کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے...... اس سے پہلے ہرگز نہیں...... ملنا تو ایک طرف میں آپ کے سامنے بھی نہیں آؤں گی......“

”یہ بھی آخری فیصلہ...... اور پکا اصول......؟“

”بالکل......“

”اگر میں تمہارے فیصلے کو نظرانداز کرتے ہوئے تمہارے اصول سے ٹکرا جاؤں تو......“

"کیسے ؟"

"میں کسی دن بھی کالج میں وزٹ کے لیے آسکتا ہوں...... ہوسٹل کی جو بلڈنگ بن رہی ہے...... اسی سلسلے میں فضل رحمان صاحب سے کہنے کی دیر ہے۔"

وہ ان کی باتوں پر ہنس دی.....

"تمہارا پکا اصول توڑنے کے لیے میں یہ وزٹ....."

"ضروری تھوڑا ہی ہے کہ آپ کا وزٹ ہو اور میں بھی کالج میں ہوں..... جناب اس دن میں چھٹی بھی منا سکتی ہوں...... سمجھے......"

وہ ہنس رہی تھی......

احمد بھی مسکرانے لگے...... پھر مخمور لہجے میں بولے "حنا تم میری بہنوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے اکثر جاتی ہو، میں چاہوں تو تمہیں دیکھ سکتا ہوں مل سکتا ہوں.... لیکن یہ بات تمہیں پسند نہیں..... تو..... ٹھیک ہے....."

وہ پھر ہنس پڑی ..... "مانتے ہیں نا عورت کے اصولوں کی طاقت کو....."

"مانتے ہیں جناب مانتے ہیں...... اور پسند بھی فرماتے......کہ" احمد ہنس کر بولے...

"عورت کمزور نہیں ہے......"

"شکریہ.....شکریہ....." وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

چھ ماہ پلک جھپکتے گزر گئے..... حنا امتحان دے کر فارغ ہوئی تو گھر میں ڈھولک بجنے لگی...... مہینہ بھر ہلا گلا ہوا..... پھر حنا سرخ جوڑا پہن کر بابل کی دہلیز پار کر کے سسرال آ گئی...... حنا کو تو پا کر انہیں یوں لگا جیسے سارے جہاں کی خوشیاں ان کا مقدر بن گئی ہیں.... کچھ یہی حال حنا کا بھی تھا...... دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے..... ہر دن روزِ عید اور ہر رات شبِ برات تھی...... کئی دن وہ ہنی مون کے لیے مری اور کاغان گھومتے پھرے..... مہکتی تنہائیوں نے قربتوں کو مخمور کیے رکھا۔

واپس آ کر بھی گہما گہمی رہی...... شادی کے شروع شروع کے دن تھے۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا ملتا ہی نہ تھا۔ کبھی حنا کے عزیزوں رشتہ داروں کے ہاں مدعو ہیں...... کبھی اپنے دوست احباب نے دعوت دی ہوئی ہے...... کبھی کوئی ملنے آ رہا ہے..... کبھی کوئی مبارک دینے..... حنا کو صبح و شام نئی دلہن کا روپ دھارنا پڑتا۔ بھاری بھاری جوڑے پہننا پڑتے..... سارا زیور لادنا پڑتا...... تیز اور شوخ میک اپ بھی زیور کپڑوں کے تقاضے سے کرنا پڑتا۔ چند دن تو یہ سب کچھ شوق سے کیا۔ لیکن پھر وہ اکتا گئی.....

اس دن اس کے چند سسرالی عزیز جو شادی میں شامل نہ ہو سکے تھے اُسے دیکھنے آ رہے تھے.......

حنا اپنے کمرے میں تھی..... اس نے سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھے...... "تیار ہو جاؤ نا......"

"تیار ہی ہوں امی......"

"اے ہے نہ زیور نہ کام والا جوڑا...... بنی سنوری نہیں آج....."

"بس آج جی نہیں چاہ رہا..... ایسے ہی ٹھیک ہے"

"نہیں ایسے ٹھیک نہیں ہے...... جانتی ہو وہ کون لوگ ہیں"

"آپ کے کوئی عزیز ہی ہیں......"

"شریک ہیں شریک...... شریک داری میں تو ان پر بڑھ چڑھ کر رعب ڈالنا ہے.... آج تو خوب بھاری سا جوڑا نکالو...... اور زیور بھی پہلے دن کی طرح سارا پہن لو.... میں رابعہ کو بھیجتی ہوں......"

"نہیں امی......" وہ جلدی سے بولی..... "میں تھک گئی ہوں..... آج ایسے ہی چلے گا..... بس ہلکا سا زیور پہن لیتی ہوں......"

وہ تیار ہوئی..... لیکن اپنے ہی ڈھنگ سے..... شفون کی سادہ ساڑھی پہنی......

رنگ کی مناسبت سے میک اپ کیا اور ڈائمنڈ کا خوبصورت سیٹ نکال کر پہن لیا.....

ساس اس وقت تو کچھ نہ بولی..... لیکن حنا کے روّیے کو عدول حکمی سے تعبیر کرتے ہوئے اس نے بیٹے سے بھی شکایت کر دی..... اس بات کو اس نے اپنی عزت و انا کا مسئلہ بنا لیا۔

"حنا نے خودسری کا مظاہرہ کیا ہے۔ امی کی بات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔"

چھ ماہ کے اندر ہی ساس بہو میں اک سرد جنگ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی..... جیسے حالات و واقعات ہولے ہولے گرم کیے جا رہے تھے۔

حنا نے جب بھی میکے بازار یا کسی دوست کے ہاں جانا ہوتا..... احمد کو صرف بتا دیا کرتی..... احمد نے بھی کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا..... لیکن ساس کو ہمیشہ ہی حنا کے اجازت نہ لینے پر اعتراض ہوتا تھا۔ بہو کو ساس کی اجازت لے کر ہر کام کرنا چاہیے.....

وہ اس بات کی حامی تھی..... اور یہی بات ساس بہو میں وجہ نزع بن گئی۔ اس دن احمد گھر آئے" تو ماں بیٹی نے خوب ہی کان بھرے..... حنا کی خودسری اور من مانی کرنے کی شکایتیں تو وہ اکثر کرتی رہتی تھی..... آج تو بقول ساس کے حنا نے زبان بھی چلائی تھی۔

اب ساس بہو میں آئے دن نوک جھونک ہونے لگی..... ساس کچھ کہتی تو ادھار رکھنے والی حنا بھی نہ تھی۔ بات برداشت نہ کر پاتی..... فٹ سے جواب دے دیتی۔ ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ماہر ہو گئی تھی۔

امی بھی جھپٹ سے بولی" تم اس کی اس طرح طرف داری کرو گے..... تو ابھی سے ہاتھ پیر نکال لے گی....." حنا احمد کی شہ پا کر شیر ہو گئی.....

ماں بیٹے سے شکایت کرتی۔ تو وہ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے" امی..... آپ کو حنا کی ہر بات قابل گرفت لگتی ہے..... آپ بڑی ہیں۔ دل بھی بڑا کیجیے..... معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے ہونے لگیں تو اچھا نہیں ہو گا۔ اس نے بھی یہیں رہنا ہے آپ نے بھی یہیں....."

"وہ یہی تو نہیں چاہتی....."

"کیا"

"کہ ہم یہاں رہیں....."

"نہیں امی..... ایسی بات حنا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی..... بلکہ وہ تو آپ کے یہاں رہنے سے خوش ہے۔"

"وہ آزادی کے ساتھ ساتھ خودمختاری چاہتی ہے..... میں تو کہتی ہوں..... دے دو خرچہ بھی اس کو..... میں نے کیا لینا ہے..... خوش رکھو اسے....."

احمد ماں کے لہجے میں ہلکی سی چبھن بھی محسوس کرتے..... لیکن پھر بھی حالات کو متوازن رکھنے کے لیے سمجھاتے بجھاتے رہتے......

لیکن

اب انہیں محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ صرف ماں کو سمجھانے سے کام نہیں چلے گا۔ حنا کو بھی حالات سے خوش اسلوبی سے سمجھوتا کرنے کی بات بھی ذہن نشین کرانا چاہیئے.....

اس دن موقع پا کر انہوں نے حنا سے بات کی..... تو وہ چھٹتے ہی بولی" ہو گیا نا شکایتوں کا اثر......"

"حنا..... یہ بات نہیں..... میں چاہتا ہوں کہ تم اور امی سلوک اور اتفاق سے رہو..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے نہیں ہونے چاہئیں....."

"تو تمہارا کیا خیال ہے جھگڑا میں ہی کرتی ہوں؟"

"میں تمہاری امّی کا احترام کرتی ہوں"

"کرنا بھی چاہیے....."

"انہیں بھی تو مجھ سے مشفقانہ برتاؤ کرنا چاہیے....."

"تم موقع ہی کیوں دیتی ہو....."

"بات ہرا پھرا کر مجھ پر ہی لاؤ گے....."

"اس لیے کہ اب گھر کے حالات کو بنانا سنوارنا..... یا بگاڑنا تم پر ہی ہے....."

"اکیلی مجھ پر....."

"ہاں..... تمہاری عقل و دانش کا امتحان ہے یہ....."

حنا ان کی باتیں سنتے ہوئے یوں منہ بنا رہی تھی جیسے کڑوی کسیلی گولی نگل رہی ہو..... پھر بھی اس نے وعدہ کیا..... کہ آئندہ حالات کو بگڑنے نہیں دے گی۔

کئی دفعہ احمد کے سامنے بھی جھگڑا ہوا..... کبھی امی کا قصور ہوتا..... تو کبھی حنا کی زیادتی.....

حنا بھی اسی ڈگر پر چلتی..... احمد کچھ کہتے تو رونے لگتی..... روٹھ جاتی..... میکے چلے جانے کی باتیں کرنے لگتی..... یا غصے میں آکر اول فلول بکنے لگتی.....

احمد سمجھاتے مناتے اور پریشان ہو کر پوچھتے "مجھے بھی تو بتاؤ میں کیا کروں....."

اس دن بھی انہوں نے یہی بات کہی تو حنا نے فوراً کہا "آپ یہ کریں..... کہ یا انہیں یہاں رکھیں یا مجھے....."

"کیا مطلب؟"

"انہیں یہاں سے چلتا کروں؟"

"تو مجھے چلتا کر دیں" حنا نے طنز کیا۔

"حنا....." احمد گرجے "اتنی نڈر اور بے باک نہ بنو کہ....."

"کہ..... کیا؟" وہ بھی اسی لہجے میں بولی۔

احمد نے غصہ پینے کی کوشش کی.....

"کیا کر لوگے؟ کیا کر سکتے ہو.....؟"

اس زعم میں نہ رہنا..... کرنے پہ آؤں تو بہت کچھ کر سکتا ہوں۔

"تو کر لو....."

وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی..... ثنیہ کھڑکی سے کان لگائے ساری باتیں سن رہی تھی..... اس نے ایک ایک بات امی کو بتا دی.....

گھر میں تناؤ کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی..... ہر کوئی کھنچا کھنچا تھا۔

حنا اپنی جگہ ڈٹی ہوئی تھی..... ساس کے سامنے جھکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا..... وہ تو احمد کو جھکانے کے لیے پلان بناتی رہتی تھی.....

اس دن اس کی عزیز دوست حمیرا آئی ہوئی تھی..... گھر میں تکلیف دہ کھچاؤ تھا..... اس نے محسوس کیا..... حنا سے پوچھا..... تو وہ کچا چٹھا اس کے سامنے کھولتے ہوئے بولی

"میں ماں بیٹے کو سیدھا کر لوں گی..... سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو....."

وہ بولتی بکتی رہی..... تو حمیرا نے اسے حالات کی نزاکت کو سمجھنے اور عقلمندی سے ان سے نپٹنے کی تلقین کی.....

"تمہارا رویہ غلط ہے حنا..... ساس بہو میں تو مانا کہ لگ نہیں آتی..... لیکن تم نے تو احمد کو بھی نہیں چھوڑا..... ان کے منہ بھی لگنے لگی ہو..... یاد رکھنا حنا..... شوہر کیسا بھی ہو..... بیوی کی خودسری اور دریدہ دہنی برداشت نہیں کرتا....."

"میں جانتی ہوں..... احمد ماں کے بھڑکانے پر بھڑکتے ہیں۔ لیکن جب میں چٹان بن جاتی ہوں نا..... ان سے زیادہ غصے میں آجاتی ہوں..... تو وہ سامنے نہیں ٹھہر پاتے....."

"بہت بھولی ہو..... اور زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتی ہو....."

وہ ہنس پڑی.....

تو

حمیرا نے کہا "تم احمد کو سمجھ نہیں پائی حنا..... اور پھر تم جو باتیں کر رہی ہونا..... عملی زندگی میں ان کا دخل زہر ہوتا ہے۔ احمد بزدل اور ہتھیار ڈال دینے والی عورتوں کو ناپسند کرتے ہوں گے..... لیکن بیوی میں یہ صفات انہیں یقیناً نہیں بھاتی ہوں گی....."

حنا ہنس کر بولی "کیوں بیوی اور عورت میں فرق ہوتا ہے.... بیوی عورت نہیں ہوتی؟"

"بیوی صرف بیوی ہوتی ہے...... اور ہر مرد بیوی ہی دیکھنا چاہتا ہے....."

حنا نے برا سا منہ بنایا......

حمیرا اسے سمجھاتی رہی.....

حنا اپنی روش پر قائم رہی۔ کئی دن احمد سے روٹھی رہی...... منانا احمد ہی کو پڑا....

حنا من ہی من میں پھول گئی...... احمد کو اس نے جھکا ہی لیا تھا.....

اس دن بھی کوئی ایسی ہی بات ہوئی تھی.....

دونوں میاں بیوی میں بحث و تکرار ہونے لگی تھی..... جو بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ حنا نے غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا...... میں اس گھر میں اب ایک منٹ نہیں رُکوں گی....."

"تو دفع ہو جاؤ....."

"جاتی ہوں..... اور اس وقت تک واپس نہیں آؤں گی جس وقت تک تمہارا یہ کنبہ قبیلہ یہاں سے دفع نہیں ہو جاتا۔

"بکواس بند کرو..... تم حد سے بڑھ رہی ہوں......"

"میں جا رہی ہوں......" وہ غصے سے چلائی یاد رکھو...... اس وقت تک نہیں آؤں گی جس وقت تک یہ گھر میرے رہنے کے قابل نہیں ہو جاتا...... سمجھے....."

"تم اس گھر کے قابل ہی نہ تھیں....." وہ بھی غصے سے بولے۔

"دیکھ لوں گی....." وہ زہر آلود لہجے میں چیخی اور الماری کی طرف بڑھ گئی... ہینگروں سے لٹکے چند جوڑے سوٹ کیس میں ٹھونسے..... کچھ ضروری چیزیں اکٹھی کیں..... پرس اٹھایا اور کمرے سے پیر پٹختی نکل گئی..... احمد وہیں کھڑے رہے......

ساس سامنے آگئی "حنا..... معاملے کو گھر تک ہی محدود رکھو..... بات بڑھاؤ نہیں..... گھر چھوڑ کر نہیں جاؤ"

"ہونہہ..... گھر میرا نہیں آپ کا ہے...... سنبھالیں اسے..... احمد جب میرے لیے گھر بنائے گا مجھے لے آئے گا....."

احمد اندر ہی سے بولے "امی..... جانے دیں اسے..... ٹھوکریں کھا کر خود ہی آ جائے گی....."

"سر کے بل آؤ گے لینے....." وہ چلائی...... "خود کبھی نہیں آؤں گی"

حنا ساس اور نند کے بار بار روکنے پر بھی نہیں رکی

وہ میکے آگئی۔

ماں باپ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئے..... حنا کے گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا تھا... یہ بات تو انہیں پتہ تھی..... لیکن لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ آنا کسی طرح مناسب نہیں تھا......

امی ابو نے بہت سمجھایا.....

سب کی باتوں کا ایک ہی جواب دیا "ایسا کرنا ضروری تھا....

وہ

خود بھی دیکھتی رہی

لیکن

نہ تو ساس اسے لینے آئی نہ ہی احمد..... ایک دفعہ پیغام آیا بھی تو یہ کہ گھر کو گھر سمجھتی ہو..... تو جن قدموں سے چل کر گئی ہو انہیں سے واپس آجاؤ....

وہ نہیں گئی.....

اب تک نہیں گئی۔ میکے ہی بیٹھی ہے..... کوئی اسے لینے نہیں آیا.... کسی نے منانے کی ضرورت نہیں سمجھی......

ہاں

کچھ ہی ماہ بعد طلاق نامہ آگیا.....

وہ تو.....سسرال میں اپنی شہ زوری دکھا رہی تھی.....شعوری اور لاشعوری طور پر.....اس لیے کہ احمد کو ہتھیار ڈال دینے والی بزدل عورتیں پسند نہ تھیں.....گھر چھوڑ کر بھی تو وہ اسی لیے آئی تھی.....

اب وہ سوچ نہیں پاتی.....دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔

عورت کتنی کمزور ہے.....

صرف یہی احساس باقی ہے.....

یک نہ شد دو شد

رشتے تو آتے تھے۔ لیکن شاہینہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی حسرت پوری نہ ہوتی جو بھی رشتہ آتا شاہینہ کی بجائے چھوٹی بہن رومینہ کو دیکھ کر اس کے لیے دامن پھیلا دیتا۔ دونوں بہنوں میں فرق بھی تو بہت تھا۔ رومینہ جتنی خوبصورت اور پُرکشش تھی شاہینہ اتنی ہی بدصورت۔ صرف رنگ ہی گورا ہوتا تو شاید ظاہری حسن دیکھنے والی آنکھیں اسے پسند کر لیتیں۔ لیکن اس کا تو رنگ بھی بے رنگ تھا۔ بچپن میں ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ کسی ناسمجھ ڈاکٹر نے جانے کونسی دوائی دے دی تھی جس سے رنگ ایک سا نہیں رہا تھا۔ چہرے پر تو دھبے نمایاں ہو گئے تھے ماتھے کا کچھ حصہ خاصہ کالا تھا۔ گالوں پر سانولاہٹ تھی۔ ٹھوڑی پر گلابی گلابی جھلک رہتی تھی۔ رنگ کا یہ عالم اور اس پر چہرے کے بھدے نقوش ناک موٹی، دہانہ چوڑا، آنکھیں باہر کو نکلی ہوئیں، آنکھ میں بھی تھوڑا فرق تھا۔ ایک خاصی بڑی اور باہر کو نکلی تھی۔ دوسری قدرے چھوٹی تھی۔ قد درمیانہ تھا۔ جسم قدرے فربہی مائل۔ جب تک پڑھ رہی تھی۔ خاصی سمارٹ لگتی تھی ڈھنگ کے سلے کپڑے پہنتی تو جسم اچھا ہی نظر آتا چاک و چوبند رہتی تھی تو جوانی کی تازگی کا کچھ نہ کچھ اثر چہرے پر بھی نظر آتا تھا۔

لیکن

بی اے کے بعد جب سے گھر بیٹھی تھی تو بہت سست اور کاہل ہو گئی تھی۔ پہروں چارپائی پر پڑی رہتی کسی کام کو ہاتھ لگانے کو جی نہ کرتا۔

امی اس کی وجہ سے بہت متفکر رہتیں۔ ابا بھی پریشان ہوتے۔ دونوں اس کے متعلق

اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔

"خاندان میں کوئی بھی تو ایسا نہیں" امی گہری سانس لے کر کہتیں "خدا جانے کس پر چلی گئی ہے۔ ناک نقشہ تو جیسا تھا رنگ ہی برابر کا رہتا اسے دیکھتی ہوں تو دل ہول جاتا ہے"

"اس بیچاری کا کیا قصور" ابا دکھ سے کہتے "خدا کے کام ہیں نا"

"خدا کے کام تو ہیں۔ لیکن بندے کب یہ سوچتے ہیں کتنے رشتے آئے کوئی بھی اس کا طلب گار نہیں ہوا۔ خدا نخواستہ دل میں ہو تو تھام لے نا کوئی اس کا ہاتھ۔ شکل وصورت کے علاوہ کس چیز کی کمی ہے۔ نیک ہے شریف ہے، پڑھی لکھی ہے، گھر کا طریقہ سلیقہ جانتی ہے۔ سوئی سلائی میں ماہر ہے۔ اتنے اچھے کپڑے سیتی ہے کہ درزی بھی نہ سی سکے مجھے تو ڈر لگتا ہے ڈپریشن میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ سب رومینہ ہی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ اسے جس طور نظر انداز کیا جاتا ہے، اس کی عزت نفس کتنی مجروح ہوتی ہے۔ پھر بھی میں سوچتی ہوں بڑی بہادر ہے میری بچی۔ کبھی اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتی"

"شاہینہ نے کہا ایم اے میں داخلہ لے لے، دو سال تو با آسانی گزر جائیں گے"

"کہا تھا میں نے"

"پھر"

"کچھ ڈھنگ کا جواب نہیں دیا، کہتی ہے اب گھر بیٹھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ پڑھنے کو جی نہیں کرتا"

"ہوں"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کی وجہ سے رومینہ کا بھی کہیں طے نہیں کر سکتے رشتہ۔ یہ نہ ہو وقت گزر جائے اور رومینہ بھی بیٹھی رہ جائے رومینہ بھی اس سال بی اے کر لے گی"

"حوصلہ رکھو۔ خدا بہتر کرے گا"

"وہی کرنے والا ہے۔ ان ہونی کو ہونی بھی کر دیتا ہے"

دونوں اکثر اس موضوع پر ایسی ایسی باتیں ہی کرتے رہتے۔

رومینہ اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ امتحان قریب تھے۔ بڑے زور شور سے تیاریوں میں لگی تھی۔ وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ کتاب گھٹنوں پر رکھی تھی۔ بے دھیانی میں وہ اپنی لٹ کو انگلی پر لپیٹتی اور کھولتی تھی۔

شاہینہ بیڈ کے چوبی تکیئے سے سر ٹکائے دراز تھی۔ پاؤں پر پاؤں چڑھا رکھا تھا جسے ہلائے جا رہی تھی۔ کھڑکی کے قریب بیٹھی رومینہ کو دیکھتے ہوئے وہ اپنا موازنہ اس سے کر رہی تھی۔ زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ فرق اسے اندر ہی اندر مجروح کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، کاش وہ رومینہ کی طرح ہو جائے۔ اور یوں بھی سوچ رہی تھی، کہ اگر وہ رومینہ کی طرح نہیں ہو سکتی۔ تو رومینہ ہی اس کی طرح ہو جائے۔

تاکہ

کوئی رشتے کا طلب گار اسے نظر انداز کر کے رومینہ کا ہاتھ نہ مانگے وہ الٹی سیدھی سوچوں میں حسب معمول گم تھی، کہ رومینہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹایا باہر دیکھتے ہی بولی۔

"چھوٹی خالہ آ رہی ہیں"

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے شاہینہ سے بولی۔

"چھوٹی خالہ آ رہی ہیں۔ اٹھو نا"

"میں کیا کروں گی"

"شاہینہ"

"جاؤ تم ..... کوئی خوشخبری لائی ہوں گی تمہارے لیے"

"میرے لیے، خوشخبری....."

"ہاں تو..... چھوٹی خالہ آج پھر کسی رشتے کی نوید لے کر آئی ہوں گی۔ جو آئے گا اور تمہیں پسند کر.....؟"

"شاہینہ....."

"غلط تھوڑا ہی کہا ہے میں نے، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کیا۔ آئے لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں اور پسند تجھے کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"اس میں، اس میں میرا کیا قصور"

"میں کب کہتی ہوں تمہارا قصور ہے، قصور تو میرے اس تھوبڑے کا ہے۔ کسی وقت تو جی چاہتا ہے کاٹ کر اُتار پھینکوں"

"شاہینہ"

رومینہ کی گھبراہٹ پر شاہینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی

"اس طرح مایوس ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ شاہینہ ہماری شکلیں خدا نے ہی بنائی ہیں۔ اب میری صورت کچھ اچھی ہے اور لوگ تمہیں پسند کرنے کی بجائے مجھے پسند کر جاتے ہیں۔ تو میں کیا کروں۔ میں تو یہی کر سکتی ہوں نا..... کہ....."

"کہ کیا؟"

"یہی کہ دل میں عہد کر لیا ہے۔ کہ جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے گی۔ میں اپنی شادی کا نام بھی لینے نہ دوں گی"

"میری شادی کا نام بھی لینے نہ دو گی۔"

"میری شادی کبھی ہو ہی نہ، تو تم بھی بیٹھی رہو گی"

"بالکل بیٹھی رہوں گی"

"یہ کہنے کی باتیں ہیں۔ امی تو سوچ رہی ہیں کہ اب میری شادی کا خیال ہی ذہن سے

نکال دیں۔ اور جو اچھا رشتہ آئے تمہارے لیے ہاں کر دیں"

"نہیں، میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی شاہینہ..... تم میری بڑی بہن ہو، مجھے بہت عزیز ہو، تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں"

"سچ"

"جھوٹ کیوں کہوں گی"

"میری اچھی بہن معاف کر دینا۔ میں کسی کسی وقت بہت چڑچڑی ہو جاتی ہوں"

رومینہ نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور بولی "اس کھوپڑی میں رکھا دماغ اُلٹ جاتا ہے"

دونوں باتیں کر رہی تھیں، کہ چھوٹی خالہ کی بیٹی انجو اندر آ گئی۔ موضوع گفتگو تھوڑی دیر کے لیے بدل گیا۔

چھوٹی خالہ ایک رشتے ہی کے سلسلے میں آئی تھیں۔ کئی رشتے پہلے بھی ان کے توسط سے آچکے تھے۔ جنہوں نے رومینہ ہی کو پسند کیا تھا، اور بہ امر مجبوری انہیں نہ کرنا پڑی تھی۔ آج بھی جو رشتہ لائی تھیں خاصہ معقول تھا لڑکا بنک میں آفیسر تھا گھر بار اچھا تھا باپ کی بزنس اچھی خاصی تھی۔

خالہ امی کو رشتے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ جسے وہ سنی ان سنی کر رہی تھیں۔

"آپا، بہت اچھے لوگ ہیں"

"لیکن....."

"آنے تو دو نا انہیں"

"آ کر کیا کریں گے۔ یہی نا کہ شاہینہ کی انا کو مجروح کر کے رومینہ کو پسند کر لیں گے"

"آپا، میں سوچ رہی ہوں"

”کیا؟“

”ہم لوگ بھی تو نرے گاؤدی ہیں“

”وہ کیونکر.....؟“

”اتنے رشتے آئے، شاہینہ اور رومینہ کا موازنہ نہ کیا۔ اور بڑی کو رد کر کے چھوٹی کو پسند کیا“

”ہوں.....“

”رومینہ کو سامنے لانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ رومینہ لوگوں کو دکھاتے ہی کیوں ہیں ہم“

”واقعی“

”ظاہر ہے رومینہ خوبصورت ہے۔ شاہینہ کے ساتھ جو بھی اسے دیکھے گا۔ اسے ہی پسند کرے گا“

”یہ تو ہے.....“

”آپا، یہ رشتہ آنے دیں۔ رومینہ کو اس دن میرے گھر بھیج دیں۔ نہ گھر پر ہوگی نہ اسے کوئی دیکھے گا..... اور..... شاہینہ کو میں خود ہی بناؤں سنواروں گی۔ اس دن“

”ہونہہ.....“

”کیوں آپا.....“

”نام تو لو اس کے سامنے، بدتمیزی پہ اُتر آئے گی دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو رشتے کے نام سے الرجک ہے اس نے کہہ دیا ہے کہ وہ اب کسی کے سامنے تماشہ بننے کو تیار نہیں ہوگی“

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں اسے راضی کر لوں گی۔ میری بات مان لیتی ہے“

”کر کے دیکھو بات.....“

”کر لوں گی، بس یہ فیصلہ کہ جس دن وہ لوگ اسے دیکھنے آئیں گے، رومینہ گھر پہ نہیں

ہو گی“

”ٹھیک ہے تمہارے ہاں چلی جائے گی“

”وہ ہے کہاں“

”ادھر اپنے کمرے میں ہیں دونوں۔ انجو ادھر ہی گئی ہے“

چھوٹی خالہ اُٹھیں، اور ان کے کمرے کی طرف چل دیں“

ہمیشہ کی طرح آج بھی پرتکلف چائے کا اہتمام کیا گیا تھا امی کچن میں تھیں اور چودہ پندرہ سالہ ملازمہ لڑکی پکو کو ٹرالی لگانے میں مدد دے رہی تھیں۔

کیک پیسٹری چاٹ پیٹیز شامی کباب اور جانے کیا کچھ طشتریوں میں سجا رکھا تھا۔

”بس اب وہ لوگ آنے ہی والے ہیں۔ ڈرائنگ روم تو ٹھیک ٹھاک ہے نا“

”ہاں صفائی تو خوب اچھی طرح کی تھی“

”دعا کرو۔ آج شاہینہ کا رشتہ ہو ہی جائے“

”رومینہ تو خالہ کے ہاں صبح ہی چلی گئی تھی“

”دیکھیں آج کیا ہوتا ہے۔ دل دھک دھک کر رہا ہے“

امی کچن میں پکو کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں اور چھوٹی خالہ شاہینہ کو تیار کر رہی تھیں۔ شاہینہ کو بڑے جتنوں سے انہوں نے آمادہ کیا تھا۔

”چھوٹی خالہ..... صرف آپ کی خاطر میں ان لوگوں کے سامنے اپنی تذلیل کروانے جاؤں گی۔ لیکن یاد رکھیں۔ یہ آخری بار ہوگی..... آئندہ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں جاؤں گی مجھے نہیں کرنا شادی“

”چلو آج تو موڈ ٹھیک کرو۔ آج ہی کام بن جائے گا۔ دیکھ لینا“

”چھوٹی امیدیں نہ باندھا کریں خالہ۔ خاص کر امی کو جھوٹا یقین نہ دلایا کریں انہیں بہت

دکھ ہوتا ہے۔‘‘

’’مایوسی کی باتیں کرتی اور سوچتی ہو نا۔ اسی لیے تمہارے چہرے پر چمک نہیں ہوتی، نا اُمیدی کا دھواں پھیلا ہوتا ہے۔‘‘ میری جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں۔

’’حقیقت کا سامنا کرتی۔ دلیری سے۔‘‘

’’کہنے کی باتیں ہیں خالہ۔‘‘

’’بس اب چھوڑو ان باتوں کو، اور ہاں دیکھو۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ان لوگوں کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھنا، چائے کی ٹرالی لے کر آنا اور سلام کر کے تھوڑی دیر بعد چلی جانا۔‘‘

شاہینہ تمسخر سے ہنسی اور بولی ’’بہت اچھا۔ لیکن خالہ تھوڑی یا زیادہ دیر کا تو سوال ہی نہیں پہلی نظر ہی میں لوگ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔‘‘

’’شاہینہ..... پلیز..... ایسی باتیں نہیں کرو۔ چپ ہی رہو تو اچھا ہے۔‘‘

’’بہت اچھا۔‘‘

’’شاباش۔‘‘

گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ خالہ بولی ’’لو آگئے وہ لوگ، میں جاتی ہوں۔‘‘

’’شاہینہ نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ خالہ کمرے سے چلی گئیں۔ تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ آئینے نے منہ چڑایا تو وہ ایک دم پرے ہٹ گئی۔ اسے خالہ اور امی پر بے طرح ترس آیا۔ کس کس جتن سے وہ رشتہ کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ پلنگ کی پٹی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی کتنی ہی دیر سوچوں میں گم رہی۔ پھر پکو کمرے میں آگئی۔

’’شاہینہ باجی‘‘ وہ بولی۔

’’ہوں‘‘

’’چلیں آئیں۔‘‘

اس کا جی چاہا جانے سے انکار کر دے۔ ہونا تو وہی تھا جو اب تک ہوتا آیا تھا آئینے نے اس کے ماتھے پر ’’ناپسند‘‘ کا لیبل لگا دیا تھا۔

پکو نے پھر کہا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کر اس کے ساتھ کچن میں آگئی۔

ہر چیز تیار تھی

اس نے ٹرالی پکڑی۔ پکو اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ پردہ ہٹایا اور وہ ٹرالی ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

اک اچٹتی سی نگاہ مہمانوں پر ڈالی سلام کیا اور ٹرالی خالہ کے سامنے کرتے ہوئے وہ اسی انداز میں بیٹھ گئی۔ جس میں بیٹھنے کے لیے خالہ نے سمجھایا تھا۔

دو عورتیں اور ایک نوجوان لڑکی تھی۔ فربہ سی عورت شاید لڑکے کی ماں تھی۔

شاہینہ کو اس نے دو تین بار سر سے پاؤں تک تنقیدی نظروں سے دیکھا دوسری عورت کی سرسری سی نگاہ اس پر پڑی تھی اور نوجوان خوبصورت لڑکی نے تو شاید اسے اندر آتے ہی دیکھ پرکھ لیا تھا۔ اس لیے دوبارہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔

امی کا دل بیٹھنے لگا۔ خالہ پر بھی مایوسی طاری ہوئی۔ خود شاہینہ کا جو حال تھا۔ وہ اظہار کا محتاج نہیں تھا۔ کسی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔

خالہ بے دلی سے چائے بنانے لگی۔

شاہینہ وہاں سے اُٹھ آئی۔

اس کے جانے کے بعد فربہ عورت نے امّی سے پوچھا "یہ آپ کی بڑی بیٹی ہے"

"جی۔ جی ہاں"

"دو بیٹیاں ہیں نا آپ کی"

"جی....."

"دوسری کیسی ہے؟"

"کیا مطلب"

"میرا مطلب ہے۔ دوسری کا رنگ ڈھنگ ناک نقشہ کیسا ہے"

امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالہ جلدی سے بولیں "بہنیں ہیں دونوں۔ ملتی جلتی ہی ہیں"

نوجوان لڑکی جلدی سے بولی "لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ آپ کی ایک بیٹی بہت خوبصورت ہے"

تیسری عورت بولی "ذرا اسے بلا دیں گے؟"

"وہ گھر پہ نہیں ہے" امی مری مری آواز میں بولیں تو تینوں مہمان عورتوں نے ایک دوسری کو بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا۔ نفی کے اشارے خالہ نے دیکھے تو چائے بناتے بناتے ان کا ہاتھ رک گیا۔

"آپ کو معلوم تو تھا" فربہ عورت نے خالہ سے کہا۔

"کیا....."

"کہ ہم آج رشتہ دیکھنے آ رہے ہیں"

"پھر....."

"دوسری بچی کو گھر پہ ہی رکھا ہوتا۔ اسے بھی دیکھ لیتے"

خالہ غصہ دباتے ہوئے بولیں "ہم نے جس کا رشتہ کرنا ہے اسے آپ کو دکھا دیا۔ منظور نہیں ہے۔ تو تشریف لے جائیے"

"آپ تو برا مان گئیں" لڑکی مسکراتے ہوئے بولی "ہمیں تو بھائی جان کی نظر سے لڑکی کو دیکھنا ہے۔ انہیں خوبصورت بیوی چاہیے"

امی کے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی۔ آنکھوں میں نمی آ گئی۔ فربہ عورت نے چور سی نظروں سے انہیں دیکھا پھر معذرتانہ انداز میں بولی "بہن معاف کرنا..... میرا کوئی اختیار نہیں۔ میرے بیٹے کی صرف ایک ہی شرط ہے، کہ لڑکی خوبصورت ہو۔ داج جہیز کی بالکل ضرورت نہیں۔ ہم نے سنا تھا آپ کی بیٹی بڑی خوبصورت ہے۔ اسی لیے آ گئے تھے"

خالہ کا چہرہ لال بھبوکا تھا۔ بڑی مشکل سے غصہ دبا رہی تھیں۔ معاملہ بدمزگی بن گیا تھا۔ اس لیے ان عورتوں نے چائے کی ایک ایک پیالی بمشکل حلق سے اتاری۔ اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں ان کے جانے کے بعد شاہینہ نے اتنے طنز ایسے تمسخر سے قہقہے لگائے کہ خالہ اسے سینے سے لگا کر بے اختیار ہو کر رو دیں۔

رومینہ نے ایم اے میں داخلہ لے لیا وہ اپنے عہد پر مضبوطی سے جمی تھی۔ ان دنوں دو بڑے اچھے رشتے آئے تھے امی ابا کا خیال تھا کہ اس کا رشتہ طے کر دیں۔ لیکن

اس نے صاف جواب دے دیا تھا "جب تک شاہینہ کی شادی نہیں ہو جاتی میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

امی بڑے دکھ سے بولیں "وہ نصیبوں جلی بیٹھی رہے گی۔ تو، تو بھی باپ کی دہلیز نہ چھوڑے گی"

"بالکل، امی شاہینہ بھی آپ کی اسی طرح بیٹی ہے جس طرح میں ہوں"

"اس کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس کے نصیب میں شادی کا جوڑا شاید ہے ہی نہیں"

"پھر یہی سمجھ لیں کہ میرے نصیب میں بھی شادی کا جوڑا نہیں ہے۔ امی۔ آپ اسے اور دکھی کرنا چاہتی ہیں۔ بیچاری نے پہلے کچھ کم دکھ جھیلے ہیں شادی کے بغیر بھی زندگی گزر سکتی ہے۔"

اس دن چھوٹی خالہ آئیں۔ تو امی نے ان سے کہا۔ چھوٹی خالہ ہی تھیں جو ان کے دکھ میں برابر کی شریک تھیں معاملے کو سمجھتی تھیں۔ شاہینہ کی شادی کروانے کے لیے جو کچھ ان سے بن پڑتا تھا کرتی تھیں۔ وہ تو بڑے خلوص سے کہا کرتیں "کاش میرا کوئی بڑا بیٹا ہوتا میں اپنی جان سے پیاری بھانجی کو سارے دکھوں دھڑکوں سے بچا لیتی۔"

"کیا کروں رفعیہ" امی نے ان سے کہا "معقول رشتے ہیں۔ رومینہ نام ہی لینے نہیں دیتی۔ ایک وقت آئے گا کہ اچھی شکل وصورت کے باوجود اس کا بھی کوئی طلب گار نہیں رہے گا۔ اس وقت تو رشتے ہیں"

خالہ رشتوں کی تفصیل پوچھنے لگیں۔

ایک انجنیئر تھا۔ دوسرے کی اچھی خاصی بزنس تھی۔ تعلیم ایم بی اے تھی دونوں کی مالی حالت مستحکم تھی انجنیئر کے ماں باپ اور چار بہن بھائی تھے جو بال بچوں والے تھے اس پر کسی کا بار نہیں تھا۔

خالہ بولیں "یہ دوسرا رشتہ اچھا ہے۔ ایک اکیلا ہی سمجھیں۔ ذاتی کوٹھی بھی بنوالی ہے یہی بتایا نا آپ نے۔"

"ہاں......"

"رشتے کے لیے کون آیا تھا۔"

"اس کی بڑی بھابی اور رشتہ کروانے والی۔"

"رومینہ کا ہاتھ مانگا......"

"تو اور کس کا مانگ سکتے تھے۔"

خالہ نے کچھ سوچا اور بولیں "شادی کب تک کریں گے۔"

"وہ تو ہاں کرنے پر ہی شادی کی تاریخ لینا چاہتی ہیں۔ لڑکے کی اس بھابی نے شاید کویت جانا ہے۔ اگلے ماہ اس لیے شادی جلدی کرنا چاہتی ہیں"

"تو بس ٹھیک ہے۔ آپ ہاں کر دیں۔"

"ہاں کر دوں......"

"بالکل......"

"پکّی......"

"آپا......ایک اکیلا لڑکا ہے۔ ذاتی کوٹھی ہے آمدنی بھی معقول ہو گی۔ لڑکے کا کردار بھی اچھا ہی ہو گا۔ متوسط طبقے کے اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونے والے لڑکے اچھے کردار ہی کے ہوتے ہیں۔ آپ میری مانیں رشتے کی بات چلائیں۔ ایک نظر میں بھی دیکھ لوں گی لڑکے کو۔ سب پتہ چل جائے گا کہ کیسا ہے۔"

"لیکن رفو...... رومینہ تو مانتی نہیں"

"میں کب کہتی ہوں وہ مانے۔"

"پھر......"

"پھر...... پھر یہ کہ......" خالہ چند لمحے رکیں۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

"ہم رومینہ کی جگہ شاہینہ کی شادی کر دیں گے۔"

"کیا...... کیا مطلب ہے۔"

"اس کے سوا چارہ ہی نہیں آپا...... شاہینہ ساری عمر بھی بیٹھی رہے تو کوئی اسے پسند کرنے نہیں آئے گا۔"

"تو...... تم"

"میں نے یہی سوچا ہے۔ پسند انہوں نے رومینہ کو کیا ہے۔ ٹھیک ہے رشتہ طے......"

شادی رومینہ کی بجائے شاہینہ کی ہو گی۔"

"تیرا تو دماغ اُلٹ گیا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے اور پھر یہ تو دھوکہ دینے والی بات ہے۔"

"مجبوری ہے۔"

"انجام کیا ہو گا۔"

"اس کا بھی سوچ لیں گے۔ ایک بار شاہینہ دلہن بن کر اس گھر سے رخصت ہو جائے۔"

"اور دوسرے دن ہی طلاق کے کاغذ لے کر پلٹ آئے۔"

"اس کا بندوبست بھی کر لیں گے۔ شاہینہ کا حق مہر اتنا لکھوا لیں گے کہ طلاق دینے سے پہلے لڑکے کو سو بار سوچنا پڑے۔"

"بالکل بے وقوفوں سی باتیں کر رہی ہو۔"

"کبھی کبھی بے وقوف بھی بڑی عقل مندی کی بات کر جاتے ہیں آپا۔ آپ میری بات مان جائیں۔"

"دھوکے سے شادی کر دوں۔"

"دھوکہ نہیں مصلحت ہے یہ۔"

"نا بابا۔"

"آپ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ شاہینہ کی قسمت اچھی ہوئی تو یہ سکیم کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ آپا یہ شکل و صورت شادی سے پہلے کی باتیں ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کا اخلاق کردار اور عقل و دانش کام آتی ہے اور میں جانتی ہوں شاہینہ میں ان چیزوں کی کمی نہیں۔"

امی چپ ہو گئیں۔ خالہ بولیں "آپ ہر جتن کر چکیں۔ اب یہ کر دیکھتے ہیں۔ یہ بات کسی کے کانوں میں نہ پڑے۔"

"شاہینہ کے ابو مان جائیں گے۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"اور..... شاہینہ.....۔"

"کہا نا آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"تم اَن ہونی باتیں کر رہی ہو۔"

"اَن ہونی ہو جائے گی آپا..... آپ رشتے کی بات آگے بڑھائیں بس۔ کسی دن لڑکے کو دیکھنے چلیں گے۔"

امی کے انکار کے باوجود چھوٹی خالہ نے رشتے کی بات بڑھا دی۔

شاہینہ نے سنا تو غصے سے جل بھن کر خالہ کو جلی کٹی سنا ڈالی۔ جسے اس نے بڑے تحمل سے برداشت کر لیا۔ شاہینہ کے ابو کو بھی بڑے دن کی بحث و تمحیص کے بعد چپ کرا لیا کہ یہ قدم دھوکہ نہیں مصلحت کے تحت اٹھانا پڑا ہے۔ شاہینہ کی شادی اور کسی طور ہو ہی نہیں سکتی۔

"لیکن خالہ..... اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

"اپنی طرف سے اک کوشش ہی ہے نا۔ انجام تقدیر پر چھوڑ دیتے ہیں۔ شاہینہ کی تقدیر نے ذرا بھی ساتھ دیا تو بات بن جائے گی۔ اب ایسا بھی کوئی بے رحم نہیں ہوتا کہ لڑکی کو صرف اس وجہ سے طلاق دے دے کہ اس کی شکل اچھی نہیں۔ ویسے بھی ہم ہاتھ اوپر رکھیں گے۔ لڑکے والے رضامند ہیں کہ جتنا ہم چاہیں مہر لکھوا لیں۔"

"لیکن شاہینہ اب تک نہیں مان رہی۔"

"تم اور میں کس لیے ہیں۔"

"خالہ آپ تو لڑکا بھی دیکھ آئیں۔ کہتی ہیں، خاصی اچھی شکل کا ہے۔"

"ہے تو....."

"پھر سوچ لیں۔"

"سب سوچ لیا ہے۔ شادی جوا ہی تو ہوتی ہے۔ ایک بار کھیلنے کا موقعہ تو ملے شاہینہ کو"

"خدا کرے میری بہن کا گھر آباد ہو جائے"

"آمین......"

بیوٹی پارلر سے آئی عورت نے خالہ کی ہدایات کے مطابق شاہینہ کا چہرہ پینٹ کیا۔ رنگ اور داغ دھبے بڑی حد تک چھپ گئے۔ ماتھے پر جھومر ناک میں نتھ کانوں میں بڑے بڑے جھالردار آویزے۔ گردن میں گلوبند اور دوسرے ہاروں کے ساتھ پھولوں کے ہار۔ چہرہ تو چھپ کر ہی رہ گیا۔ چمک دمک ہی نظر آتی تھی خالہ یہی چاہتی تھیں۔ بھاری کامدانی ڈوپٹے نے تو دست رحمت کی طرح چہرے کے سارے عیوب ڈھانپ لیے تھے پھر خالہ نے شاہینہ کو جس طرح سر اور آنکھیں جھکائے رکھنے کا کہا تھا۔ نئی دلہن کا یہ خاصہ تھا شاہینہ کے لیے بڑا کارآمد۔

شاہینہ رُخصت ہوئی۔ تو امی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ ابو بند کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے خالہ کا دل بھی حلق میں اٹکا رہا۔ اور رومینہ شاہینہ کے لیے رو رو کر خدا سے دعائیں کرتی رہی۔

شاہینہ سراج کی نئی کوٹھی میں اُتری دونوں بھابیوں نے ماسٹر بیڈ روم کو آراستہ پیراستہ کر دیا تھا۔ شاہینہ کے جہیز کا سارا سامان بھی یہیں پہنچایا گیا تھا۔

شاہینہ کو حجلۂ عروسی میں پہنچا کر وہ اس کا سامان ٹھکانے پہ رکھنے میں لگ گئیں شاہینہ کا دل کبھی تو اچھل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔

سراج چند لمحے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر خاموش کھڑا رہا۔ کئی لمحے بیت گئے۔ یہ لمحے شاہینہ کو بے موت مار گئے۔

پھر

وہ بیڈ کے قریب آیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ تذبذب کی کیفیت سے دوچار رہا۔ بڑی کاوشوں کے بعد اس کے منہ سے آواز نکلی۔ اس نے شاہینہ کو سلام کیا۔

شاہینہ مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھی رہی۔

خاموشی ایک بار پھر چھا گئی۔ شاہینہ مر مر کے جیتی اور جی جی کر مرتی رہی۔

سراج نے ایک بار پھر گلا صاف کرنے کو کھنکارا۔ بیڈ کے اور قریب آ گیا۔ شاہینہ کی اس طرف پشت تھی۔ وہ ہولے سے بولا... "میں..... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

شاہینہ کا دل جیسے واقعی تھم گیا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اور سارا جسم بے جان سا ہو گیا۔

وہ جھجکا..... رُکا..... پھر بولا "بھابی سے پتہ چلا تھا کہ آپ..... آپ..... بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن..... میں....."

"ج..... ج..... جی....." مری ہوئی آواز شاہینہ کے ہونٹوں سے نکلی۔ جیسے سراج نے سنا ہی نہیں۔ وہ ہمت اور جرأت کر کے بولا "میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں...... بہت بدصورت آدمی ہوں۔ کوئی لڑکی یا اس کے والدین مجھ سے ناطہ جوڑنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ بھابی نے آپ لوگوں کو دھوکے میں رکھا۔ میری جگہ اپنے بڑے بیٹے کو آپ کے گھر والوں کو دکھایا۔ میں نے بہت چاہا کہ شادی سے پہلے یہ حقیقت آپ لوگوں پر واضح کر دوں۔ لیکن دونوں طرف سے اتنی جلدی تھی کہ کسی نے میری سنی ہی نہیں"

شاہینہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے کیا کرے۔

سراج بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا..... "میں تعلیم یافتہ ہوں۔ شریف ہوں۔ معقول آمدنی ہے۔ یہ کوٹھی میری ہے...... اور..... اور...... بدصورت ہونے کے باوجود...... آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل بہت خوبصورت ہے....."

"دل تو... تو میرا بھی بہت خوبصورت ہے...." شاہینہ کے لبوں سے الفاظ خود بخود پھسل گئے۔

"جی....." سراج جلدی سے آگے کو جھک کر بولا۔

شاہینہ نے جانے کیسے حوصلہ پایا آہستگی سے بولی "بدقسمتی سے میں بھی خوبصورت نہیں ہوں۔ مجھ سے بھی کوئی ناطہ جوڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ میری امی اور خالہ نے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا۔ کہ آپ کے گھر والوں کو دکھایا میری بہن کو..... اور شادی کر دی، میری"

شاہینہ نے ایک دم ہی اپنا گھونگھٹ اُلٹ کر چہرہ گھما کر سراج کے سامنے کر دیا۔ سراج کا چہرہ اچھا خاصہ بھیانک تھا۔ اس کے منہ سے شاید چیخ نکل جاتی لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال آگیا۔ وہ بھی تو انتہائی بدصورت تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

دونوں ایک دوسرے کو صرف تکتے رہے۔

پھر سراج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

شاہینہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

سراج نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "چلو یہ بھی اچھا ہوا..... ورنہ میرا ضمیر ساری عمر مجھے کوستا رہتا"

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے شاہینہ کی طرف پُشت کیے بولا۔

"قدرت اپنا حساب برابر رکھتی ہے۔ ویسے مجھے بہت سکون ملا ہے اور ہاں...... آپ مجھے پسند نہ کریں..... میں نے آپ کو پسند کیا؟"

شاہینہ کچھ نہیں بولی۔ ہاں سراج کو گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز آئی تو وہ جلدی سے پلٹ کر اس کے قریب آیا۔

"آپ...... رو..... رہی..... ہیں" وہ اس کی پشت کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ..... یہ تشکر کے آنسو ہیں سراج....." شاہینہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

سراج کے بازوؤں کے گھیرے نے مضبوط تحفظ کا احساس دلا دیا۔

کیسے کیسے لوگ

گھر میں داخل ہوتے ہی بھابی نے اُسے بغل میں دبوچ لیا۔ اس اچانک حملے سے وہ بُری طرح بوکھلائی۔

بھجو..... بھا...... اس کے منہ سے بلند آواز نکلنے کو تھی کہ بھابی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مسکراتے ہوئے "شی" کہا یہ چپ رہنے کا اشارہ تھا۔

وہ بھابی کی بغل میں اسی طرح دبی گھستی ہوئی سامنے والے کمرے میں آگئی...... جہاں بھابی نے اسے چھوڑا اور وہ سیدھا کھڑی ہوسکی۔

بھابی نے خوشگوار مسکراہٹ آنکھیں نچاتے ہوئے کہا..... "وہ لوگ آئے ہیں....."

"وہ کون" اس نے گردن سہلاتے ہوئے بھابی کو پیار سے گھورا..... پھر خود ہی بولی۔

"جانے کون لوگ ہیں ان کی خاطر آپ نے تو میری گردن ہی مروڑ ڈالی....."

"تیرا پتہ جو ہوا.... گھر میں کیا داخل ہوتی ہے۔ سنگ سنگ طوفان لے آتی ہے۔ شور شرابا ہلا گلا تیری عادت جو ٹھہری....."

"سو تو ہے"

"اسی لیے میں نے دروازے ہی میں تجھے قابو کرلیا....."

"خالی بتا ہی دیتیں تو شاید میں چپ چاپ چلی آتی"

"تو اور چپ چاپ..... ہاہا..... بیلا رانی کیا میں تجھے جانتی نہیں....."

بیلا نے مسکرا کر بھابی کو دیکھا..... اس کے گال پر پیار کیا اور کتابیں پلنگ پر پھینکتے

ہوئے دھم سے بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی...... وہ کچھ کہنے ہی والی تھی...... کہ بھابی نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے روک دیا

"آج کوئی قصہ وصہ نہیں سننا مجھے..... بس جلدی سے کپڑے بدل ہاتھ منہ دھو اور بال بنا لے....."

"یہ سب کیوں؟"

"بیلا تمہیں وہ لوگ دیکھنے آئے ہیں....."

"تو دیکھ لیں....."

"ہائے اللہ..... تیرا تو مغز ہی خراب ہے کچھ سمجھتی ہی نہیں....." بھابی نے ماتھے ہتھیلی ماری...... بیلا اسے ستانے کو بالکل ہی انجان بنتے ہوئے بولی..... "آخر کون ہیں وہ....."

"وہی....."

"وہی کون"

"بھئی وہی...... جو تمہارے رشتے کے لیے....."

"اچھا......"

"جان گئی اب تو....."

"ہوں......"

"بڑا اصرار کر رہے ہیں......"

"ہوں......"

"بھئی بہت ہی بھلے لوگ ہیں......"

"بھلے کیسے؟......"

"ہیں نا....."

"مجھے آپا کے ولیمے پر دیکھا اور لٹو ہو گئے..... بھلے کیسے ہوئے؟"

"بھابی ہنس کر بولی....." بھلے ایسے کہ بیٹے کی فرمائش ٹال نہیں گئے..... اس نے تمہیں دیکھا پسند کیا....."

"ہائے بھابی....." بیلا ہڑبڑا سی گئی......

"ہاں بیلا..... لڑکے نے تجھے انیلا کے ولیمے پر دیکھا..... شہریار کا دوست ہے وہ..... اس کی بارات پر بھی یہاں آیا تھا....."

"بارات میں آیا تھا....."

"ہاں....."

"تب نہیں دیکھا تھا مجھے....."

"نہیں دیکھا ہوگا..... وہ لوگ یہی کہتے ہیں تمہیں ولیمے پر دیکھا۔ تم نے شاید اس کی می کو کھانا بھی پلیٹ میں ڈال کر دیا تھا....."

"ہاں بھابی..... کھانے کی میزوں پر لوگ پل پڑے تھے..... وہ بیچاری ہاتھ میں پلیٹ لیے کھڑی تھیں..... میں نے ان کے لیے کھانا پلیٹ میں نکالا..... ان کے لیے کرسی سیدھی کی..... سامنے میز رکھی اور پانی کا جگ اور گلاس لا کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "آنٹی کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے دیجئے گا ویسے میں تھوڑی دیر کے بعد خود بھی [illegible] کرتی رہوں گی....."

"وہ بولیں" تمہارا نام کیا ہے بیٹا....."

"بیلا" میں نے جواب دیا..... اور..... اور اسی وقت ان کا وہ بیٹا..... وہی بھابی..... آ گیا..... میں تو گھبرا کر شرما کر بھاگ اُٹھی..... مجھے کیا پتہ تھا..... وہ..... وہ میرے گھر تک پیچھا کرے گا میرا....."

"خوش بخت ہو بیلا..... اتنا اچھا رشتہ ہے اتنے اچھے لوگ ہیں اور اتنے خلوص سے

رشتہ مانگنے آئے ہیں..... باوجود اس کے....."

"کہ انہیں آنے میں منع کر دیا گیا تھا....."

"بالکل"

"پھر بھی آ گئے"

"تیرا نصیبہ کھینچ لایا....."

"پکے ڈھیٹ لگتے ہیں....."

"ڈھٹائی کریں گے تو رشتہ ملے گا ورنہ..... امی ابو تو....."

"وہی خیال وہی ارادہ.....؟"

"ہاں..... امی تو ان کے آنے پر خاصی جز بز ہوئیں..... وہ تو میں نے ہی سمجھایا بجھایا..... ورنہ وہ تو ڈرائنگ روم میں بھی نہیں جا رہی تھیں....."

"تت تت..... بیچارے لوگ..... وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی..... بھابی نے اس کا کان پکڑ کر اسے بیڈ سے اٹھایا اور غسل خانے کی طرف دھکیل دیا....." بس اب باتیں بند..... چھینٹا مار لے منہ پر..... اور ہاں بال بھی ٹھیک سے بنا لینا....."

"کیوں فٹنگ کروا رہی ہیں بھابی..... ہونا ہوانا کچھ نہیں..... ابو بڑے برہم تھے..... جب آپا نے یہ رشتے والی بات انہیں بتائی تھی....."

"مجھے پتہ ہے....."

"پھر مجھے تیار ہونے کو کیوں کہہ رہی ہیں....."

"دماغ چاٹ لے میرا جرح کر کر کے....." بھابی نے اسے گھرکا..... تو وہ باتھ روم میں گھس گئی..... بھابی وہیں کھڑی اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

بیلا کے لیے جو رشتہ آیا تھا ہر لحاظ سے موزوں اور اچھا تھا..... اچھا بھی کیا بہت ہی اچھا تھا..... بھابی کی دلی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے..... ایسے رشتے قسمت سے ہاتھ

لگتے ہیں۔

" لیکن دال گلتی نظر نہ آتی تھی..... گھر کے حالات ہی کچھ ایسے تھے۔

" بیلا احمد سعید کی تیسری بیٹی تھی..... بڑے بیٹے اور دو بڑی بیٹیوں کی شادیاں کر چکے تھے۔ متوسط طبقے کے آدمی تھے..... گریڈ افسر تھے۔ لیکن افسری کا بھرم بھی رکھنا مشکل ہو رہا تھا..... وہ تو بڑا بیٹا شادی کے بعد بھی ساتھ ہی رہتا تھا..... بہو اچھے گھرانے کی مل گئی تھی..... اس لیے باپ بیٹا مل کر گھرداری کا بوجھ اٹھا رہے تھے..... لیکن مہنگائی اتنی تھی..... کہ باپ بیٹا مل کر بھی بوجھ اُٹھا نہیں رہے گھسیٹ ہی رہے تھے بس بھرم بنا ہوا تھا۔

" بیٹے کی شادی چار سال پہلے ہوئی تھی..... خوش قسمت تھے بہو بہت اچھی مل گئی تھی۔ جہیز بھی خاصہ لائی تھی..... مل جل کر رہنے میں بھی مزاحم نہیں ہوئی تھی..... احمد سعید اور رابعہ کو ماں باپ سمجھا تھا..... بینا انیلا اور بیلا کو بہنیں..... بیلا سے تو بہت پیار کرتی تھی۔

" راشدہ کی شادی کے دوسرے ہی سال بینا کا رشتہ مل گیا..... احمد سعید اور رابعہ نے تاخیر نہیں کی جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی..... باپ بیٹے سے جو بن پڑا کیا..... اس شادی پر جو خرچہ اٹھا قابل برداشت تھا..... رابعہ جیسی سگھڑ سیانی عورت نے خاصہ جہیز جمع کر رکھا تھا..... احمد سعید نے بھی کچھ روپیہ جمع کر رکھا تھا..... جی پی فنڈ بھی تھا..... وہاں سے قرضہ لیا..... شادی کرنا تھی..... قرضے ورضے تو اُتر ہی جانا تھے.....

بینا اور انیلا کی شادی میں دو اڑھائی سال کا وقفہ تو آیا لیکن اس وقفے میں بمشکل کر ہی سیدھی ہوئی تھی..... جی پی فنڈ سے لیا پیسہ بھی ابھی پورا نہیں لوٹایا تھا..... چھوٹے موٹے قرضے راشد نے بھی اُتارے تھے.....

" لیکن خوش بختی یہ تھی کہ انیلا کے لیے بھی رشتہ بہت ہی اچھا مل رہا تھا..... لڑکا انجنیئر تھا..... فیملی مختصر اور کھاتی پیتی تھی..... پھر بڑے اصرار سے رشتہ مانگا جا رہا تھا۔

احمد سعید اور رابعہ نے حامی بھرنے سے پہلے اپنی مالی حیثیت ان پر واضح کر دی تھی۔

جواباً انہوں نے بڑے خلوص سے کہا تھا" آپ بالکل فکر نہ کریں..... ہمارا کوئی مطالبہ نہیں..... ہمیں صرف انیلا چاہیے..... جہیز کی فکر ہی نہ کریں..... آپ جو کچھ بھی دیں گے..... اپنی بیٹی کو دیں گے..... ہماری طرف سے بالکل بے فکر رہیں....."

انہوں نے اتنی تسلیاں دی تھیں..... کہ سب مطمئن ہو گئے تھے۔

احمد سعید رابعہ راشد اور عاصمہ سب ہی نے یہ رشتہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جہیز کے بارے میں سبھی متفکر تو تھے..... لیکن ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے۔

" عاصمہ نے کہا تھا کوئی بات نہیں..... شادی کے لیے چار چھ مہینے کی مہلت لے لیتے ہیں..... مطالبہ تو ان لوگوں کا کوئی ہے نہیں..... اپنی خوشی اور حیثیت سے ہی کرنا ہے نا سب کچھ....."

" پھر بھی عاصمہ بیٹی..... ہزاروں روپے درکار ہیں..... احمد سعید نے پریشان سا جواب دیا تھا....."

" بینا کے لیے تو خاصہ جہیز جمع کر رکھا تھا میں نے..... اس کے لیے تو چند جوڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں....." رابعہ بولی۔

" زیور تو ہے نا آپ کے پاس امی....." راشد نے کہا۔

" زیور بھی کونسا سو تولے ہے۔ یہی پانچ سات تولے رہ گیا ہے۔ بینا کو دیا نہیں تھا....."

" پہلے ہی حصّہ بخرا کر لیتیں..... بینا کو تو کافی سونا ملا....."

" پندرہ تولے تو ہو گا....."

" تینوں بیٹیوں کے لیے برابر کا رکھنا تھا....."

" چلو جو ہوا سو ہوا..... اب سوچو....."

" عاصمہ نے جھجکتے ہوئے کہا" میرے پاس کچھ روپیہ بھی ہے اور سونا بھی..... آپ

لے لیں۔۔۔۔ خدا نے چاہا تو میرے لیے پھر بن جائے گا۔۔۔۔۔"

" لیکن احمد سعید نہیں مانتے تھے۔۔۔۔ کہ بہو کا زیور لے کر بیٹی کو بیاہ دیں۔۔۔۔

" رشتہ طے ہو گیا تھا۔۔۔۔ جیسے تیسے شادی کرنا تھی۔۔۔۔ باپ بیٹا دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔۔۔۔ جانے کہاں کہاں سے کس کس وعدے سے پیسہ اکٹھا کیا۔۔۔۔ اور انیلا کی شادی کر دی۔۔۔۔

" انیلا کے سسرال والوں نے کہا تو یہی تھا کہ انہیں جہیز کی ضرورت نہیں۔۔۔ لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ تھا۔۔۔۔ جہیز ان کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔۔۔۔ جس جس چیز کی توقع تھی نہیں ملی۔۔۔۔ تو برملا انیلا کو احساس دلایا گیا۔۔۔۔ انیلا بیچاری دم بخود رہ گئی۔۔۔۔ لیکن قسمت اچھی تھی شوہر اچھا تھا۔۔۔۔ گھر والے کوئی بات بناتے یا طنز کرتے تو انیلا کی پوری طرف داری کرتا۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔۔

باتیں احمد سعید اور رابعہ تک پہنچ رہی تھیں۔۔۔۔ راشد اور عاصمہ کو پتہ چل رہا تھا۔۔۔۔

انیلا میکے آتی تو ساس کوئی نہ کوئی فرمائش کر دیتی۔۔۔۔ شروع شروع کی بات تھی۔۔۔۔ انیلا کے قدم سسرال میں جمانا ضروری تھے۔۔۔۔ اس لیے تنگی ترشی سے یہ فرمائش پوری کر دی جاتی۔۔۔۔

اس بیٹی کی شادی کا تلخ تجربہ ہوا تھا۔۔۔۔ لیکن کیا کرتے۔۔۔۔ دل کو یہی تسکین مل رہی تھی۔۔۔۔ کہ داماد سمجھدار ہے۔ انیلا کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔۔۔۔

انیلا ہی کے ولیمے پر ان لوگوں نے بیلا کو دیکھا تھا۔۔۔۔

حمید احمد بہت امیر کبیر آدمی تھے۔۔۔۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔۔۔۔ لاکھوں کما رہے تھے۔۔۔۔ اسد ایک اکلوتا بیٹا تھا۔۔۔۔ ایم بی اے کرنے کے بعد وہ بھی باپ کے کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔۔۔۔ وجیہہ و وقار سا لڑکا تھا۔ شرافت بھی مسلمہ تھی۔۔۔۔ بہت ٹھہرا اور سلجھا ہوا تھا۔۔۔۔ انیلا کے شوہر شہریار کا دوست تھا۔۔۔۔ بیلا کو ولیمے کی دعوت

میں دیکھا تھا۔۔۔۔ یہ من موہنی سی لڑکی دل میں اُتر گئی تھی اور اتفاق ہی کی بات اس کی ممی کو بھی یہ لڑکی پسند آئی تھی۔۔۔۔ اس نے بڑی عزت اور تعظیم سے اس کو کھانا لا کر دیا تھا۔۔۔

اسد کا تعلق جس گھرانے سے تھا۔۔۔۔ یا جو اس کی مالی حیثیت تھی۔۔۔۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہ تھی۔۔۔۔ لیکن بات تو دل کی تھی۔۔۔۔ دل کے کسی چور خانے میں بیلا چپکے ہی سے چھپ کر بیٹھی تھی۔۔۔۔ اس کی ممی نے بھی بیلا کو پسند کر لیا تھا۔۔۔۔ ماں بیٹے کی پسند ٹکرائی نہیں تھی۔۔۔۔ اس لیے انہیں یہ رشتہ طلب کرنے میں کوئی دقّت نہیں تھی۔

شہریار کی شادی کے کچھ ہی ہفتے بعد اسد کی ممی ان کے ہاں آئیں۔۔۔۔ اور اپنا مدعا بیان کیا۔۔۔۔

" بیلا ہمیں بہت اچھی لگی ہے۔۔۔۔" اس نے شہریار کی امی سے کہا۔۔۔ " اسد میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔۔۔۔ انیلا آپ کی بہو ہے۔۔۔۔ اور بیلا کی بہن۔۔۔۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کریں گی۔۔۔۔"

شہریار کی امی نے ادھر ادھر دیکھا انیلا قریب نہیں تھی۔۔۔۔ جھٹ سے بولی۔۔۔۔

جہیز وہیز کچھ نہیں ملے گا۔۔۔۔ ہماری بہو جو چار چیزیں لے کر آئی ہے آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔۔۔۔"

"اسد کی ممی ہنس پڑیں۔۔۔۔ بڑی ملائمت سے بولیں۔۔۔۔ ہمیں جہیز نہیں چاہیئے۔۔۔۔"

" یہ سب کچھ کہنے کی باتیں ہوتی ہیں بہن۔۔۔۔ جہیز بڑا ملے تو اپنے بیٹے کی شان ہوتی ہے۔۔۔۔ کم ملے تو سبکی محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔ مال ضرور ملنا چاہیے۔۔۔۔

" اپنا اپنا خیال ہے۔۔۔۔ میں تو سمجھتی ہوں، قیمتی اور اعلیٰ مال تو بیٹی ہوتی ہے۔۔۔۔ جو ماں باپ دے دیتے ہیں۔۔۔۔ اس جگر گوشے سے قیمتی اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔۔۔۔"

شہریار کی امی نے منہ بنایا۔۔۔۔ یوں جیسے کونین کی کڑوی گولی نگلی ہو۔۔۔۔ انیلا آ گئی تھی۔۔۔۔ اس لیے اس نے اسد کی ممی کو کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔"

"انیلا بیٹی" اسد کی ممی نے بڑے پیار سے کہا۔

"جی آنٹی....."

"مجھے تم شاید نہیں پہچانتیں..... میں شہریار کے دوست اسد کی ممی ہوں"

"جی شہریار نے مجھے ابھی بتایا ہے....."

"بیٹے میں ایک خاص مقصد کے لیے یہاں آئی ہوں"

"جی فرمائیے....."

"میرا بیٹا اسد ہے نا....."

"جی....."

"ایک ہی بیٹا ہے ہمارا..... ایم بی اے کر کے اپنے ڈیڈی کے ساتھ بزنس میں شریک ہے....."

"جی....."

"میں نے اس کی شادی کرنا ہے..... لڑکی کی تلاش کر رہی تھی..... وہ مل گئی....."

"جی..... تو....."

"وہ لڑکی تمہاری بہن بیلا ہے....."

"جی"

اس کی حیرانگی پر اسد کی ممی بڑے خوبصورت انداز میں مسکرائیں..... سر اثبات میں ہلایا اور بولیں" اسد نے بھی اسے تمہارے ولیمے پر دیکھا تھا....."

وہ چپ ہو گئیں..... انیلا سمجھ گئی..... کہ بیلا اسد کو بھی پسند آئی ہے..... اس کا من خوشی سے بھر گیا لیکن خاموش رہی.....

"ہمیں بیلا کا رشتہ چاہیے....."

"جی..... میں....."

"بیلا کا رشتہ کہیں طے تو نہیں ہوا نا....."

"جی ابھی نہیں....."

"بس ٹھیک ہے....."

"آنٹی....."

"شہریار اسد کو اچھی طرح جانتا ہے۔ دونوں بہت گہرے دوست ہیں..... کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی نہیں..... تم اس کی تسلی شہریار سے کر سکتی ہو....."

"لیکن" میں کیا کر سکتی ہوں آنٹی..... رشتہ طے کرنا نہ کرنا تو ابو امی..... کا کام ہے۔

وہ ہنس کر بولیں....." تم ہماری خواہش اپنے امی ابو تک پہنچا دینا..... پھر ہم خود ہی ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے..... ٹھیک"

"ٹھیک....."

انیلا اور شہریار دوسرے دن گھر گئے..... انیلا نے عاصمہ سے بات کی..... عاصمہ تو خوشی سے پھولے نہ سمائی....." ہماری بیلا بہت لکی ہے....."

"ہاں رشتہ بہت اچھا ہے بھابی..... شہریار نے مجھے ان کے متعلق سب کچھ بتایا ہے۔ بڑی شاندار کوٹھی ہے۔ جائیداد ہے..... بھرپور بزنس ہے..... کاریں ہیں..... بس سمجھ لو کہ بہت ہی امیر کبیر لوگ ہیں..... لڑکا پڑھا لکھا ہے..... شکل و صورت کا اچھا ہے..... شریف ہے..... اور کیا چاہیے"

"بالکل..... اور پھر اتنے خواہشمند ہیں وہ لوگ....."

"آپ امی ابو سے بات کریں نا....."

"تم خود ہی بتا دو....."

"نہیں آپ کہہ دیں ان سے..... وہ لوگ آنا چاہتے ہیں....."

احمد سعید اور رابعہ نے اس رشتے کی بات سنی..... تو سوچ میں پڑ گئے.....

یہ سوچ مہینے ڈیڑھ پر پھیل گئی.....

رشتہ بہت اچھا تھا..... لیکن احمد سعید اور رابعہ مجبور تھے..... انیلا کی شادی پر لیا ہوا قرضہ ابھی جوں کا توں قائم تھا..... ابھی تو اس کے سسرال والوں کی چھوٹی موٹی فرمائشیں ہی بمشکل آمدنی میں سے پوری کی جا رہی تھیں..... ایک پائی بھی نہ بچ پاتی تھی..... کہ قرضے کے سلسلے میں دے سکیں..... بڑی پریشانیوں نے گھیر رکھا تھا.....

انیلا دوسری بار پھر اسد کی ممی کا پیغام لے کر آئی..... امی ابو اور بھائی بھابی سب رات کو کھانے پر بیٹھے تھے..... انیلا نے عاصمہ سے تو بات کی تھی۔ لیکن اس نے جواب دیا تھا بھئی ابّا اور امی سے تم خود ہی بات کرو.....

"بھابی رشتہ بہت ہی اچھا ہے..... گنوانا نہیں چاہیے....."

"میں کیا کہوں..... گھر کے حالات ہی ایسے ہیں..... ابھی تو تمہاری شادی....."

"وہ تو ہے....."

"پھر تم خود ہی پوچھ لو باجی سے....."

"کھانے کے بعد جب بیلا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی..... انیلا نے ہولے ہولے بات چھیڑی۔

احمد سعید اور رابعہ کچھ نہیں بولے..... نہ ہی راشد اور عاصمہ نے کوئی بات کی۔

"کیا سوچا ہے آپ لوگوں نے...... وہ لوگ بہت اصرار کر رہے ہیں..... باقاعدہ رشتہ لے کر آنا چاہتے ہیں....."

"انہیں منع کر دو....." احمد سعید نے گھمبیر آواز میں کہا۔

"منع کر دوں....."

"ہاں....."

"لیکن....."

"لیکن ویکن کیا بیٹی...... رشتہ تو واقعی ہر لحاظ سے اچھا ہے...... ایسے رشتے قسمت سے ملتے ہیں......"

"تو پھر......"

"پھر کیا کیا جائے...... رشتہ طے کر لیں تو شادی کہاں سے کریں گے...... اب تو ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں...... قرضے کا بار ہے سر پر..... تمہارے بھائی بھابی اتنے اچھے نہ ہوتے تو جانے تمہاری شادی بھی میں کر پاتا یا نہیں..... بہرحال تم ان سے معذرت کر لو..... ابھی ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں..... کہ شادی تو کیا منگنی بھی کر سکیں...... تم بچی نہیں ہو گھر کے حالات کا تمہیں بھی علم ہے....."

"ابا جی..... وہ لوگ جہیز نہیں چاہتے..... آپ تین کپڑوں میں بھی بیلا کو وداع کریں گے تو بخوشی لے......"

"بس کرو انیلا..... رابعہ جلے دل سے بولی" تمہارے سسرال والے بھی یہی کہتے تھے نا....."

انیلا نے سر جھکا کر کہا....." سب لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے نا امی....."

"کیا پتہ وہ ان لوگوں سے بھی زیادہ لالچی ہوں......"

"ہاں..... کچھ کہا تو نہیں جا سکتا نا....." راشدہ نے کہا....." ہو سکتا ہے وہ تمہارے سسرال والوں سے بھی ایک ہاتھ آگے ہوں......"

"بیلا ابھی اتنی بڑی بھی تو نہیں ہو گئی..... کہ یہ رشتہ فوری طور پر طے کر دیا جائے..... سیکنڈ ائر میں پہنچی ہے ابھی..... ایم اے کر لے گی..... تو اس کی شادی کا سوچوں گا....." احمد سعید نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

عاصمہ نے ایک خاموش نگاہ انیلا پر ڈالی..... یہ بڑی بولتی ہوئی خاموش نگاہ تھی۔ ..... اتنا اچھا رشتہ رد کر دینا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

لیکن احمد سعید بھی سچے تھے...... کیا کرتے کہاں سے لاتے پیسہ...... اب تو کوئی ایسی آسامی بھی نظر نہ آتی تھی...... جس سے سالوں کا وعدہ کر کے قرض لے لیا جاتا...... رابعہ کے پاس بھی اب کچھ نہیں تھا...... بیلا کے لیے تو دو چار جوڑوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں...... زیور کی صورت میں صرف ایک انگوٹھی بچی تھی ان کے پاس......

احمد سعید نے انیلا سے صاف طور پر کہہ دیا...... کہ وہ ان لوگوں کو جواب دے دے...... بیلا کی شادی ابھی نہیں کرنی...... تین چار سال بعد دیکھیں گے...... فی الحال ان کے ذہن پر کافی بوجھ ہیں...... اس نئے بوجھ کو لادنے کی قطعاً گنجائش نہیں......

انیلا اور عاصمہ نے ایک دوسری کو بڑی مایوسی سے دیکھا......

”پھر“

انیلا نے جب اسد کی ممی آئیں...... تو صاف طور سے اپنے والدین کی مالی حالت بتا دی...... تنخواہ داروں کے حالات اسد کی امی سے چھپے نہیں تھے...... اس لیے اس نے نرمی سے انیلا کو سمجھایا۔ ”بیٹی میں جانتی ہوں...... کہ مہنگائی کے اس زمانے میں ایماندار تنخواہ دار کے لیے سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا بھی مشکل ہو رہا ہے...... اور پھر تمہارے والدین نے چند ہی مہینے ہوئے تمہاری شادی کی ہے...... ظاہر ہے اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں...... کہ ایک اور شادی کا بار اُٹھائیں......“

”جی...... بالکل یہی بات ہے آنٹی......“

”جب میں ان کی مالی حالت سمجھتی ہوں...... تو پھر وہ کیوں انکار کر رہے ہیں...... ہمیں کچھ نہیں چاہیے...... صرف اور صرف بیلا چاہیے بیٹی...... میں ہر طرح سے انہیں تسلی دینے کو تیار ہوں......“

”آنٹی...... دراصل...... انہیں میری شادی کا تلخ تجربہ ہوا ہے...... یہ لوگ بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے...... پھر بھی انہوں نے مجھے معقول جہیز دیا...... اس پر جو باتیں ہوئی ہیں

یا ہوتی ہیں...... آپ بھی جانتی ہوں گی......“

ہمارا معاملہ اور ہے...... ہم ایسا نہیں کریں گے......“

”بس ابو کو یہی خوف دامن گیر ہے آنٹی...... ورنہ ایسا رشتہ تو......“

”اچھا میں خود جاؤں گی ان کے پاس“

”نہیں آنٹی...... آپ نہیں جائیے گا...... وہ رشتہ نہیں کریں گے...... نہیں کر سکتے......“

”لیکن“

اسد کی ممی نے یہ رشتہ بہر صورت لینا تھا اس لیے آج وہ خود ان کے گھر آئی تھیں...... رابعہ تو اس کے آنے سے ناخوش تھی...... لیکن عاصمہ اس سے مل کر بہت متاثر ہوئی تھی...... اسے اسد کی ممی بات کی سچی اور قول کی پکی لگ رہی تھیں......

عاصمہ امی کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے بیلا کو ڈرائنگ روم میں لے آئی...... اسد کی ممی نے اسے خوب پیار کیا...... پھر بیلا اور عاصمہ چائے کے لیے اُٹھ گئیں...... اور اسد کی ممی رابعہ کو اپنی بے لوث اور پُرخلوص چاہت کا یقین دلانے لگیں...... اس نے بار بار یہی کہا کہ اسے صرف لڑکی چاہیے...... جہیز نہیں...... چاہیں تو بیٹی کا خالی ہاتھ تھما دیں...... وہ بخوشی قبول کر لیں گی۔

لیکن دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینے والی بات تھی...... رابعہ نے حامی نہیں بھری......

” اسد کی ممی بھی مصمم ارادے کی مالک تھیں...... من پسند لڑکی مل رہی تھی...... چھوڑتی کیسے...... اس دن تو چلی گئیں لیکن پھر آئیں اور بار بار آئیں...... پانے کی لگن تھی ارادے میں قوت تھی۔ جو بات منہ سے نکالی تھی اس سے پیچھے ہٹنے والی نہ تھیں...... انہوں نے پتھر پگھلا ہی لیے...... بیلا کے والدین کو ہاں کرتے ہی بنی......

طے پایا...... کہ رشتہ تو ابھی کر دیا جائے...... لیکن شادی ایک سال بعد ہو......

اسد کی ممی نے صرف یہ بات منوالی..... کہ منگنی کی بجائے نکاح کریں گی.....

اس بات پر بھی گھر میں خاصی بحث چلی..... احمد سعید نکاح پر رضامند نہ ہوتے تھے..... وہ تو منگنی کی چھوٹی سی رسم کرنے پر بھی بمشکل راضی ہوئے تھے..... نکاح میں قباحت تو نہ تھی..... پھر بھی خرچہ کافی اُٹھ جانا تھا۔ راشد سے صلاح کی تو وہ کوئی رائے نہ دے سکا۔ مسئلہ اس کا بھی وہی تھا۔ لیکن لڑکے والوں کی خوشنودی بھی مطلوب تھی۔ عاصمہ نے بھی یہی کہا تھا کہ نکاح کر دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ خرچہ تو اٹھنا ہی تھا اس کی سب سے پیاری نند اتنی اچھی جگہ جا رہی تھی کہ کچھ زیادہ اہتمام تو کرنا نہیں تھا چالیس پچاس لوگ ہی جمع ہونا تھے تقریب میں اپنی طرف سے انہوں نے بہت کم لوگوں کو دعوت دی۔

نکاح سے چند دن پہلے جب عاصمہ مہمانوں کی تعداد پوچھنے اسد کے ہاں گئی تو اس کی ممی نے اس کی بڑی خاطر مدارت کی بہت پیار کیا۔ جب وہ واپس ہونے لگی تو اسد کی ممی نے کہا "بیٹی بالکل تکلف نہ کرنا۔ کھانا بھی جتنا سادہ رکھیں اتنا اچھا ہے اور جھنجالوں میں نہیں پڑنا۔ ہمیں جو کچھ دینا ہے رخصتی پر دے دینا۔ سمجھ گئی ہو نا میری بات عاصمہ نے سر اثبات میں ہلایا اس نے یہ باتیں خوش خوش گھر والوں کو بتائیں تو رابعہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ جھٹ بولی "تو انہوں نے بھی پیغام دینا شروع کر دیئے..... لڑکے کی انگوٹھی اور جوڑا..... ہونہ....."

لیکن امی انہوں نے تو یہ بات سرسری طور پر کہی ہے..... اپنے لیے تو کچھ نہیں مانگا....."

راشد ہنس کر بولا "معاف بھی تو نہیں کیا رخصتی تک بات ملتوی کی ہے صرف لینے دینے کی"

احمد سعید بھی متفکر ہوئے "سب پہلے یہی کہتے ہیں کچھ نہیں لیں گے..... تین کپڑوں میں لے جائیں گے..... آہستہ آہستہ پر پرزے نکالنا شروع کرتے ہیں..... بھورانی تم ہی نے زور دیا ہے..... اب بھگتو خود ہی..... یہ لوگ تو ہیں بھی دھن دولت والے ان کی فرمائشیں بھی اونچی ہوں گی....."

"کیا بنے گا؟" رابعہ نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

"بنے گا کیا..... یہ تو وقت ہی بتائے گا..... اب مرحلے طے کرنا ہی ہیں..... زبان دے چکے ہیں ہم لوگ"

عاصمہ سب کی لے دے سنتی رہی..... پھر بولی "آپ لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں..... لڑکے کے لیے انگوٹھی اور جوڑا تو بنوانا ہی ہے..... وہ جو اتنا کچھ لا رہی ہیں ہیلا کے لیے..... ہمیں بھی تو کچھ نہ کچھ عزت رکھنا ہے..... آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں بندوبست کر لوں گی....."

"بیٹی بندوبست تو اب کرنا ہی ہے تم کر دیا ہم..... ڈر تو ان لوگوں سے لگ رہا ہے۔ .....رخصتی کے لیے کیا کریں گے..... کہاں سے لائیں گے ان کے شان شایاں جہیز....."

"یہ سال بھر کے بعد کی باتیں ہیں ابا جی..... فی الحال ہم صرف نکاح کر رہے ہیں..... وہ بھی دھوم دھڑکے سے نہیں....."

"اور دھوم دھڑکا کیا ہوتا ہے عاصمہ" راشد بولا..... "کھانا تو اچھا ہی دینا پڑیگا....."

"مہمان تو زیادہ نہیں ہوں گے نا..... وہ چاہتے تو دو چار سو آدمی لے آتے..... لیکن آنٹی صرف چیدہ لوگوں کو لا رہی ہیں کل بیس آدمی ہوں گے ان کے..... ساری خوشیاں وہ اپنے گھر منائیں گی....."

عاصمہ آنٹی اور انکل کی تعریفیں کرنے لگی..... ان کے گھر بار کی تعریفیں ان کے خلوص اور پیار کی تعریفیں

نکاح کا دن آ پہنچا.....

راشد اور عاصمہ نے بہت کوشش کی تھی..... کہ تقریب لڑکے والوں کے شان شایان ہو..... بہت اچھا کھانا بنوایا تھا۔ اور جگہ بھی خوبصورتی سے سجائی تھی..... جھنڈیاں اور رنگا رنگ قمقمے بھی گھر کے ماتھے پر سجائے تھے..... انہیں صرف آج کے دن کی فکر تھی..... کہ

اچھے طریقے سے گزر جائے..... شادی میں سال بھر کا لمبا وقفہ تھا۔

لیکن احمد سعید اور رابعہ کے دل بیٹھے جا رہے تھے...... یہ رشتہ خوشیوں کا باعث بھی تھا.... لیکن تفکرات نے ان خوشیوں کی شاہ رگ دبا رکھی تھی......

رات رسم نکاح ہوئی..... اسد کے ممی ڈیڈی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ..... اسد دولہا بنا مسند پر بیٹھا تھا..... مبارک سلامت کے شور اُٹھ رہے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد دولہا کی بہنوں اور بھابیوں نے خوب رنگ جمایا...... گانے گائے ڈانس کیے...... بھرپور خوشیاں منائیں..... پھر سلامی کی رسم کے لیے دولہا کے پہلو میں سجی سجائی دلہن لا بٹھائی گئی..... بیلا پہچانی نہیں جا رہی تھی..... بھاری کام والے ٹشو کے کپڑے تھے..... زیور سے پیلی ہو رہی تھی..... عاصمہ نے میک اپ بھی خوبصورتی سے کیا تھا.... نظر نہ ٹھہرتی تھی اس کے چہرے پر..... اسد کی امی نے اس کا ماتھا چوما بلائیں لیں..... دعائیں دیں ہزاروں روپے اس پر سے نچھاور کیے..... دیکھنے والے مبہوت تھے..... کہ بیلا نے ایسی قسمت پائی ہے۔

اسد نے بیلا کے ہاتھ میں ہیرے کی رنگ ڈالی..... مسرور نے سونے کی انگوٹھی بیلا کو دی کہ وہ اسد کو پہنائے شرماتے لجاتے قہقہوں اور تالیوں کی گونج میں بیلا نے اسد کو انگوٹھی پہنا دی..... ایک بار پھر مبارک سلامت ہوئی..... لڑکیوں اور نئی بیاہی بہنوں بھائیوں نے لڈی ڈالی.... خوشی کا یہ ہنگامہ رات گیارہ بجے تک جاری رہا.... دولہا دلہن ایک دوسرے کے قریب بیٹھے یہ رنگ محفل دیکھتے رہے۔

پھر کسی نے آکر کہا..... آنٹی انکل کہتے ہیں اب اجازت چاہیں..... رات کافی اُتر آئی ہے چلنا چاہیے۔“

”ہاں“ اسد کی ممی نے معنی خیز نظروں سے اسد کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولیں ”چلنا ہی چاہیے اب“ رابعہ بھی قریب ہی کھڑی تھی..... اس کی ممی نے اس سے بھی کہا اب اجازت

ہے..... اب ہم لوگ جائیں......“ اس نے سر ہلایا..... مسکرا کر بولی ”آنٹی اتنا مزہ آرہا تھا..... جی تو نہیں چاہتا کہ آپ لوگ جائیں..... لیکن خیر..... واقعی رات کافی اتر آئی ہے......“

اسد کی ممی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی ”اجازت ہے نا.....“

ہاں آنٹی..... ٹھہریے میں پہلے بیلا کو اندر چھوڑ آؤں.....“ وہ بیلا کی طرف جھکی

اسد کی ممی درمیان میں آکر بولی ”بیلا کو اندر کیوں لے جا رہی ہو.....“

”فنکشن جو ختم ہو گیا..... آپ لوگ جا رہے ہیں نا.....“ عاصمہ بولی

”تو کیا اپنی امانت چھوڑ کر چلے جائیں گے“ اسد کی ممی نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؛ رابعہ انیلا بینا عاصمہ سبھی کی آنکھوں سے یہ سوال چھلکا۔

”مطلب ہے کہ نکاح ہو گیا..... بیلا ہماری ہو گئی..... آپ کی نوازش اور مہربانی..... اب ہم اپنی بیلا کو اپنے گھر لے جا رہے ہیں.....“

”لیکن.....“ کئی آوازیں ابھریں......

اسد کی ممی بڑے دلکش انداز میں مسکرائے جا رہی تھیں.....“ نکاح ہو گیا..... اب فضول رسموں کی کوئی گنجائش نہیں..... بیلا آپ نے ہمیں سونپ دی..... ہم نے اسے دل وجان سے قبول کر لیا..... نکاح ہو گیا اب بیلا ہماری ہے۔

”وہ تو ہے آنٹی“ عاصمہ روہانسی ہو گئی..... ہڑبڑا گئی..... لیکن اسد کی ممی نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی اسے واقعی کچھ نہیں چاہیے تھا سوائے بیلا کے..... اسد نے بھی یہی بات کہی..... لوگ دنگ رہ گئے شور مچ گیا اچھا خاصہ ہنگامہ بپا ہو گیا..... دونوں طرفوں کے مرد بھی اکٹھے ہو گئے..... ہر کوئی بول رہا تھا..... کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا..... کوئی ہنس رہا تھا ..... کوئی سنجیدہ تھا..... لڑکے والے لڑکی کو ابھی اور اس وقت اپنے ساتھ لے جانے پر مصر تھے..... لڑکی والے کہہ رہے تھے۔ آپ نے ایک سال بعد رخصتی کا وعدہ کیا تھا.....

یوں لڑکی اڑا لے جانا تو...... جتنے منہ اتنی باتیں..... اسد اور اس کے ممی ڈیڈی کے علاوہ ان کے ساتھ آنے والے مہمان بھی مسکرائے جا رہے تھے۔ سب کو اس پلان کا علم تھا..... بڑی لے دے ہوئی..... بالآخر لڑکی والوں کو ماننا ہی پڑا اسد کی ممی ڈیڈی نے بیلا کے گھر والوں کو الگ لے جا کر سمجھایا..." ہماری آپ کی رشتہ داری ہو گئی ہے..... اب ہم ایک دوسرے کے سکھ دکھ نہیں بانٹیں گے تو اور کون بانٹے گا۔ ایک سال کی مہلت آپ اس لیے لینا چاہتے ہیں..... کہ آپ کو سال بھر کرب و اذیت میں مبتلا کر کے پیسہ پیسہ جوڑ کے بیلا کا جہیز بنائیں۔ قرضے اٹھائیں...... اپنے لیے مصائب اکٹھے کریں..... ہم نے آپ سے کہا تھا نا ہمیں بیلا کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ ہم بیلا کو بلا جہیز لے جا رہے ہیں۔ آپ اس کی طرف سے مطمئن رہیں..... وہ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم رہے گی..... ہم اسے بہو کا مقام دیں گے..... وہ ہماری عزت ہے.... آپ دیکھیں گے وہ اپنے گھر میں راج کرے گی......"

"بات ان کی سمجھ میں آ گئی..... دل و دماغ سے بوجھ اتر گیا..... ایسے عظیم لوگوں کے سامنے ان کے سر عقیدت سے جھک گئے۔ پھر ماں باپ اور بھائی بھابی کی دعاؤں کے سائے تلے بیلا رخصت ہو گئی۔ خلوص دل سے نکلی دعائیں ہی اس کا جہیز تھیں وہ خوب پھلی پھولی۔ واقعی اپنے گھر میں راج کر رہی ہے۔ میاں کی پیاری اور ساس سسر کی دلاری ہے۔ وہ بھی ان کی بے حد عزت کرتی ہے۔ پیار کرتی ہے کہ ایسے لوگ..... پیار عزت اور محبت ہی کے قابل تو ہوتے ہیں۔

ندامت کے آنسو

یہ رشتہ عابدہ خان کروا رہی تھی۔ اور اسے عابدہ پر پورا یقین اور بھروسہ تھا۔ اپنے لائق اور خوبصورت بیٹے کے لیے وہ رشتہ تلاش کر رہی تھی۔ کئی لڑکیاں دیکھی تھیں۔ کئی گھروں میں گئی تھی۔ لیکن کہیں بھی بات بڑھ نہ پائی تھی۔ کہیں لڑکی اچھی لگی تھی تو گھر بار پسند نہ آیا تھا۔ اور کہیں گھر بار اچھا تھا تو لڑکی دل نہ لگی تھی...... اس سلسلے میں اس کی تینوں بیٹیوں نے بھی دوڑ دھوپ کی تھی...... زاہدہ نے اپنے سسرال میں رشتہ دیکھا تھا۔ شاہدہ نے اپنے میاں کے دوست کی بیٹی پسند کی تھی۔ عظمٰی کی تینوں سہیلیاں خوش شکل تھیں۔ عظمٰی نے اعظم بھائی کو دکھا بھی دی تھیں تینوں کی تینوں..... لیکن زاہدہ اور شاہدہ نے اعظم سے کہہ دیا تھا" انتخاب جلدی نہ کرنا..... تینوں لڑکیاں بڑی تیز ہیں......

اعظم نے یہ معاملہ ماں اور بہنوں پر ڈال رکھا تھا..... جب وہ اس کے لیے ہر لحاظ سے موزوں اور اچھی لڑکی تلاش کر رہی تھیں تو پھر اسے تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس نے اب تک کہیں رومانس نہیں لڑایا تھا۔ نہ کسی لڑکی کو دل کے نہاں خانے میں اُتارا تھا..... دل کا یہ خانہ ابھی خالی تھا۔ اس میں کوئی بھی اچھی لڑکی فٹ ہو سکتی تھی۔ اس اچھی لڑکی کی تلاش جاری تھی..... گوہر مقصود ابھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

کبھی کبھی وہ پریشان ہو جاتی اپنی پریشانی کا اظہار بیٹیوں، سہیلیوں اور شوہر کے سامنے بھی کر دیتی۔ خدا جانے کب اور کہاں رشتہ طے ہوگا اپنے اعظم کا..... میں تو اب تک یہی سمجھتی تھی کہ لڑکیوں کے بر ڈھونڈنا مشکل ہیں...... لیکن اب پتہ چل رہا ہے کہ لڑکے کا رشتہ بھی کوئی

کم مرحلہ نہیں......"

بیٹیاں تسلی دیتیں "امی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ایک تو بھولا نا ہے آپ کو..... تسلی سے ڈھونڈیں مل ہی جائے گی"

میاں ہنس کر کہتے "کوئی بھلا سا گھرانہ دیکھ کر کر ڈالو رشتہ، اتنی چھان بین اچھی نہیں ہوتی ..... آخر ہم بھی تو تمہیں یونہی اٹھا لائے تھے نا......"

سہیلیاں کبھی کبھی چھیڑنے کو کہتیں "بھئی ساحرہ تمہیں صرف لڑکی نہیں چاہیے...... بڑا گھرانہ اور بڑے جہیز کی بھی طلب ہے......"

وہ الجھ پڑتی "تمہیں کس نے کہا ہے مجھے بڑے جہیز کی ضرورت ہے، ہاں بڑے گھرانے سے مراد تعلیم یافتہ اور عزت دار گھرانہ ہے، تو وہ ضرور چاہیے مجھے..... باقی رہی لڑکی..... سوچ لو...... ایک ہی ایک بیٹا ہے گنجائش ہی نہیں، کہ ایسی ویسی لڑکی لے آؤں......"

اس دن عابدہ خان کے سامنے بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں...... عابدہ کو ایک دم وردہ کا خیال آگیا..... یہ لڑکی بی اے فائنل میں تھی..... اور اس کے جان پہچان کے لوگ تھے..... لڑکی ساحرہ کے معیار پر یقیناً پوری اُتر سکتی تھی.....

"ساحرہ"

"ہوں"

لو تمہارا مسئلہ حل"

"کیسے؟"

ایک لڑکی دکھاؤں گی تمہیں...... بہت پیاری بچی ہے..... تعلیم یافتہ لوگ ہیں عزت دار ہیں، رکھ رکھاؤ والے ہیں.....

"تُو اب تک کہاں تھی۔ تم..... امتحان لے رہی تھی میرا...... جوتے گھس گئے لڑکی تلاش کرتے......"

ساحرہ کی بات پر وہ ہنس دی..... پھر سنجیدگی سے بولی "یقیناً تمہیں وردہ پسند آئے گی"

"کیا نام بتایا؟"

"وردہ"

انوکھا سا نام ہے لیکن پیارا ہے"

"لڑکی بھی بہت پیاری ہے.....؟"

"تو لے چلو ان کے ہاں......"

"لے چلوں گی..... پہلے میں پتہ کر لوں اس کی بات کہیں ہو تو نہیں چکی......"

ہائے..... ہائے..... معاملہ یہاں بھی.......

"اے نہیں ساحرہ..... میں آج ہی پتہ کروا لوں گی"

"تو بس ٹھیک ہے کل چلیں گے ان کے ہاں......"

"ٹھیک ہے......"

عابدہ نے اسی شام پتہ کروا لیا..... وردہ کے لیے دو تین رشتے تو آئے تھے لیکن ابھی بات کہیں بھی طے نہیں ہوئی تھی......

عابدہ نے تسلی کر کے ساحرہ کو فون کیا......

"تو بس ٹھیک ہے کل چلیں گے......؟"

"ہاں"

"کس وقت آؤں تمہاری طرف"

"میری طرف تو جس وقت دل چاہے آجاؤ..... ان کے ہاں پانچ بجے کے قریب چلیں گے"

"اچھا......"

"خدا کرے تمہیں سب کچھ پسند آجائے......"

"تمہاری پسند اور تحقیق پر مجھے بھروسہ ہے۔"

"شکریہ"

"او ہاں......"

"کیا ہے"

"میں اکیلی آؤں یا عظمیٰ کو ساتھ لے آؤں؟"

لے آنا..... بھلی بات ہے..... عظمیٰ لڑکی کے بارے میں ہم سے اچھی رائے دے سکے گی۔"

"بالکل درست..... کل چار ساڑھے چار بجے ہم لوگ تمہاری طرف آئیں گے....."

"پہلے آجانا گپ شپ چلے گی......"

"عظمیٰ کالج سے آئے گی اڑھائی تین بجے....."

"ہاں یہ تو ہے......"

بس چار ساڑھے چار ٹھیک ہے..... ہوں"

"اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ"

دوسری شام ماں بیٹی بڑے اہتمام سے تیار ہوئیں....." اللہ کرے آج تو کامیاب لوٹیں...... ساحرہ نے کہا۔"

"عابدہ آنٹی کی پسند بہت اچھی ہے....." عظمیٰ نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا.....

دونوں سوا چار بجے کے قریب عابدہ کے ہاں پہنچیں...... وہ تیار بیٹھی تھی..... پھر بھی اخلاقاً چائے کو پوچھا،

"آنٹی چائے تو ان کے ہاں پئیں گے...... لڑکے والے ہیں...... شاندار چائے ملے گی عظمیٰ ہنس کر بولی......

عابدہ نے اس کا گال تھپتھپایا اور مسکرا کر بولی" ہم لوگ بنا اطلاع کے جا رہے ہیں بیٹی......"

عظمیٰ نے آنٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکراتے ہوئے کہا" مذاق کر رہی ہوں آنٹی...... ہم لوگ پی کر آئے ہیں......"

بالکل طلب نہیں چائے کی ساحرہ نے بھی کہا......

عابدہ کی ملازمہ جوس لے آئی.... پینے کے بعد سب اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ پانچ بج رہے تھے..... عابدہ ساحرہ اور عظمیٰ کے ساتھ ملک صاحب کے ہاں آئی..... شہر کے صاف ستھرے علاقے میں یہ سرکاری بنگلے قطار در قطار کھڑے تھے۔ بڑا سرسبز علاقہ تھا۔

"علاقہ تو اچھا ہے" ساحرہ نے ہنس کر عابدہ سے کہا تھا۔

"گھر بھی اچھا ہے لوگ بھی اچھے ہیں..... لڑکی بھی اچھی ہے....." عابدہ خان نے مسکرا کر کہا تھا۔

"لڑکی کا باپ سرکاری ملازم ہے.....؟" ساحرہ نے پوچھا......

"ہاں....." ایکس ای این ہیں..... پتہ نہیں کس محکمے میں...... وہ ہنسی....." کہاں کے رہنے والے ہیں......

"یہ نہیں پتہ...... چلو چل کر پتہ کر لیں گے۔

تین بیڈ روم کا یہ گھر درختوں پھولدار بیلوں اور سرسبز جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا چھوٹا سا لان تھا لیکن پھولوں کی آرائش دیدنی تھی۔ اہل خانہ کا ذوق نفیس تھا۔ گھر یہ اکیلی وردہ ہی تھی..... امی ابو کسی کے ہاں تھوڑی دیر پہلے ہی گئے تھے۔ عابدہ آنٹی کو تو جانتی تھی ان کے ساتھ ساحرہ اور عظمیٰ کو دیکھ کر کچھ حیران ہوئی لیکن بڑی تعظیم سے سلام کیا اور مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا......

گھر کے ساز و سامان سے اہل خانہ کی مالی حیثیت کا پتہ چل جاتا ہے..... ساحرہ نے

بھی ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ لوگ متوسط طبقے کے سفید پوش لوگ ہیں..... رکھ رکھاؤ بے مثل تھا..... نفاست طبع بھی عیاں تھی..... لیکن کسی طور یہ لوگ امرائے کے زمرے میں نہیں آسکتے تھے۔ نہ ہی بڑے بزنس مینوں کا سا سجا ہوا گھر تھا۔

جھوٹے بلند معیار کے بھی کوئی آثار نہیں تھے۔ بس درمیانے درجے کا گھر تھا جس میں اہل خانہ کی نفاست طبع نے خوبصورتی اور پاکیزگی کا رنگ بھر رکھا تھا.....

لیکن

اصل چیز تو وردہ تھی.....

لمبے سیاہ بالوں اور حسین گہری سیاہ آنکھوں پر جھکی کالی پلکوں کی جھالروں والی گندمی رنگ والی یہ لڑکی بے حد سمارٹ اور شائستہ تھی..... ساحرہ تو دیکھتے ہی اسے اپنا بیٹھی..... عظمٰی کو بھی وردہ بہت اچھی لگی.....

امی گھر پہ نہیں ہیں..... عابدہ نے پوچھا تو وردہ بڑے شائستہ انداز میں بولی" صمد انکل کے ہاں امی ابو گئے ہیں۔ ان کے بیٹے کی احوال پرسی کے لیے۔ چند دنوں سے وہ بیمار ہے..... آپ کہیں تو بلا بھیجوں.....

"آں..... نہیں..... آج ہم تمہارے ساتھ ہی وقت گذاریں گے....." عابدہ نے مسکرا کر کہا..... پھر بولی تم انہیں جانتی تو نہیں ہو نا.....

"نہیں" وہ مسکرا کر ساحرہ اور عظمٰی کو دیکھنے لگی.....

"یہ ساحرہ احمد ہیں میری بہت اچھی دوست..... عظمٰی ان کی چھوٹی بیٹی..... ساحرہ تمہاری امی سے ملنے آئی تھیں....."

میں ملازم کو بھیج دیتی ہوں..... امی ابو کو بلا لائے گا"

"نہیں بیٹی رہنے دو....." ساحرہ پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولی" ہم پھر آجائیں گے کسی دن..... تم آؤ بیٹھو ہمارے پاس.....

"آنٹی میں چائے بناتی ہوں..... وہ بیٹھنے کی بجائے قدم اٹھاتے ہوئے بولی.....

"رہنے دیں" عظمٰی نے بھی بڑے پیار سے اسے دیکھا، آپ آئیں بیٹھیں....."

لیکن وہ بیٹھی نہیں معذرت کرتے ہوئے بولی" چائے بنا لاؤں پھر بیٹھیں گے....." وہ کمرے سے نکل گئی....."

عابدہ نے نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھا کیسی ہے؟

عظمٰی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی" امی بس..... وردہ ہی ہماری بھابی بنے گی..... اللہ کتنی پیاری ہے..... بال کتنے خوبصورت ہیں..... اور آنکھیں....."

"مجھے بھی بھا گئی ہے پہلی ہی نظر میں..... بڑی مہذب اور شائستہ بچی ہے....."

"ماں بھی ایسی ہی ہے....."

"ظاہر ہے ماں کی تربیت ہی ہو گی جو....."

عابدہ بات کاٹ کر بولی" اچھا ہی ہوا جو اس کے امی ابو گھر پر نہیں تھے....."

"کیوں" ساحرہ نے کہا۔

"بھئی لڑکی اگر تمہیں پسند نہ آتی تو بات گول کرنا مشکل ہو جاتی....."

"اس لڑکی کو کون ناپسند کر سکتا ہے"

"تو پھر شروع کر دیں کوشش اللہ کا نام لے کر"

"صرف کوشش نہیں عابدہ..... اب یہ رشتہ ہمیں لے کر تم نے ضرور دینا ہے"

عابدہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد وردہ آ گئی..... وہ ملازم کو چائے لانے کا کہہ آئی تھی۔

وہ عظمٰی کے قریب بیٹھ گئی..... دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں.....

ملازم چائے کی ٹرالی لے آیا..... چائے کے ساتھ میٹھے بسکٹ اور نمک پارے تھے۔ سادہ سی چائے وردہ نے مہمانوں کو پیش کی..... چائے سادہ تھی، لیکن پیش کرنے کا انداز

تکلفانہ تھا۔ چمکتے برتن اور کلف شدہ دھلے ہوئے لیکن سادہ سی چائے کو بھی متکلف بنا رہے تھے۔

ساحرہ نے وردہ سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں.....

آپ کتنے بھائی بہن ہیں.....

دو بھائیوں کی میں اکلوتی بہن ہوں آنٹی..... وہ بڑے دلنشیں انداز میں مسکرا کر بولی....

تمہارے ابو.....“

انجینئر ہیں واپڈا میں.....“

”ننھیال ودھیال“

وہ ہنس پڑیں” بہت بڑا کنبہ ہے ہمارا آنٹی..... امی کا خاندان تو بہت ہی بڑا ہے..... میرے نانا ڈاکٹر تھے دونوں بڑے ماموں اور چھوٹی خالہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ ممانیاں اور خالو بھی ڈاکٹر ہیں..... ایک ماموں ایس پی ہیں..... دو خالائیں.....“

وہ امی کے خاندان کے افراد کا تعارف کرانے لگی۔ پھر ددھیال والوں کا بھی تعارف کروایا۔ صرف دو چچا ہی تھے جو سٹیشن میں مقیم تھے..... اور وہاں بڑی اچھی جاب پر تھے۔

رشتہ ہر لحاظ سے موزوں تھا..... ساحرہ اور عظمٰی نے پسند کر لیا.....

چائے کے بعد بھی وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہیں.....

پھر اُٹھتے ہوئے ساحرہ بولی” ہم دو ایک دن بعد آئیں گے“

عابدہ نے کہا” میں خود ہی اس کی امی کو کہہ دوں گی“

” اب چلتے ہیں“ ساحرہ نے کہا۔

” چلو.....“

سب اُٹھ کھڑی ہوئیں..... وردہ انہیں باہر تک چھوڑنے آئی..... ساحرہ نے اسے پیار کیا..... وہ مسکرا دی.....

دوسری بار آنے کا عابدہ نے فوری پروگرام طے کیا۔ وردہ کی امی کو مہمانوں کے آنے کی غرض بتا دی۔ اعظم کی قابلیت کردار اور خاندانی پس منظر بتایا احمد کی فیکٹری کا روبار اور مالی حیثیت کا بھی کھل کر تذکرہ کیا..... ساحرہ اور عظمٰی کی پسند کا بھی بتا دیا.....

وردہ کی امی نے اسے اپنی بچی کی خوش بختی جانا..... عابدہ سے کہا” وہ لوگ بخوشی آئیں“ بیٹیاں دینے ہی کی چیز ہوتی ہیں“ اگر یہ رشتہ اتنا ہی اچھا ہوا جتنا آپ بتا رہی ہیں تو پھر ہماری طرف سے بھی ہاں ہی ہو گی.....“

” جتنا میں نے بتایا ہے رشتہ اسے اس سے بھی ہزار گنا اچھا ہے“

وردہ کی امی مسکرا دی.....

دوسری دفعہ ساحرہ اپنے ساتھ دونوں بڑی بیٹیوں کو بھی لے گئی۔ وردہ کو دیکھ کر وہ بھی خوش ہوئیں..... ہنس کر بولیں” عابدہ آنٹی آپ نمبر لے گئیں..... آپ کی دریافت واقعی لاجواب ہے۔ اعظم کے لیے ہمیں ایسی ہی دلہن چاہیے تھی.....“

مان گئیں نا“ عابدہ خوش ہو کر بولی۔

مان گئے آنٹی مان گئے۔ وہ دونوں ہنس کر بولیں.....

آج چائے خاصی پُرتکلف تھی۔ وردہ کی امی نے مہمانوں کی خاطر مدارت کی۔

کافی دیر سب بیٹھے باتیں کرتے رہے.....

پھر ساحرہ نے کہا بہن آپ کو عابدہ نے بتا دیا ہو گا کہ ہم..... کس غرض سے آپ کے ہاں آئے ہیں“

” جی..... بتا دیا تھا“ وردہ کی امی نے سر جھکاتے ہوئے کہا“

” آپ کی بچی ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔ بڑی سلیقہ شعار اور شائستہ ہے“

” شکریہ.....“

ساحرہ ہنس کر بولی” میرا بیٹا بھی ماشاءاللہ کسی سے کم نہیں..... آپ اس سے

مل لیں..... صورت وسیرت تعلیم یافتہ خاندان...... اللہ کا بڑا احسان..... کسی بات کی کمی نہیں.....“

ساحرہ کی باتیں وردہ کی امی کے دل کو لگیں...... خوشی سے اس کا چہرہ تمتانے لگا، وہ مسکرا کر بولی” ہم لوگ ضرور آئیں گے“ باقی رہی رشتہ ہونے کی بات تو یہ مقدر کے کھیل ہوتے ہیں بہن.....

” ہوتے ہیں واقعی ہوتے ہیں..... ساحرہ نے اک گہری سانس لے کر کہا...“ لیکن ہم نے رشتہ لے کر چھوڑنا ہے.....

وردہ کی امی مسکرا دیں....“

اگلے ہفتے وردہ کی امی اپنی بھابی کے ساتھ لڑکا دیکھنے آئی..... چار کنال کی کوٹھی ہی مرعوب کرنے کو کافی تھی..... اس پر سازوسامان...... ہر چیز امارت کی مظہر تھی.....

اعظم بھی خوبرو اور سمارٹ تھا..... بات چیت کرنے کا انداز بھی دلنشیں تھا شکل و صورت سے مہذب لگتا تھا.....

رشتہ ہر لحاظ سے اچھا تھا..... ساحرہ اور اس کے گھر والوں نے چاہت اور خلوص کا بھی جس قدر اظہار کیا تھا..... اسے دیکھتے ہوئے یہ رشتہ وردہ کی خوش بختی کی دلیل تھا.....

بعض دفعہ رشتے پہلی ہی نظر میں طے پا جاتے ہیں لیکن رسمی کاروائیاں بھی ضروری ہوتی ہیں لڑکے والوں کی طرف سے اصرار اور لڑکی والوں کی طرف سے پس و پیش کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے.....

مہمانوں کے اٹھنے سے پہلے ساحرہ نے کہا” پسند آیا میرا بیٹا.....“

” ماشاءاللہ“ وردہ کی امی نے صرف یہی کہا۔

” تو پھر.....“ ساحرہ تجسس سے بولی.....

میں کیا کہہ سکتی ہوں“ وردہ کے ابو سے بات کروں گی..... پھر..... کچھ مہلت بھی

چاہیے ہمیں.....“

” پوچھ کچھ کے لیے.....“

یہی سمجھ لیجئے..... بیٹیوں کا معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ آپ بھی تو جانتی ہیں.....“

” جی جانتی ہوں..... لیکن ایک بات کہہ دوں آپ اچھی طرح چھان بین کر لیں لڑکے کے متعلق جہاں سے جی چاہے پوچھ لیں...... یہ آپ کا حق ہے۔ لیکن ہم بھی یہ رشتہ چھوڑنے والے نہیں.....“

سب ہنس پڑیں..... یہ سب تو تکلفات تھے۔ رشتہ دونوں کو پسند تھا۔ پھر عابدہ نے بھرپور کوششیں شروع کر دیں...... ساحرہ نے سارا معاملہ اسی پر چھوڑ دیا۔ اور اس نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملہ طے بھی کر لیا..... اب باقاعدہ منگنی ہونا تھی..... اس کے کچھ دن انتظار کرنا پڑا۔ وردہ کے ابو کو کراچی جانا پڑ گیا۔ ان کی واپسی پر ہی تاریخ طے ہو سکتی تھی۔

وردہ کی امی نے رشتہ طے کرنے کی حامی تو بھر لی تھی، لیکن لڑکے والوں کی امارت سے کچھ خائف بھی تھی۔ اسی لیے اس نے منگنی سے پہلے اپنی مالی حیثیت عابدہ پر پوری طرح کھولتے ہوئے کہا” وہ امیر لوگ ہیں۔ اور ہم نرے سفید پوش، آپ جانتی ہیں کہ وردہ کے ابو راشی نہیں ہیں..... نام کو تو ایکس ای این ہیں لیکن صرف نام ہی نام ہے، اس مہنگائی کے دور میں اس تنخواہ میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل ہے۔ ہم لمبا چوڑا جہیز دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ بات آپ ساحرہ بہن پر منگنی سے پہلے ضرور واضح کر دیں۔

” آپ تسلی رکھیں..... ساحرہ کو آپ صرف اپنی بچی ہی دے دیں گی تو وہ شکر گزار ہو گی۔ اسے جہیز کی ضرورت ہے نہ طمع..... میں اسے بہت قریب سے جانتی ہوں..... وہ ایسے لوگ نہیں ہیں..... بلکہ ساحرہ تو جہیز کے بہت خلاف ہے“ پھر بھی..... آپ

براہ مہربانی یہ بات ان پر واضح کر دیں۔

عابدہ نے اس کے کہنے پر یہ بات ساحرہ پر واضح کی کہ وہ اس کے گلے پڑ گئی تم جانتی ہو عابدہ میں جہیز کی لعنت کے دل سے خلاف ہوں..... اور کیوں ہوں...... اس بات کا بھی تمہیں علم ہے میں بیٹی والوں کی نازک پوزیشن سے واقف ہوں۔ جہیز کا بوجھ ان کے احساسات کو کس طرح کچل ڈالتا ہے میں اچھی طرح آگاہ ہوں۔ آپ ان سے کہہ دیں ہمیں صرف وردہ چاہیے اور کچھ نہیں.....؟

یہ بات ساحرہ نے خود بھی وردہ کی امی سے کہی" آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں ؟ ہمیں آپ اپنی بیٹی دے دیں گے یہ کیا کم بات ہے...... ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے بہن..... ایک جوڑا بھی نہ دیں..... پھر بھی ہم اس والہانہ خوشی سے وردہ کو اپنی بہو بنائیں گے......

وردہ کی امی نے مرعوب ہو کر سر جھکا لیا پھر آہستگی سے بولی" اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ کوئی وداع نہیں کرتا۔ ماں باپ اپنی حیثیت سے بڑھ کر ہی دیتے ہیں۔ پھر بھی لالچی لوگ......"

ساحرہ بات کاٹتے ہوئے جوشیلے انداز میں بولی" ہاں لالچی لوگ بھی ہوتے ہیں...... وہ بیٹیوں کو جہیز کے ترازو میں تولتے ہیں..... کبھی کبھی تو رشتے بھی توڑ دیتے ہیں.... لڑکی اور اس کے غریب والدین کے دل پر کیا گزرتی ہے...... وہ کبھی نہیں محسوس کرتے....؟

باتیں ہو رہی تھیں..... وردہ کے ابو بھی آ گئے......

" اتنی دیر لگا دی...... وردہ کی امی نے سب سے علیک سلیک کے بعد پوچھا،

" گجرات گیا ہوا تھا.....؟ وہ بولے،

گجرات کے نام پر ساحرہ نے چونک کر دیکھا...... وردہ کے ابو مسکراتے ہوئے ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد بولے" میں ذرا ہاتھ پاؤں دھو آؤں.... ابھی آیا...."

وہ ڈرائنگ روم سے چلے گئے۔ وردہ کی امی بھی ان کے پیچھے نکل گئیں.... ساحرہ نے عابدہ سے پوچھا ملک صاحب...... کیا نام ہے ان کا.....؟

" ایس اے ملک"

" پورا نام......؟

" شاید تسلیم احمد ملک ہیں......؟

" تسلیم احمد ملک"

" کیوں کیا بات ہے...... کیا سوچنے لگیں.....؟

ساحرہ نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کیا، کیا گجرات کے رہنے والے ہیں......؟

پتہ نہیں مجھے...... ابھی پوچھ لینا.....؟

وردہ کی امی اس کے ابو کو کپڑے نکال کر دے آئی..... آتے ہی بولی آج ہی انہیں گجرات جانا پڑ گیا..... دیر سے آئے ہیں۔ ابھی آجاتے ہیں..... گجرات جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں ہمارے آبائی مکان کا جھگڑا چل رہا ہے کچھ.....

" آپ لوگ گجرات کے رہنے والے ہیں..... ساحرہ نے بے تابی سے پوچھا،

" ملک صاحب وہاں کے رہنے والے ہیں..... میں تو لاہور کی ہوں...... وردہ کی امی نے غیر محسوس سے تفاخر سے کہا......

" تسلیم احمد گجرات کے رہنے والے ہیں؟ ساحرہ نے پوچھا.....

" جی ہاں...... رہنے والے تو گجرات کے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں نوکر پیشہ لوگوں کو نگر نگر گھومنا پڑتا ہے ویسے زیادہ عرصہ ہم لوگوں نے لاہور میں گزارہ ہے۔

" ان کے والد کا نام کیا تھا؟..... ساحرہ نے پوچھا،

" نعیم احمد ملک..... وردہ کی امی ٹرالی پرے ہٹا کر لے گئیں۔ وہ برتن نوکر کے حوالے

کرنے لگیں۔

"کیا بات ہے کیا تم جانتی ہو ان لوگوں کو" عابدہ نے ہولے سے پوچھا...."تمہارا میکہ بھی تو گجرات میں ہے"

بہت اچھی طرح" ساحرہ نے اک گہری سانس لے کر کہا پھر اس نے سرگوشی سے کہا "انہیں بتانے کی ضرورت نہیں، کہ میرا بھی گجرات سے تعلق ہے...."

کوئی خاص بات"

"ہاں"

"کیا؟"

قدرے تامل کے بعد اس نے عابدہ کے کان میں کچھ کہا..... وہ حیرت سے اچھل پڑی ......اسے چند لمحے تکتے رہنے کے بعد بے تابی سے بولی...... تو..... تو....."

"تو..... کچھ نہیں....."

"یہ رشتہ......"

"ہو گیا ہے"

"پھر....."

"پھر میں بھی یہی سوچ رہی ہوں"

وردہ کے ابو آ گئے..... امی بھی آ بیٹھیں.....اب منگنی کی تاریخ طے کرنا تھی...."

منگنی تو اک رسم ہوتی ہے دو انسانوں کو ایک بندھن میں باندھ دینے کا اعلان ہوتا ہے..... اصل بات تو شادی کی تھی..... ساحرہ نے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی..... منگنی کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد شادی قرار پائی....."

دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے...... بہت انکساری کا اظہار کر رہے تھے. اُٹھنے سے پہلے ملک صاحب نے منت بھرے لہجے میں کہا" بہن ہم بہت زیادہ جہیز نہیں دے

سکیں گے ......میں رشوت نہیں لیتا نہ ہی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہے.....آپ جیسے بزنس والے لوگوں کو پیسے کا احساس نہیں ہوتا. نہ ہی کمر توڑ مہنگائی متاثر کرتی ہے. ہم جیسے تنخواہ دار لوگ بمشکل سفید پوشی کا بھرم ہی رکھ پاتے ہیں.....میں تو تنخواہ بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیتا ہوں..... یہ ہوئیں شاہ خرچ ...... بس پتہ نہیں وردہ کے لیے کچھ بچایا بھی یا نہیں.....

وہ بڑے عجز وانکساری سے اپنی مالی حالت بیان کر رہے تھے..... عابدہ بار بار ساحرہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ دھڑکا سا لگا تھا......"

ساحرہ نے بڑے اطمینان سے کہا" آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں بھائی صاحب.... ہمیں سوائے اس بچی کے کچھ نہیں چاہیے....."

وردہ کی امی ہنس کر بولیں" خدا کرے آپ جو کہہ رہی ہیں اس پر کاربند رہیں.....ورنہ ہوتا ایسے ہے پہلے سب لوگ یہی کہتے ہیں. کہ صرف لڑکی چاہیے...... بعد میں جہیز..... آپ سے کہہ جو دیا کوئی مطالبہ نہیں ہوگا..... ضمانت چاہتی ہیں.....؟ وہ ہنس کر بولی.....

"نہیں.....نہیں یہ بات نہیں.....؟ وردہ کی امی نے جلدی سے کہا.....

ساحرہ نے کہا ضمانت کے طور پر یہی کر سکتی ہوں کہ منگنی کی رسم پر آپ ہم لوگوں کے لیے ایک چیز نہ بنائیے گا.....ہم ایک چیز نہیں لیں گے۔

عابدہ حیرانی سے ساحرہ کو تک رہی تھی...... ساحرہ سکون سے بولے جا رہی تھی، وردہ کی امی اور ابو اطمینان کا سانس لے رہے تھے.....

منگنی دھوم دھام سے ہوئی..... ساحرہ نے جی بھر کر خوشی منائی قیمتی کپڑوں کے کئی جوڑے اور زیورات کے تین سیٹ وردہ کے لیے لے گئی۔ جو جوڑا پہنایا گیا وہی ہزاروں کی لاگت سے بنایا گیا تھا...... خوب پیسہ لٹایا...... دھوم مچ گئی۔

اور

واقعی وردہ کی امی نے جو جوڑے ان کے اور گھر والوں کے رکھے تھے اس نے ملائمت سے واپس کر دیئے صرف لڑکے کی انگوٹھی اور کپڑے رکھے......

سارے لوگ بڑے مرعوب و متاثر ہوئے۔ ملک صاحب اور انیسہ ملک کی خوشیوں کی حد نہ تھی شادی کے لیے وقفہ تھوڑا تھا...... اس لیے دوڑ دھوپ دونوں کی طرف سے شروع ہو گئی..... لڑکی والوں کے لیے اب تو کوئی مسئلہ نہ تھا...... جو کچھ بن پایا وہی کافی تھا۔

وردہ کی امی پھر بھی چیزیں بنوا رہی تھیں۔ ملک صاحب اس پر کئی بار ناراض بھی ہو چکے تھے۔ خدا کا شکر نہیں کرتیں کہ اتنے اچھے لوگ ملے ہیں۔ وردہ کو ایک جوڑے میں بھی رخصت کر دو گی تو برا نہیں مانیں گے...... بھلی لوگ چار پیسے ہیں تو جمع رہنے دے...... لڑکوں کی پڑھائی کے کام آئیں گے۔ زمین جو لے رکھی ہے اس پر دو کمرے ڈال لینا..... سر چھپانے کا آسرا ہو جائے گا...... خدا کی بندی نہ خرچ کر.....‘‘

وہ اس کی سنی ان سنی کر کے کہتی......

’’وردہ کا بھی حق ہے پھر کونسا لاکھوں خرچ کر رہی ہوں..... جو کچھ پاس ہے وہی تو......‘‘

پاس نہیں ہے...... یہ کیوں نہیں سمجھتی..... فنڈ نکلوایا ہے..... جو جمع پونجی تھی وہ خرچ کر ڈالی ہے اب تو لگتا ہے مجھے قرضہ بھی لینا پڑے گا.....‘‘

وقت گزر جانے دیں سب ٹھیک ہو جائے گا..... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے...... دنیاداری بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں......‘‘

پاگل ہو تم تو.....‘‘

’’جو بھی ہوں ٹھیک ہوں......‘‘

وردہ کی امی نے ریشمی جوڑے اور زیور تیار کر لیا زیور تو خریدنا نہیں پڑا..... اپنا ہی کافی تھا..... کچھ برتن، کچھ الیکٹرک کی چھوٹی موٹی چیزیں اور ایک کمرے کا فرنیچر اس نے ملک صاحب

کی ناراضگی کے باوجود تیار کروا لیا شادی میں صرف تین دن رہ گئے تھے......

کارڈ بٹ چکے تھے...... جن لوگوں کو زبانی بلاوے دینے تھے ان کے ہاں جا کر بھی کہا جا رہا تھا۔ ساحرہ کے ہاں بھی گہما گہمی تھی..... خاندان جمع تھا...... روز رات کو ڈھولکی بجتی تھی..... گانے گائے جاتے تھے..... شور شرابا اور ہنگامہ ہوتا تھا..... خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ ماں باپ اور بہنیں تو دل کے ارمان نکال رہے تھے ایک تو تھا اعظم... روپے پیسے کی کمی نہ تھی کیونکر خوشیاں نہ مناتے۔

اس رات شب حنا تھی...... لڑکیاں اور نئی بیاہی دلہنیں تو دوپہر ہی سے تیاری میں لگ گئی تھیں۔ کوئی کپڑے نکال کر دیکھ رہی تھی کوئی بال بنوانے بیوٹی پارلر جا رہی تھی..... کوئی کپڑوں کی مناسبت سے زیور کا دوسری سے تبادلہ کر رہی تھیں.....

مہندی کے تھال سجائے گئے تھے...... وردہ کے لیے پھولوں کا خوبصورت زیور بنایا گیا تھا..... نوجوان لڑکے کیمرے لیے گھوم رہے تھے...... مووی بنانے کے لیے بھی فوٹو گرافر کو آرڈر دیا جا چکا تھا۔ ’’ساری کسر آج نکال لو..... ساحرہ نے ہنستے ہوئے لڑکیوں سے کہا‘‘ ذرا رعب پڑے لڑکی والوں پر‘‘ کیوں نہیں..... ایسی سج دھج نکالیں گے..... کہ مرعوب ہو جائیں گے وہ لوگ.....‘‘

’’مرعوب تو بیچارے اب بھی ہیں‘‘

’’ہونا چاہیے...... ایسا رشتہ قسمت والوں کو ملتا ہے......‘‘ ایک ٹکے کی ڈیمانڈ نہیں.....‘‘

’’پھر بھی بیٹی کو کچھ نہ کچھ تو دیں گے ہی‘‘

’’خوشی سے دینا اور ہوتا ہے..... جبر سے وصول کرنا اور......‘‘

خوش قسمت ہیں۔

سب عورتیں باتیں کر رہی تھیں...... کچھ تو خلوص نیت سے کہہ رہی تھیں کچھ حسد سے کچھ رشک سے......‘‘

سگی بیٹیاں تھیں لیکن ایسا رشتہ ابھی تک کسی کو نہیں ملا تھا......"

مہندی کی رسم تو اتنی شاندار تھی.... کہ اس کے چرچے مہینوں بھی ہوتے تو بڑی بات نہ تھی......

شاید شاہدہ، زاہدہ، عظمیٰ اور خاندان کی دوسری لڑکیوں اور سہاگنوں نے تو شمعیں جلے مہندی کے خوبصورت تھال اٹھا اٹھا کر اتنا رقص کیا کہ سماں بندھ گیا۔

کھانا خاصا تھا۔ کچھ پُرتکلف بھی، جہیز کی قید تو رہی نہ تھی۔ کھانے پہ دل کھول کر خرچ کر لینا ضروری تھا۔ رات گئے پیلے سوتی جوڑے میں ملبوس وردہ کو سکھیاں سہیلیاں کمرے سے باہر لائیں...... پھولوں کے گہنے پہنے وہ کوئی پھولوں کے دیس کی باسی لگ رہی تھی......"

خوب ڈھولک بجی..... سہاگ گیت گائے گئے۔ وردہ کے خوبصورت ہاتھوں پر سہاگنوں نے مہندی رکھی ساحرہ نے اس کی جھولی میں مٹھائی ڈالی..... اور سینکڑوں روپے خیرات کر دیئے۔

سارا ہنگامہ رات گئے تک جاری رہا......"

پھر مہمانوں کی واپسی ہوئی۔ ساحرہ اور عابدہ آخری گاڑی میں تھیں۔ ملک اور انیسہ انہیں رخصت کرتے وقت رقت آمیز لہجے میں بولے "وردہ کو اپنا کر آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم اسے کبھی اتار نہیں سکیں گے۔ ہم آپ کے ہم پلہ نہیں ہیں...... آپ نے ذرے کو آفتاب بنانے والی بات کی ہے...... آج کل کے زمانے میں ایسے فرشتہ لوگ کہاں ملتے ہیں......"

ساحرہ ان کی باتیں سنتی رہی پھر گاڑی کا دروازہ پکڑ کر بیٹھنے سے پہلے بولی "میں آپ سے جہیز طلب نہیں کرتی..... صرف ......"

وہ چپ ہو گئی عابدہ کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا ملک صاحب اور وردہ کی امی اس کا منہ تکنے لگے......"

چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بڑے سکون سے بولی جہیز ہو نہ ہو لیکن میرے بیٹے کو

آپ گاڑی ضرور دیں......"

ملک اور انیسہ کے منہ سے تو حیرت سے کیا؟...... بھی نہ نکلا......

عابدہ ہی بولی "کیا کہہ رہی ہو ساحرہ...."

جو تم سب سن رہے ہو..... گاڑی نئی ہو......"

گاڑی!" حیرت اور پریشانی سے ملک اور انیسہ کے منہ سے نکلا......"

ہاں ملک صاحب...... وقت کا تقاضا ہے...... میرے بیٹے کے لیے گاڑی ضرور لائیے آپ کی بیٹی......

"لیکن ......"

"دیکھیئے بھائی صاحب رات بہت ہو چکی ہے...... میرا گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ ابھی جا کر ان کے سونے کا بندوبست بھی کرنا ہے...... ہمیں اجازت دیں......"

"لیکن..... لیکن....." وردہ کی امی گھگھائی......

ساحرہ گاڑی میں بیٹھ گئی...... گاڑی چلانے کو کہا......

ملک صاحب نے دوڑ کر گاڑی کی کھڑکی پر ہاتھ رکھ دیئے...... روہانسے ہوئے بولے ہماری حیثیت کہاں ہے گاڑی دینے کی......"

"پھر آپ تو جہیز......" وردہ کی امی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے صرف یہی کہہ سکی۔

ساحرہ کمال سفاکی سے بولی میں نے جو کہہ دیا ہے وہ آپ پورا کریں..... گاڑی دیں گے تو بارات آئے گی نہیں تو رشتہ......"

"ہائے یہ....." وردہ کی امی نے سینے پر ہاتھ مارا......"

کل کسی وقت آ کر بات کر لیں..... اس وقت ہمیں اجازت دیں" ساحرہ کی امی نے دونوں سے کہا پھر ڈرائیور سے بولی، چلو بھئی......

گاڑی چلی..... اس نے دونوں کو خدا حافظ کہا، دونوں تو ساکت ہوگئے تھے..... جواب بھی نہ دے سکے ان پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی..... ساحرہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ گاڑی ملے تو بارات آئے گی ورنہ رشتہ ٹوٹ جائے گا.....“

دونوں کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا تھا..... شادی میں صرف کل کا دن رہ گیا تھا... اور اس ایک دن میں یہ ناجائز فرمائش پوری کرنے کا امکان ہی کہاں تھا.....“

دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔ وردہ کی امی تو جیسے پتھرا گئی تھی..... گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے دنوں سے شادی کے ہنگامے ہو رہے تھے..... اب..... عین..... وقت پر ..... جبکہ وردہ کے ہاتھوں پر اعظم کے نام کی مہندی کا رنگ چڑھ رہا تھا..... یہ ناقابل عمل مرحلہ آن پڑا تھا جسے کسی طور حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رات دونوں نے..... تڑپ تڑپ کر کاٹی.....

صبح ملک صاحب نے کہا میں ان کے ہاں جاتا ہوں۔ عجیب عورت ہے..... عین وقت پر دھوکہ دیا.....“

”غصہ دکھاؤ گے تو معاملہ بگڑے گا.....“

تو کیا کروں“

”منت سماجت ہی ہو سکتی ہے“

”یہ سراسر زیادتی ہے.....“

”بیٹی کا معاملہ ہے..... اس معصوم کی خوشیوں میں آگ لگ جائے گی..... اسی کی خاطر جاؤ ان کے ہاں..... انہیں عجز و انکساری سے قائل کرو.....“

وردہ کی امی نے رو رو کر اسے سمجھایا..... بات کی نزاکت ملک صاحب کی سمجھ سے باہر تو نہیں تھی، وہ تو دکھ اور غصے میں یہ سب کچھ کہہ رہے تھے..... بیٹیوں کے معاملے کتنے نازک ہوتے ہیں وہ جانتے تھے۔ اس وقت وردہ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ تو یہ ذلت اس کی شخصیت پر چھاپ

بن کر رہ جائے گی.....“

ملک صاحب ساحرہ کے پاس آئے تو مرقعہ یاس بنے تھے۔ لگتا تھا کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہے۔ ٹھیک طرح سے بات نہ نکلتی تھی ساحرہ نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا تھا صرف عابدہ خان اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ملک صاحب روہانسی آواز میں ہاتھ جوڑ کر ساحرہ سے کہہ رہے تھے.....“ خدا کے لیے اپنے قول پر قائم رہیے.....“ ہم گاڑی نہیں دے سکتے۔ اور شادی ٹوٹنے کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم اور ہماری بچی بے موت مر جائیں گے بہن.....“

وہ کافی دیر بے آنسوؤں سے روتے گریہ زاری کرتے رہے۔ ساحرہ صوفے پر بڑے آرام سے بیٹھی سن رہی تھی۔ عابدہ کا دل پس رہا تھا لیکن وہ کچھ کہہ نہ پا رہی تھی.....“

ساحرہ داد و فریاد سننے کے بعد تیز نظریں ملک صاحب پر ڈالتے ہوئے بولی کچھ احساس ہوا ملک صاحب کہ لوگ بے موت کیسے مر جاتے ہیں..... بیٹیاں کیا چیز ہوتی ہیں۔ اور ان کے سپنے ٹوٹ جائیں تو ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

ملک صاحب نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ساحرہ کو دیکھا اس طنز کو کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ صرف حیرانگی سے اسے تکتے رہے۔

”ہاں ملک صاحب“ آپ کے لیے یہ بات انوکھی تو نہیں ہونی چاہیے۔

”جی..... جی..... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں..... میں..... میں.....

ساحرہ تمسخر سے ہنسی..... پھر بولی..... میں نے کوئی نئی بات نہیں کی صرف اک پرانی بات دہرائی ہے.....

جی..... پرانی..... بات.....

”بھول چکے ہیں..... بھول گئے آپ..... پچیس چھبیس سال پہلے کی بات..... جب آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے شادی سے ایک دن پہلے اسی طرح کا مطالبہ کیا تھا..... موٹر سائیکل مانگا تھا جہیز میں..... جو نہ ملنے کی بنا پر شادی توڑ دی تھی.....

بارات کا کھانا پکا تھا...... لوگ جمع ہوئے تھے...... شادی کا ہنگامہ عروج پر پہنچا تھا لیکن یہ شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ لڑکی کے مجبور والدین کوشش کے باوجود بھی یہ مطالبہ اس وقت پورا نہ کر سکے تھے..... لڑکی کی ماں اس صدمے سے مرگئی تھی ملک صاحب..... اور..... اور..... باپ.....

" لیکن..... لیکن آپ..... آپ کیسے......

" ایسے کہ وہ لڑکی جو ٹھکرائی گئی تھی...... وہ..... میں ہوں.....

ملک صاحب اچھل پڑے..... پھر بے دم سے ہوکر اسے تکنے لگے..... آپ... آپ..... پ..... پ

" جی ہاں میں...... ساحرہ نام شاید آپ کے ذہن میں ابھی دھول تلے.....

" آپ.... آپ....." ملک نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا..... کئی گھڑیاں وہ اسی حالت میں بیٹھے رہے..... عابدہ خاموش بیٹھی رہی اور ساحرہ سکون واطمینان کے گہرے گہرے سانس لیتی رہی......

پھر ملک صاحب اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے مریل سی آواز میں بولے مجھے معاف کر دیں بہن..... غلطیوں کی سزا میری بیٹی کو نہ دیں...... خدا کے لیے نہ دیں..... میری بچی.... وہ بے اختیار ہوکر سسکنے لگے...... عابدہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ملک صاحب بھرائی ہوئی آواز اور رُکتے رُکتے لہجے میں بولے" تب جو کچھ ہوا ہے میری ماں بہنوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ قصور میرا بھی تھا..... لیکن بخدا اس قصور کی سزا میری بچی کو نہ دیں..... میری بچی..... میری وردہ بے موت مر جائے گی بہن...... اس صدمے سے مر جائے گی۔

ساحرہ کے چہرے پر ایک پاکیزہ سا وقار تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی میں وردہ کو بے موت مرنے نہیں دوں گی اس لیے کہ وہ اب میری بیٹی ہے.....

ملک صاحب نے چہرہ اٹھایا بے یقینی سے ساحرہ کو دیکھا......

ساحرہ مسکرا دی..... سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مشفق لہجے میں بولی" "ملک صاحب ...... میں اپنے گھر میں شاد آباد ہوں..... احمد صاحب جیسا شوہر پانا میری خوش بختی ہے لیکن میری شادی ٹوٹنے اور ہونے کے درمیان جو عرصہ میں نے گزارا تھا اپنی ماں کو بے موت مرتے دیکھا تھا۔ باپ کی کمر ٹوٹتے دیکھی تھی اس کی خلش اب تک میرے ذہن میں تھی.... اس خلش کو مٹانے کے لیے میں نے جہیز کے خلاف آواز اٹھائی...... کئی گھر میری کوشش اور تگ ودو سے آباد ہوئے ہیں۔

ہاں ملک صاحب" عابدہ نے تائید کی" ان کے اس سوشل ورک میں میں بھی شریک ہوں...... ان کا مشن ہی بے جہیز کے شادیاں کروانا ہے..... وہ تو..... اتفاق ہی سے انہیں اس دن پتہ چل گیا کہ آپ وہی تسلیم احمد ہیں جنہوں نے شادی سے ایک دن پہلے سکوٹر کی فرمائش کردی تھی اور یہ نہ ملنے پر شادی توڑ دی تھی، ساحرہ نے آپ کو سبق سکھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا، ورنہ ساحرہ اور موٹر گاڑی لانے کی فرمائش کرے....."

ملک صاحب کا سر ندامت سے جھک گیا، ان کی آنکھیں نم ہوگئیں..... اظہار تشکر کے لیے بھی منہ سے ایک لفظ نہ نکلا زبان گنگ ہوگئی تھی۔

ساحرہ نے مسکراتے ہوئے کہا" میں نے اپنے دل کی خلش مٹالی ہے ایک رات جو آپ نے کاٹی ہے۔ اس کا مجھے اندازہ اور احساس ہے..... اب جائیے بھائی صاحب...... کل بارات ہے..... میں اپنی بہو کو سر آنکھوں پر بٹھا کر لاؤں گی..... جہیز کی کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں آئے گی اگر آپ نے کچھ بنایا ہے تو دوسرے بچوں کے لیے رہنے دیجئے گا....."

ساحرہ بہن..... تسلیم احمد اُٹھے اور ساحرہ کے قدموں میں گر جانا چاہا لیکن ساحرہ نے انہیں روک دیا..... ملک صاحب نے بڑے عاجزانہ طریق سے ہاتھ باندھ دیئے سر جھکا لیا اور ندامت کے دو آنسو اُن کی آنکھوں سے لڑھک گئے۔

خدا کی لاٹھی

جب سے اس نے شبینہ غنی کو دیکھا تھا۔ تذبذب میں پڑی تھی۔ شبینہ کو خالی دیکھا ہی ہوتا تو شاید اس طرح تذبذب نہ ہوتا..... لیکن راحت بیگم نے تو پارٹی میں اسے شبینہ غنی دکھاتے ہوئے کہا تھا " دیکھی ہے یہ لڑکی .... کتنی خوبصورت اور سمارٹ ہے۔ رنگت میدے اور سندور کی گندھی ہے۔ نین نقش کتنے کٹیلے ہیں۔ اور ہے بھی لاکھوں پتی والدین کی اکلوتی بیٹی۔ جہیز تو پتہ نہیں کب سے بن رہا ہے۔ سنا ہے۔ کوٹھی تیار ہو رہی ہے اس کی۔ گاڑی تو اب بھی اڑائے پھرتی ہے۔ بہت مال ملے گا..... خوش قسمت ہو گا وہ لڑکا جو اسے بیاہنے آئے گا....."

"ابھی کہیں رشتہ نہیں ہوا.....؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں..... تلاش کر رہے ہیں اس کی امی تو جب بھی مجھ سے ملتی ہے یہی کہتی ہے۔ کوئی رشتہ ڈھونڈو شبینہ کے لیے..... بس لڑکا ہینڈسم اور پڑھا لکھا ہو..... پیسہ دلیہ ہو نہ ہو۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور ہمارے پاس جو کچھ ہے شبینہ ہی کا تو ہے....."

"پھر تم نے تلاش کیا کوئی رشتہ....."

راحت بیگم نے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا " رشتہ تو تھا لیکن افسوس کہ دیر ہو گئی....."

"کیا مطلب؟"

"مطلب نہیں سمجھیں....."

اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ تو راحت بیگم نے سر اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے ہولے سے کہا تھا " میرا مطلب تھا شاہدہ کہ اگر اپنے رضی کا رشتہ نہ ہو گیا ہوتا..... تو....."

"تو....."

"ہائے ہائے..... نہ ہو گیا ہوتا تو شبینہ کیا بُری تھی....."

"تمہارا مطلب ہے میرے بیٹے کا اس لڑکی سے رشتہ کروا سکتی تھیں....؟"

"کیوں نہیں۔ اپنا رضی لاکھوں میں ایک ہے۔ انتہائی شریف خوبرو۔ اونچا لمبا گھبرو جوان، سی ایس ایس کر کے اب تو ماشاء اللہ اتنی اچھی نوکری پر بھی لگ گیا ہے....."

وہ چپ ہو گئی

"اب تو..... خیر....."

"شادی کب کر رہی ہو رضی کی"

"ابھی..... ابھی نہیں....."

"مجھے اپنے اتنے لائق فائق بیٹے کے لیے وہی کنگلے ملے تھے؟"

"ہاں..... تو..... وہ....." وہ ہڑبڑا گئی تھی۔ راحت بیگم کی باتوں نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔

شان کلب میں عید ملن پارٹی تھی راحت بیگم اس کلب کی ممبر تھی۔ اسی کلب میں اس کی ملاقات بیگم رابعہ غنی سے ہوئی تھی۔ غنی صاحب بڑے امیر کبیر آدمی تھے صاحب جائداد تھے اور شیشے کی بہت بڑی فیکٹری کے مالک تھے۔ رابعہ بڑی سوشل اور تیز طرار عورت تھی۔ اس کلب میں اپنی ہوشیاری اور دولت کی وجہ سے اسے اک منفرد مقام حاصل تھا..... اپنی دولت کا اظہار کرنے کا بھی اسے سلیقہ آتا تھا۔ نت نئی ساڑھیاں اور نئے نئے زیورات ..... پہن کر آتی تھی۔ ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں اور ٹاپس بھی نئے ہی ہوتے تھے..... عورتیں اس

سے خاصی مرعوب تھیں۔

شبینہ نے انہی دنوں گریجوایشن کیا تھا۔ بڑی طرحدار لڑکی تھی۔ خوش خلقی کی تربیت اسے ماں نے دی تھی...... اسی لیے کلب کی عورتوں کی وہ منظور نظر تھی۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں گو اچھے اور متمول گھرانوں سے ہی تعلق رکھتی تھیں لیکن سب اس سے کسی نہ کسی طور دبتی تھیں ...... یوں شبینہ کو بھی اپنے کچھ ہونے کا احساس تھا...... مرعوب ہونے والی شخصیت نہیں تھی۔

شبینہ شکل وصورت کی بھی اچھی تھی۔ بے حد سمارٹ بھی تھی۔ اونچے طبقے کی ماڈرن لڑکیوں کی ساری صفات اس میں تھیں۔ پس منظر بھی بڑا سنہرا روپہلا تھا...... لیکن ابھی تک رشتہ کہیں طے نہیں ہوا تھا..... اس کی خود اعتمادی جو غرور کی حدوں کو چھوتی تھی۔ یہی بات حارج ہو جاتی تھی۔ رابعہ اس کے لیے کسی ایسے لڑکے کی تلاش میں تھی جو اس کی دولت سے مرعوب ہو کر اس سے دبتا رہے..... اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکے...... مرعوب و متاثر ہو کر جھکا رہے۔

ایسے لڑکے اسے غریب یا متوسط گھرانوں ہی میں مل سکتے تھے۔ جن کے پاس شرافت ہوتی ہے لیاقت ہوتی ہے۔ صرف دولت نہیں ہوتی...... دولت کی آسائشوں اور سہولتوں کو وہ جانتے ہیں لیکن اسے حاصل نہیں کر پاتے...... ایسے لڑکے آسانی سے نہ سہی پھر بھی ہاتھ آ جاتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دولت کے سامنے جھکنے کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ ایسے لڑکے تو بے شک قابو میں نہیں آتے لیکن شادی کے ذریعے دولت حاصل کرنے کے آسان طریق کو آزمانے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔

راحت بیگم کی رابعہ غنی سے ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں بدل گئی تھی۔

راحت شاہدہ کی دور کی رشتہ دار تھی۔ لیکن چند ماہ سے دونوں قریب رہ رہی تھیں۔ اس لیے میل ملاپ بڑھ گیا تھا۔ رضا کو نئی نوکری ملی تھی۔ رہائش کے لیے بنگلہ ملا تھا۔ یہ بنگلہ راحت کی کوٹھی سے قریب تھا۔ شاہدہ پہلے اندرون شہر اک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر تھی۔ بیٹا بڑا افسر بن گیا تھا۔ گاڑی بنگلہ ملے تھے۔ اسے اب اندرون شہر تنگ گلیوں کے

تاریک مکان میں رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ مکان بدلا۔ جگہ بدلی تو خیالات بھی بدلے مزاجوں کے تیور بھی بدل گئے۔ طرز رہائش بھی بدلا۔ گلی محلوں میں رہنے والوں کی اپنی ہی سوچ ہوتی ہے۔ اپنا ہی طرز زندگی ہوتا ہے۔ اس اختلاف کو مٹانا ہو تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن شاہدہ اور اس کے تینوں بچوں نے نیا طرز زندگی اس طرح اپنا لیا تھا کہ وقت کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس کی جوان بیٹی رافیہ تو لگتا تھا اسی ماحول کی پروردہ ہے۔ یہی حال رضی اور چھوٹے بیٹے رضا کا تھا۔ کوئی انہیں دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ تنگ و تاریک گلیوں کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے باسی ہیں۔

رضی نے ایم اے کر کے ایک معمولی سی نوکری کر لی تھی۔ لیکن مستقبل کو درخشاں اور آسودہ بنانے کا عزم تھا۔ اس لیے مقابلے کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا..... انہی دنوں شاہدہ نے اس کی منگنی اپنے ایسے ہی لوگوں میں کر دی تھی۔ رضی تو ابھی ان بندھنوں میں بندھنا نہیں چاہتا تھا لیکن ہر ماں کی طرح شاہدہ کو بھی بیٹے کے سہرے کے پھول دیکھنے کی تمنا تھی۔ ثمینہ قبول صورت تھی ایف اے کر چکی تھی۔ باپ فوت ہو چکا تھا۔ دو چھوٹے بھائی زیر تعلیم تھے۔ گزر بسر مشکل ہی سے ہو رہی تھی۔ شاہدہ کی سہیلی نے یہ رشتہ کروایا تھا۔

"لڑکی بہت اچھی ہے۔ نہایت سلیقہ شعار اور خدمت گزار ہے تیرے گھر میں آ گئی تو تیری ساری ذمہ داری سر لے لے گی دیکھ لینا کام کو ہاتھ نہیں لگانے دے گی..... بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے تجھے ایسی ہی لڑکی بہو بنا کر لانا چاہیے۔ غریب ہے دب کر بھی رہے گی۔ شوہر تیرا بے کار ہے جوان کی بیٹی ہے چھوٹا بیٹا ہے ایسی بہو آ گئی جو تیرے بیٹے کو اڑا لے گی۔ تو کیا کرے گی تو...."

"ہاں واقعی۔ مجھے ایسی لڑکی چاہیے جو ہمارے ساتھ مل جل کر رہے ہمارے بار بانٹے ..... ہمارا آسرا تو اب رضی ہی ہے۔ رضی کے ابا کی تھوڑی سی پنشن سے تو کام نہیں چلے گا۔"

"بس پھر اللہ کا نام لے کر بنا لے اسے بہو..... فائدے میں رہے گی"

شاہدہ نے ثمینہ کے لیے ہاں کہہ دی۔ اور یوں چھوٹی سی تقریب میں رضی اور ثمینہ کی منگنی طے پا گئی۔

لیکن

اب

اب اس نے شبینہ غنی کو دیکھا تھا۔ جس کے لیے رشتے کی تلاش تھی جیسا رشتہ چاہیے تھا۔ اس کا رضی اس پر پورا اترتا تھا.....

لیکن

وہ

رضی کا رشتہ پہلے ہی طے کر چکی تھی ثمینہ کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنا چکی تھی اب کیا کرے وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"امی آپ کچھ پریشان ہیں ..... اس دن رافیہ نے پوچھا..... تو اس نے ساری بات رافیہ کو بتاتے ہوئے کہا "شبینہ کو دیکھا ہے نا..... کتنی خوبصورت ہے..... کوٹھی ملے گی جہیز میں..... گاڑی بھی..... اتنا بڑا جہیز ملے گا..... ذرا سوچ تو یہ رشتہ ہم کرلیں..... تو....."

"لیکن امی..... بھائی جان کی منگنی تو ہو چکی ہے..... اب"

"اب کیا نہیں ہو سکتا..... بس جھجک ہی آتی ہے۔ لیکن میں یہ رشتہ چھوڑنے کی نہیں ..... سوچ تو سہی..... بیٹھے بٹھائے اتنا کچھ مل جائے..... کوٹھی اپنی ہو جائے..... زندگی ہی بدل جائے....."

"لیکن....."

"لیکن ویکن کیا..... مجھے صلاح دے تو..... توڑ دیں منگنی....؟"

"آپ کی مرضی..... بھائی جان سے پوچھ لیں....؟"

"اسے کیا پوچھنا..... اس کی شادی ہی کرنا ہے نا۔ جہاں میں چاہوں کر دوں۔"

"پھر تذبذب کیسا..... اُٹھا لیں یہ قدم..... ویسے امی شبینہ ہے بہت پیاری پیاری....."

"پیاری اور دولت مند بھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے جتنا دھن دولت بھی ہے ماں باپ کے پاس اسی کا ہے"

رافیہ کی آنکھیں پھیل سی گئیں..... جھٹ سے بولی "شادی یہاں کرلیں تو پھر سب کچھ ہمارا ہو جائے گا امی....."

"اور کیا....؟"

رافیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں "پھر تو یہ رشتہ ضرور کرلیں امی"

"لیکن ثمینہ کا سوچتی ہوں تو....."

"ایک فیصلہ کرلیں بس..... سوچنا چھوڑ دیں....."

"جواب دے دوں۔ ثمینہ سے منگنی توڑ دوں"

"شبینہ سے رشتہ کرنا ہے تو بالکل توڑ دیں"

شاہدہ کئی دنوں سے اپنے ضمیر سے لڑ رہی تھی۔ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی تھی لیکن رافیہ نے اسے اس صورت حال سے نکال لیا..... وہ رافیہ کا سہارا لے کر ہی اپنے ضمیر کو سلانے میں کامیاب ہو سکی۔ پھر اس نے یہ منگنی توڑ ڈالی۔ بلا وجہ بلا قصور..... اک معصوم اور بے گناہ لڑکی کے سنہرے رنگ پہلے خواب چکنا چور کر دیے۔ اک بیوہ ماں کو بلا جواز اتنی بڑی سزا دے ڈالی۔ اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی..... منگنی توڑنے کی اطلاع پا کر تو وہ جیسے حواس ہی کھو بیٹھی۔ وہ تو پائی پائی جوڑ کر بیٹی کے جہیز کی تیاریاں کر رہی تھی..... رضی اب بڑا افسر بن گیا تھا۔ اسے وہ اپنی بیٹی کا بلند نصیبہ تصور کر رہی تھی۔ کتنی خوش تھیں ماں بیٹی.....

لیکن

شاہدہ نے اپنی طمع کی خاطر ان کی خوشیوں کے منہ نوچ لیے تھے۔

ثبینہ کی امی کے حواس کچھ ٹھکانے آئے تو وہ بھاگم بھاگ شاہدہ کے پاس آئی۔

"یہ کیا ظلم کیا ہے بہن..... یتیم بچی کو اس طرح کیوں دھتکارا ہے۔ کیا قصور ہوا ہم سے۔ کیا غلطی کی ہم نے۔ کچھ تو بتاؤ..... کچھ تو کہو....."

وہ گڑگڑا کر شاہدہ سے پوچھ رہی تھی..... آنسو تسلسل سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ شاہدہ کا من چور تھا۔ اس سے نگاہ ملا کر بات نہ کر سکتی تھی۔ رونے دھونے اور گڑگڑانے سے ضمیر کی زخم خوردہ تھی۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم تھی۔

اس کی خاموشی پر ثمینہ کی امی کا دل جل رہا تھا۔

"اتنا ظلم نہ کرو..... یتیم بچی اور بیوہ ماں کی آہیں....."

"اب بس بھی کرو....." شاہدہ کو غصہ آگیا بڑے تلخ لہجے میں بولی "لوگ تو نکاح تک توڑ دیتے ہیں یہ تو معمولی سی منگنی تھی۔ تقدیر میں یہ جوڑ نہیں تھا۔ بس..... اپنے دل کو یہی سمجھا لو....."

"دل کو کیسے سمجھالوں....."

"میں نہیں جانتی...... بس یہ رشتہ ختم ہے....."

"تمہارے سینے میں اک ماں کا دل نہیں ہے..... تم بھی اک جوان بیٹی کی ماں ہو۔ دل پر ہاتھ رکھ کر....."

"بس بس..... زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں میری بیٹی کی بات مت کرو۔

"ایسا تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے..... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے..... بہن..... ایسا تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

وہ جھنجلا کر بولی" ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری بیٹی ماشاء اللہ خوبصورت ہے۔ کیا کمی ہے اس میں۔ تعلیم یافتہ ہے سمارٹ ہے اور ایک بہت بڑے افسر کی بہن ہے سمجھیں....."

"کوئی بڑی آسامی دیکھ لی ہے تم نے شاید"

"ہاں دیکھ لی ہے..... پھر....."

"پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جیسا کر رہی ہو ویسا پاؤ گی"

"ہونہہ....." شاہدہ نے اسے بڑے غرور سے دھتکار دیا۔ وہ روتی دھوتی آہیں بھرتی ناکام و نامراد لوٹ گئی۔

منگنی ٹوٹنے کا رضی کو پتہ چلا تو حیران ہو کر ماں سے پوچھا "کیوں امی..... ایسا کیوں ہوا....."

اور شاہدہ نے بیٹے کی بحث و تکرار سے بچنے کے لیے جلدی سے کہہ دیا..." میں کیا جانوں۔ کیوں توڑ دی انہوں نے منگنی....."

"انہوں نے توڑ دی....."

"ہاں! لیکن تو فکر نہ کر بیٹے میں ہفتہ کے اندر اندر ہی تیرے لیے ایسی لڑکی ڈھونڈ لاؤں گی کہ دنیا دیکھے گی"

شاہدہ نے اسی دن راحت سے کہہ دیا کہ رضی کے لیے شبینہ کا رشتہ چاہتی ہے۔

"اور وہ منگنی....." راحت بیگم نے پوچھا۔

"ٹوٹ گئی" شاہدہ ہنس کر بولی۔

"خود بخود....."

"یہی سمجھو....."

چلو اچھا ہوا۔ اب ہم اپنے رضی کی دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ فکر نہ کرو۔ یہ رشتہ طے ہی سمجھو......

"کب لے چلو گی ہمیں ان کے ہاں....."

"میں پہلے رابعہ سے بات کر لوں....."

"ٹھیک ہے۔ مجھے اطلاع کر دینا....."

"اچھا......"

راحت نے اسی شام رابعہ سے بات کی۔ رابعہ نے رضی کے متعلق اس سے پوری تفصیل سے پوچھا ہر طرح سے یہ رشتہ شبینہ کے لیے موزوں تھا۔ اس نے راحت سے کہہ دیا

"لڑکے والے جب چاہیں آجائیں ہم چشم براہ ہوں گے۔"

راحت شاہدہ اور رافیہ کو لے کر اگلے ہی دن ان کی شاندار رہائش گاہ پر جا پہنچی۔ چار کینال کے وسیع و عریض رقبے پر پھیلی یہ شاندار کوٹھی آراستہ و پیراستہ تھی۔ امارت منہ سے بول رہی۔ شاہدہ اور رافیہ کی تو آنکھیں جیسے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ یہ لوگ تو ان کے تصور کی حد سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ماں بیٹی ایک دوسری کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خوش کن اشارے کر رہی تھیں۔

رابعہ غنی نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ بچھ بچھ گئی۔

رشتے کی بات چلی۔ رابعہ ساری تفصیل راحت سے جان چکی تھی پھر بھی اپنی تسلّی کے لیے شاہدہ سے سب کچھ پوچھا۔

شاہدہ ہنس کر بولی "بہن سچی بات۔ کہ ہم لوگ آپ کے لائق نہیں۔ سفید پوشی کا بھرم ہی ہے ہاں ایک لائق شریف اور پیارا سا بیٹا ہی ہے......"

رابعہ نے ہنس کر جواب دیا "بس ہمیں بھی پیارا سا بیٹا ہی چاہیے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس صرف بیٹے ہی کی کمی ہے......"

"اور یہ بیٹا......" راحت نے مسکرا کر کہا ہیرا ہے ہیرا۔ لائق نیک سیرت اور خوبصورت۔ بہت بڑا افسر ہے۔

"افسری کو چھوڑو بہن..... اتنی تنخواہ سے تو ہماری بیٹی کا خرچ بھی نہیں چلے گا" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو..... شاہدہ گھبرا کر بولی"

"ہم اپنے بیٹے ہی کے تو منتظر ہیں......" رابعہ نے مسکرا کر کہا "پڑھا لکھا لڑکا چاہیے۔ پیسے کی کمی نہیں۔ اپنا تو بیٹا ہے نہیں داماد کو بھی بیٹا ہی بننا ہوگا"

"بالکل...... بالکل......" شاہدہ نے کہا

ہمارے بیٹے کو نوکری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ بولی "ہمارا سارا کاروبار وہی تو سنبھالے گا......"

شاہدہ نے اطمینان کی گہری سانس لے کر رافیہ کو دیکھا جو شبینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی شاندار سی چائے پینے کے بعد راحت شاہدہ اور رافیہ گھر جانے کے لیے اُٹھیں۔

شاہدہ نے انکساری سے پوچھا "ہم پھر کب آئیں"

رابعہ مسکرائی..... رشتہ تو اسے پسند آ ہی گیا تھا تکلفاً نہ کارروائی کرنا تھی اس لیے بولی

"بیٹی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے سوچ کر جواب دیں گے"

"آنٹی جواب ہاں میں ہوگا" رافیہ نے مسکرا کر کہا۔

"قسمت ہوئی تو ضرور ہوگا بیٹی" رابعہ نے اسے پیار سے دیکھا۔

"آپ جہاں سے چاہیں ہمارے بیٹے کے متعلق پوچھ گچھ کر سکتی ہیں" شاہدہ نے کہا۔

"انشاء اللہ ہیرا ہیرے کی طرح ہی چمکے گا......"

"خدا کرے" اس نے کہا۔

شاہدہ اور رافیہ حسین توقعات لے کر گھر آئیں۔ دونوں بہت خوش تھیں۔ شبینہ اور اس کے خوبصورت اور سجے سجائے گھر کی تعریفیں کرتے نہ تھک رہی تھیں ان کی بے اندازہ دولت کا تو انہیں اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی مرعوب تو تھیں ساری باتیں رضی اور ابا کے گوش گزار کر رہی تھیں۔

"یہ رشتہ ہو گیا تو عیش ہو جائے گی ہماری" شاہدہ بولی۔

"لاٹری نکل آئے گی لاٹری......" رافیہ نے کہا۔

"لاکھوں کا کاروبار ہے۔ وہ رضی کے سپرد کر دیں گے۔ ایک ہی تو بیٹی ہے ان کی" شاہدہ بولی۔

"تو کیا میں نوکری چھوڑ دوں گا......" رضی نے حیرت سے انہیں دیکھا

"اے نوکری کیا ہے رضی" شاہدہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ لاکھوں کی آمدن ہے ان کی ...... تجھے کہاں نوکری کرنے دیں گے۔ تو ہی تو ان کا سہارا ہوگا۔ سارا کاروبار تجھے ہی تو سنبھالنا ہوگا۔ بھول جائے گا اس نوکری کو......"

ماں بیٹی مرعوب و مسحور تھیں۔ انہوں نے رضی کو بھی قائل کر لیا اور بیکار اور بیمار ابا تو کسی گنتی میں تھے ہی نہیں۔ ہاتھ آتی دولت کو چھوڑنے کے حق میں کون آواز اُٹھا سکتا ہے بھلا......

اگلے ہی ہفتے بات پکی ہو گئی۔ رابعہ اور غنی صاحب کو یہ رشتہ پسند تھا۔ شبینہ اور رضی کو بھی ایک دوسرے سے متعارف کروا دیا گیا امیر اور ماڈرن لوگ تھے۔ لڑکی لڑکے کو ملنے کی آپس میں اجازت دے دی گئی۔ شبینہ کو رضی پسند آیا تھا اور رضی تو شبینہ کو دیکھ کر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ کسی لڑکی سے یوں ملنے کا اس کا پہلا اتفاق تھا۔ اور لڑکی بھی ایسی۔

......خوش گفتار خوش اطوار......خوش ذوق......خوش پوش...... اس کے سنگ جینا تو کیا مرنا بھی حسین تھا......

منگنی اتنی دھوم سے ہوئی کہ رضی یا شاہدہ نے اتنی دھوم سے شادی کا بھی تصو نہ کیا۔ اس منگنی پر شاہدہ اور اس کے گھر والوں کو اتنا کچھ ملا کہ وہ خوشی سے بہک بہک گئیں۔ جوڑے زیور مٹھائیاں کچھ شمار ہی نہ تھا اتنی عزت افزائی ہوئی تھی خوشی سے بہکنا تھا......

تین ماہ بعد شادی ہونا قرار پائی۔

تین ماہ تیاری کے لیے درکار تھے اس عرصے میں شبینہ اور رضی ملنے جلنے میں آزاد تھے۔ رضی تقریباً روز ہی ان کے ہاں جاتا۔ شبینہ کی کشش کھینچ لاتی دونوں کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ کبھی کسی ریسٹورنٹ میں چائے پیتے۔ کبھی کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے۔ دونوں بہت خوش تھے۔ شادی بھی بے حد دھوم دھام سے ہوئی۔

شبینہ ہیرے موتی اور زیورات سے لدی بھاری عروسی جوڑے میں سجی رضی کے حجلہ عروسی میں آ گئی۔ اس کا سارا جہیز اس نئی کوٹھی میں سیٹ کیا گیا تھا جو اسے شادی پر والدین کی طرف سے بطور خاص دی گئی تھی۔ اس بنگلے میں اس کے ساتھ صرف ضرورت کی چند چیزیں بھیجی گئی تھیں کیونکہ اگلے دن ولیمہ تھا اور اس کے بعد دونوں کو ہنی مون کے لیے یورپ چلے جانا تھا۔

شاہدہ اور رافیہ کا تو خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہا تھا۔ شبینہ کی صورت میں دولت کی گٹھڑی ان کے ہاں آ گئی تھی......یہ ان کے لیے خوش بختی کا نشان بن کر آئی تھی اس لیے بھی کہ شادی کے دن مسز ناظم نے رافیہ کو دیکھا تھا اور اپنے بیٹے راحیل کے لیے جو امریکہ ٹریننگ کے لیے گیا ہوا تھا پسند کر لیا تھا...... مسز ناظم نے ولیمے والے دن ہی شاہدہ پر اپنی مرضی واضح کر دی تھی۔ اور اس رشتے کی خواہش بڑی چاہت سے کی تھی۔

رضی اور شبینہ یورپ کی رنگین و حسین فضاؤں میں خوشیاں لوٹ رہے تھے۔ کہ پیچھے رافیہ کی منگنی راحیل سے کر دی گئی اور ابا خاموشی سے ہی ایک دن بیٹے اور بیٹی کی خوشگوار زندگی کا تصور اور خوشی سینے میں چھپا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔

شاہدہ اور بچوں کے لیے ابا کی جدائی کا صدمہ بہت بڑا تھا۔ لیکن انہیں خوشیاں بھی بے حساب ملی تھیں اس لیے دل سنبھالا...... رابعہ اور غنی تعزیت کے لیے آئے تو کچھ پریشان تھے۔ مبادا ان کی بیٹی کو اہل خانہ سبز قدم قرار دے دیں۔

لیکن

دھن والوں کو کبھی کوئی ایسے کہہ سکتا ہے رابعہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو شاہدہ نے انتا برا منایا" قسمت کا لکھا تھا یہ سب۔ پھر ہم کوئی جاہل لوگ ہیں جو ایسا کہیں گے ہماری بہو تو لکشمی ہے خوش بختی کی علامت بن کر آئی ہے۔ رافیہ کا رشتہ اتنی اچھی جگہ ہوا ہے کیا یہ کوئی کم بات ہے رابعہ اور غنی نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

رضی اور شبینہ تین ماہ گھوم پھر کر واپس آئے تو بے حد خوش تھے گو رضی کو ابا کی موت کا دکھ ہوا تھا لیکن یہ دکھ ایسا نہیں تھا کہ مہینوں خوشیوں کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھے رو دھو کر سب نے دل کی بھڑاس نکال لی پھر ابا کی باتوں کی بجائے سب دونوں سے ان کے خوشگوار سفر کی باتیں کرنے لگے ..... ہر اس ملک کی باتیں تجسس اور شوق سے پوچھنے لگے جہاں جہاں وہ گئے اور ٹھہرے تھے۔

شبینہ سب کے لیے تحائف بھی لائی تھی خوبصورت چھوٹے موٹے تحائف پاکر سب شبینہ کی تعریفیں کرنے لگے اتنی اچھی بہو اور اتنی پیاری بھابی پاکر خوش تو ہونا ہی تھا۔

اگلے دن شبینہ اور رضی ممی ڈیڈی سے ملنے گئے تین چار دن وہیں رہے شبینہ کو خوش دیکھ کر ماں باپ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

پھر

کئی دن بڑے پُرامن بڑے پُرسکون اور خوشیوں سے بھرپور گزر گئے شبینہ اور رضی ایک دوسرے کی رفاقت سے مسحور تھے۔ ایک دن بھی ایک دوسرے سے جدا نہ رہ سکتے تھے۔ جہاں جاتے تو اکٹھے جاتے۔ زندگی کا رومانی اور جذباتی دور تھا جب جذبات کے دھارے کچھ ٹھہراؤ میں آئے تو رضی نے اپنے مستقبل کا سوچا۔ شبینہ سے بات کی۔ ڈیڈی سے صلاح لی۔

" تم نوکری چھوڑ دو بیٹے....." ڈیڈی نے کہا۔ میرا کاروبار بہت وسیع ہے ابھی میں تمہارے ساتھ کام کر سکتا ہوں۔ تمہیں کاروبار کا تجربہ نہیں ہے میرے ساتھ رہ کر تم تجربہ حاصل

کرو۔ یہ ایک طرح کی ٹریننگ بھی ہو گی۔ پھر جب تم سارا بار اُٹھانے کے قابل ہو جاؤ گے تو میں ریٹائر ہو جاؤں گا..... سمجھے....."

" لیکن ڈیڈی....."

" کیا؟"

" نوکری چھوڑ کر میں....."

" تم بے کار نہیں ہو گے کام کرو گے"

" میرا مطلب اپنے گھر والوں سے ہے۔ ابا کے فوت ہونے پر ان کی ذمہ داری میرے سر ہے"

" اوہ..... ہاں..... لیکن کوئی بات نہیں تم یہاں کام کر کے اپنے گھر والوں کو خرچہ دے سکتے ہو....."

" بنگلہ بھی تو خالی کرنا پڑے گا....."

" ہاں ان کا ٹھکانہ....."

ڈیڈی کی بات پوری کرنے سے پہلے ہی شبینہ بولی" رضی..... تم کہتے تھے نا کہ تمہارا ایک پانچ مرلے کا مکان بھی ہے جس میں بنگلے میں آنے سے پہلے تم رہا کرتے تھے....."

" ہاں..... وہ تو ہے....."

" تو سب اسی میں واپس جا کر رہ سکتے ہیں"

" لیکن تم....."

" میں..... میں اپنے گھر میں رہوں گی ہماری کوٹھی میں ڈیڈی نے آرام اور سہولت کی ہر چیز سیٹ کروا دی ہے....."

رضی خاموش ہو گیا

بھئی اب یہ فیصلہ تم دونوں کر لو..... کہ کسے کہاں رہنا ہے....."

شبینہ رضی سے باتیں کرنے لگی۔ ڈیڈی اُٹھ کر چلے گئے۔

نئی کوٹھی میں شفٹ انہیں ہونا ہی تھا...... ماں بہن اور چھوٹے بھائی کا مسئلہ تھا۔ شبینہ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتی تھی ان لوگوں کو شہر والے مکان ہی میں رکھنے پر رضی کو رضامند کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پھر رضی ضد بھی کیسے کرتا۔ کوٹھی اور اس کی ہر چیز شبینہ ہی کی تو تھی۔

رضی نے نوکری چھوڑ دی۔ ماں کو شہر شفٹ ہونے کا اس نے نہیں بتایا۔ چند ماہ وہ بنگلہ اپنے پاس رکھ سکتا تھا وہ لوگ وہیں رہے۔ شبینہ اور رضی اپنی نئی اقامت گاہ میں آ گئے۔ دن عید اور رات شب برات تھی ان کی۔

اس روز رضی نے ماں سے کہہ ہی دیا" امی...... اب چند دنوں تک یہ بنگلہ خالی کرنا ہے"

ماں خوش تھی رافیہ اس سے بھی زیادہ خوش دونوں تو ہر روز انتظار کرتی تھیں کہ کب وہ لوگ بھی شبینہ اور رضی کے ساتھ نئی محل جیسی آراستہ کوٹھی میں آئیں۔

امی محبت سے بولیں "چند دن کیا۔ آج ہی چھوڑ دیتے ہیں سامان ہے ہی کتنا ابھی میں اور رافیہ سمیٹ لیں گے۔

رضی نے حیرانگی سے انہیں دیکھا پھر ہولے سے بولا" امی گھر کب سے بند پڑا ہے چند دنوں میں صفائی کروا لیں پھر چلی جائیں

"کون سا گھر" ماں بیٹی کے منہ سے نکلا۔

"شہر والا...... اپنا گھر......" رضی نے آہستگی سے کہا تو ماں بیٹی جیسے پتھرا گئیں۔

ہمیں وہاں جانا ہے کئی لمحوں کے توقف کے بعد شاہدہ بولیں۔

"ہاں امی...... شکر ہے وہ ٹھکانہ تھا...... بیچا نہیں ورنہ دشواری ہو جاتی"

"ہم آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے کیا؟" رافیہ نے جلدی سے گھبرا کر پوچھا۔

رضی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا......" وہ گھر شبینہ کا ہے رافیہ......"

"اوہ......"

"ہاں"

شاہدہ کو تو سانپ ہی سونگھ گیا...... کچھ بول ہی نہ پائی...... رافیہ ہی نے کہا

"بھابی ہمیں اپنے ساتھ نہیں رکھیں گی"

رضی نے صرف یہی کہا تھا" وہ اس کا گھر ہے تم لوگ اپنے گھر میں رہو گے"

"اور...... اور کھائیں گے کہاں سے......"

"میں خرچہ دیتا رہوں گا......"

رافیہ چپ ہو گئی

پھر

چند دنوں بعد شاہدہ رافیہ اور بیٹے رضا کو لے کر اپنے پُرانے ٹھکانے پر لوٹ آئی جہاں برسوں رہی تھی۔ لیکن اب اور ان حالات میں یہاں رہنا اس سے زیادہ رافیہ اور رضا کے لیے مشکل تھا اب انہیں گلی سڑی گلیوں کے اس پُرانے مکان میں رہتے ہوئے بے طرح گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

لیکن کرتے بھی کیا مجبوری تھی۔

شروع شروع میں رضی اور شبینہ ہر ہفتے باقاعدگی سے احوال پُرسی کو آتے رہے...... لیکن شبینہ ان گلیوں اور ایسے مکان سے کوئی رابطہ قائم نہ کر سکی...... آنا جانا آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا......

شاہدہ سخت پریشان رہنے لگی تھی اسے اپنے سے زیادہ رافیہ کی فکر تھی جس کی منگنی وہ بہت اونچے گھرانے میں کر چکی تھی۔ اور اسی سال کے آخر میں شادی بھی کرنا تھی شادی کے سلسلہ میں اس نے کوئی خاص تیاری ابھی شروع نہیں کی تھی اس کے تو خواب

ہی ادھورے رہ گئے تھے شبینہ کی بے اندازہ دولت پر انحصار کرکے ہی وہ مطمئن اور بےغم تھی۔

لیکن اب؟

ڈر کے مارے تو وہ مسز ناظم کو گھر کی تبدیلی سے بھی آگاہ نہ کر سکی تھی۔

لیکن

مسز ناظم نے ان کا پتہ شبینہ سے لے لیا۔ اس کا بیٹا آنے والا تھا اس لیے شادی کے لیے شاہدہ سے مشورہ کرنا تھا......

وہ شاہدہ کے اس گھر میں آ تو گئی

لیکن

اکھڑی اکھڑی...... اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شاہدہ کی حالت ہو گی۔ شاہدہ بیچارگی سے رو دی...... بہو کی بےبسی کا زخم کھائے تھی...... بےچارگی چھائی تھی۔ رونے کے سوا اور کیا کرتی......

لیکن مسز ناظم پر اس کے آنسوؤں کا کیا اثر ہوتا۔ اتنی امیر کبیر عورت اور امریکہ سے ٹریننگ پاکر آیا ہوا بیٹا!!

وہ ان اندھی اندھیری گلیوں سے اپنے بیٹے کا بندھن کیسے باندھ سکتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو احساس کمتری میں کیوں مبتلا کرتی...... جبکہ اس کے دوست اور کزن اچھی اچھی جگہوں پر بیاہے ہوئے تھے۔

وہ ایسا گئی

کہ......

پھر لوٹ کر واپس نہ آئی

شاہدہ کو راحیل کے آنے کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح رافیہ کی شادی ہو جائے اس نے رضی سے کہنا چاہا لیکن وہ اگلے دن بزنس ٹرپ پر ملک سے باہر جا رہا تھا۔

"واپسی پر ہی دیکھوں گا" اس نے سرسری سا جواب دیا۔ دوسرے دن وہ سفر پر روانہ ہو گیا۔

شاہدہ شبینہ کے پاس آئی تھی...... منت کی تھی "رافیہ کو اپنے پاس رکھ لو شادی یہیں کر دو...... تم ہی نے اس کی شادی کرنا ہے...... تمہارے پاس پیسے کی تو کمی نہیں...... میرا یہ بار بانٹ لو......"

شبینہ نے سرد مہری اختیار کرتے ہوئے کہا تھا "اس کی شادی کا سارا ذمہ میں کیسے اُٹھا سکتی ہوں...... جو کچھ بن پڑے گا دے دوں گی...... باقی رہی یہاں لاکر رکھنے والی بات...... تو اب اس کا فائدہ...... مسز ناظم تو اصلیت جان چکی اور......"

"اور...... کیا؟"

"وہ یہ رشتہ اب نہیں کرے گی......"

"کیا......؟"

اس نے ممی سے کہہ دیا ہے...... کہ وہ یہ رشتہ ہرگز نہیں کریں گی"

شاہدہ سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گئی...... رافیہ کی منگنی ٹوٹ گئی تھی...... اور وہ اک بےبس ماں بن کر سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا؟

اس کی آنکھوں میں ثمینہ کی بےبسی اور بیوہ ماں کی شبیہہ لہرانے لگی اور اس کی آنسوؤں رندھی آواز کانوں میں اُترنے لگی......

ایسا تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے بہن...... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ایسا تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

واقعی

خدا کی لاٹھی بے آواز ہے

ایسا

اس کے ساتھ بھی ہو گیا تھا......

فاصلے

پختہ اینٹوں والی گلی اتنی کشادہ تو تھی کہ گاڑی اندر جا سکے۔ بلکہ گاڑی تو اس بغلی گلی میں بھی جا سکتی تھی جس میں رعنا کا گھر تھا...... لیکن آج کوئی شادی تھی۔ گلی میں کافی رش تھا۔ میلی میلی نامکمل وردیوں والے بینڈ باجے والے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دو تین ریڑھیوں والے کھڑے تھے۔ بچے ان ریڑھیوں سے کھانے پینے کی چیزیں خرید کر کھا پی رہے تھے۔ غبارے والا بھی کھڑا تھا اور بچے گیسی غبارے خرید کر اُڑاتے پھر رہے تھے۔ کھانا کھایا جا چکا تھا شاید ...... اسی لیے تو باراتی بھی آ جا رہے تھے...... باہر سڑک پر ہی بس کھڑی تھی...... دودھ دہی مٹھائی اور سبزی گوشت۔ سے لے کر کپڑے جُوتے اور جنرل مرچنٹ کی بہت ساری دکانیں تھیں۔ درزی نائی بھی تھے اور ڈاکٹر اور کیمسٹ بھی۔ خاصہ بھرا پُرا بازار تھا...... سڑک تو خاصی تھی لیکن دکانوں کے سامنے تھڑوں پر بھی خرید و فروخت کے سلسلے تھے...... پھیری والے بھی یہاں مجمع لگائے بیٹھے تھے اور چھوٹی موٹی سستی سستی چیزوں کے ڈھیر لگائے بھی بیچنے والے بیٹھے تھے۔ خاصی گاہکی تھی۔ غریب لوگ جو دکانوں میں جانے کی ہمت اور استطاعت نہ رکھتے تھے انہیں انہی ڈھیریوں سے ضرورت کی ہر چیز سستے داموں مل جاتی تھی۔ بازار میں کوئی کوئی حصہ تو بہت ہی تنگ تھا۔ یہاں پُرانی عمارتیں ڈھا کر نئی دکانیں بن رہی تھیں۔ اینٹ روڑہ پتھر سیمنٹ سب کچھ سڑک کے کنارے ہی پڑا تھا۔ جو پھیلتے پھیلتے آدھی سڑک کو گھیر چکا تھا...... سڑک کے کنارے جا بجا گندگی کے ڈھیر بھی تھے۔ گلیوں سے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر انہیں ڈھیروں پر ڈال دیا جاتا تھا...... جو کئی کئی دن پڑا گلتا سڑتا رہتا...... پھر کہیں کمیٹی کا ٹرک اُٹھانے آتا...... تب تک

دوسرا ڈھیر بننا شروع ہو جاتا...... شہر کا یہ پرانا علاقہ تھا۔ صرف غریبوں ہی کا مکن نہیں تھا خاصے امیر لوگ بھی یہاں رہتے تھے۔ لیکن اس طرزِ رہائش کے عادی ہو چکے تھے۔ اپنے آبائی مکان چھوڑ کر شہر کی اضافی خوبصورت اور صاف ستھری بستیوں میں جا کر بسنے کے حامی بہت کم تھے۔

جازی نے سڑک پر گلی کے سرے پر گاڑی روک کر قدرے پریشان ہو کر برابر کی سیٹ پر بیٹھی اپنی پیاری مما کی طرف دیکھا جو اپنے کی پھننگ پر اپنا ننھا سا رومال رکھے بڑے بڑے گاگلز کے پیچھے سے اپنی آنکھوں میں طنز کی سلگتی چنگاریوں کو چبھتی ہوئی مسکراہٹ میں لپیٹ کر جازی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"آج کوئی شادی ہے مما۔ گلی میں رش ہے ورنہ گاڑی تو اندر تک جا سکتی ہے" جازی نے جلدی سے کہا۔

"ہوں" مما نے منہ کھولے بغیر آواز نکالی۔

"اب تو گاڑی یہیں سڑک کے کنارے کھڑی کرنا پڑے گی" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"روک لو...... تمہارے لیے یہ ایک دن کا مسئلہ تو نہیں ہوگا۔ آئے دن ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا"

مما کے دھیمے لہجے میں چبھن اور تلخی تھی۔ جازی کو اچھی نہیں لگی...... ماں کو دکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "مما...... جب آپ میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال ہی چکی ہیں تو پھر اس طنز سے......"

"جازی...... ٹھیک ہے میں نے مجبوراً تمہاری ضد مان لی ہے اس لیے کہ تم میرے ایک ہی ایک بیٹے ہو...... میری اس کمزوری کا تم نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ لیکن تم یہ کہو کہ میں ان گلیوں محلوں کے ماحول کو ذہنی طور پر قبول کر لوں

گی اوں ہوں۔ کبھی نہیں...... یہ لڑکی جسے تم اپنی بیوی بنانے جا رہے ہو۔ تمہاری بیوی تو ہو گی لیکن میں اسے بہو تسلیم نہیں کروں گی......"

"مما....."

"یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ تم اپنی بیوی کو مجھ سے الگ رکھو گے..... اور مجھے کبھی اس گندے محلے کی غریب لڑکی سے ملنے پر مجبور نہیں کرو گے"

"مما پلیز..... جب آپ یہاں آ ہی گئی ہیں تو یہ زہر آلود باتیں تو نہ کریں..... آپ میرے لیے رعنا کو مانگنے آئی ہیں"

مما نے ناگواری سے جازی کو دیکھا جازی گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے کو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔

مما کا جی دب رہا تھا ایسی گندی مندی گلیوں میں بیٹے کی رفیقہ حیات کے لیے آنا انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ قہر درویش بر جان درویش۔ جز بز تو ہو رہی تھیں۔ لیکن جازی ان باتوں کو نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

مما نے یہ ساری باتیں اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی طبقاتی فرق کو مٹائے مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ جازی کی بھول ہو گی۔ اسے بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ عشق کا بھوت ابھی تو دماغ پر سوار ہے جو کچھ سمجھ نہیں پاتا لیکن بہت جلد یہ فرق اس کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگے گا وہ صرف رعنا کو اس محلے سے بیاہ کر نہیں لے جائے گا۔ اپنے مستقبل کو ان تنگ اور گندی گلیوں سے وابستہ کر لے گا..... یہ اس کے سسرال کا محلّہ ہو گا۔ اس کے بچوں کا ننھیال ہو گا۔ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے وجود کا ناطہ ان گلیوں سے منقطع نہیں کر سکے گا۔ ..... اس کے بچے اس کی بیوی طبقاتی فرق سے پیدا ہونے والی کش مکش سے کبھی نکل نہ پائیں گے۔ یہ شادی اس کے لیے سکون کے بجائے بے سکونی کی علامت بن جائے گی۔

مما نے اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں کھنگال ڈالی تھیں پیار سے سمجھایا تھا رعب سے

کہا تھا سختی سے طبقاتی فرق کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن

جازی نے یا تو سنا ہی نہ تھا اگر سنا تو تو اہمیت نہ دی تھی۔ رعنا اس کا پیار تھی۔ اس پیار کو وہ چھوڑ نہیں سکتا تھا..... اسے اس نے پانا تھا۔ ہر حال میں پانا تھا۔ اس نے خواہش کی تھی جو ضد بن کر مما کی ساری صلاحیتوں سے ٹکرا گئی تھی۔ اور مما کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے تھے۔ گو یہ ہتھیار غیر مشروط طور پر نہیں ڈالے گئے تھے۔ مما نے اپنی طرف سے بہت سی پابندیاں لگائی تھیں۔ بڑی حدیں بنائی تھیں بڑی لکیریں کھینچی تھیں......

جازی نے سب باتیں منظور کر لی تھیں..... اسے صرف حال سے واسطہ تھا مستقبل میں جو ہونا تھا وہ اس کی پلاننگ ابھی سے نہیں کرنا چاہتا تھا..... اسے قوی امید تھی کہ آج جو بات مما مجبور ہو کر مان رہی ہیں کل خوشی سے اپنا لیں گی۔ رعنا خوبصورت ہونے کے علاوہ خوب سیرت بھی تو تھی..... خوبصورتی اور خوب سیرتی مل جائیں تو کون سی مشکل حل نہیں ہو سکتی۔

وہ اسی اُمید پر مما کی ہر شرط مان گیا تھا..... اور آج وہ مما کو رعنا کے گھر لے کر آیا تھا۔ مما رشتہ لینے اور شادی کی تاریخ پکی کرنے آئی تھیں.....

جازی گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن گلی کی طرح سڑک پر بھی بہت رش تھا...... سڑک کے کنارے جہاں کوڑے کے ڈھیر نہیں تھے۔ وہاں بس کھڑی تھی۔ شاید باراتی اس بس میں آئے تھے۔ ریڑھیوں اور دکانوں کے آگے بڑھے تختوں کی وجہ سے گاڑی کہیں بھی کھڑی کرنا مشکل تھا..... جازی جگہ دیکھ ہی رہا تھا کہ گلی میں رش اور بڑھ گیا۔ مرد، عورتوں اور بچوں سے گلی بھر گئی۔ لوگ بس کی طرف بڑھنے لگے..... شاید واپسی ہو رہی تھی۔ جازی نے پریشان ہو کر چور سی نظروں سے مما کو دیکھا۔

مما بولیں "اب کیا خیال ہے؟"

”مما شاید بارات واپس جا رہی ہے۔ ابھی ہی بس بھر جائے گی.....“

”تو پھر“

”بس ہٹنے گی تو میں گاڑی یہیں کھڑی کر لوں گا۔“

”بہتر یہی ہے کہ آج واپس چلو جس دن گلی صاف ہوگی ہم آجائیں گے۔“

”مما.....“

”ٹھیک کہتی ہوں..... جس دن راستہ صاف ہوگا گاڑی اس کے گھر تک جا سکے گی اس دن لے چلنا مجھے میں اس گلی میں پیدل چل کر اس کے گھر تک نہیں جاؤں گی..... واپس چلو“

”پلیز مما..... پہلے ہی بہت دن ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے آپ کو لے کر آنا تھا۔ آپ نے مجھے فار ایسٹ بھیج دیا..... دیر اندھیر بھی ہو سکتی ہے مما..... کہیں رعنا کے والدین اسے کسی اور کے حوالے نہ کر دیں“

”ہونہہ“ مما نے تند و تیز نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے طنزیہ سی آواز حلق سے نکالی جازی نے بیچارگی سے مما کو دیکھا۔

مما بولیں ”بے فکر رہو۔ رعنا کسی اور کے حوالے نہیں ہو سکتی۔ اک امیر کبیر لڑکے کو جو کروڑوں کی جائیداد اور بہت وسیع کاروبار کا مالک ہے۔ اسے چھوڑ کر رعنا کسی اور کو اپنانے کی حماقت کرے گی؟ جازی ایسی لڑکیاں مہینوں تو کیا برسوں انتظار میں بیٹھی رہ سکتی ہیں.....“

”مما!!“

بغلی گلی سے پھولوں سے سجی گاڑی نکل رہی تھی اس گاڑی کو عورتوں اور مردوں نے گھیر رکھا تھا۔ رخصتی ہو رہی تھی۔ بینڈ بھی اب حرکت میں آ گیا تھا۔ بڑی سوگوار سی دھن بجانے لگا تھا.....

جازی نے یہی بہتر سمجھا کہ بارات کا رش اور کھپ نکل جانے کے بعد ادھر آئے اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور بازار میں دوسری طرف نکل گیا..... مما سمجھیں کہ وہ واقعی واپس

جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں تھی اتنی مشکل سے تو وہ مما کو راضی کر کے آج لایا تھا رعنا کے گھر لے جائے بغیر واپسی کا سوال ہی نہ تھا.....

رعنا متوسط طبقے کی ایک خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی تھی۔ مضبوط کردار کی مالک شائستہ اور با اخلاق تھی..... بی اے کے بعد شارٹ ہینڈ اور ٹائپ سیکھ کر ملازمت کر رہی تھی۔ وہ چار بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھی اس کے والد اشتیاق احمد کلاس ٹو آفیسر تھے۔ دو تین سال میں ریٹائر ہونے والے تھے..... اس کی والدہ نعیمہ بھی پڑھی لکھی عورت تھی۔ بچیوں کی تربیت دونوں نے بہت اچھی کی تھی۔ صورتیں خدا نے سنواری تھیں سیرتیں والدین نے ڈھال دی تھی۔ چاروں بہنیں ہی خوبصورتی اور خوب سیرتی کا مرقع تھیں۔ رعنا سے بڑی عظمیٰ کی شادی اپنے ہی طبقے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے ہو چکی تھی۔ دولت نہیں تھی۔ لیکن خوشحالی ضرور تھی.....

رعنا اور جازی کی ملاقات چند ماہ پہلے ہوئی تھی۔ رعنا جازی کے دوست افتخار کے آفس میں بھی بطور ٹائپسٹ کام کر رہی تھی۔ جازی افتخار سے ملنے آیا تو رعنا اس وقت ٹائپ شدہ کاغذ لیے آفس میں کھڑی تھی۔ افتخار اسے کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ رعنا نے جازی کو دیکھا اور جازی نے رعنا کو جازی کو رعنا کے چہرے پر وقار تقدس اور پاکیزگی کی ایسی جھلک نظر آئی کہ وہ نگاہیں اس کے چہرے سے جیسے ہٹانا ہی بھول گیا..... مرعوب رعنا بھی ہوئی۔ لیکن وہ جلدی سے آفس سے نکل آئی۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے شاید یہی ضروری تھا.....

”یہ کون تھی.....“ جازی نے اس کے جانے کے بعد افتخار سے پوچھا۔

”کیوں“ افتخار نے شوخ سی نظر اس پر ڈالی۔

”اس کا نام کیا ہے اور یہ کون ہے“ جازی اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"گھائل ہو گئے.....؟" اس نے چھیڑا۔

"یہ؟ یہ لڑکی میرے خوابوں کی تعبیر ہے" اس نے بلا جھجک کہہ دیا۔ افتخار نے اس کی بات پر اک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا....."تم میرے خیال میں اتنے دل پھینک تو نہیں تھے"

"میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں" جازی بولا......

افتخار تھوڑی دیر اس کا مذاق اڑاتا رہا.....لیکن جب جازی کو سنجیدہ ہی دیکھا تو بولا" جازی رعنا متوسط طبقے کی لڑکی

اس کی ساری خوبیاں بیان کرتے ہوئے افتخار نے کہا

"رعنا کے پاس سوائے دولت کے کسی چیز کی کمی نہیں اور یہی کمی تمہارے اور اس کے درمیان حائل ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسے نہ تو اپنے خوابوں کی تعبیر کہو نہ ہی....."

"افتخار.....میں نے جو محسوس کیا وہی کہا تھا....."

"لیکن تم....." افتخار نے سنجیدگی سے کہا" تمہاری مما نے بھی تمہارے لیے بہت اونچے پلان بنا رکھے ہیں۔ ان کی نظر میں جو جو لڑکیاں ہیں....."

"ان کی بات جانے دو....." جازی نے جلدی سے افتخار کی بات کاٹ دی۔

پھر

رعنا سے دوستی کرنے اور اس کے قریب آنے میں جازی کو بہت دن لگے۔ رعنا عام سی دولت سے مرعوب ہو جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ جازی اس کے ذہن میں پہلی ملاقات میں ہی دھرنا مارے بیٹھا تھا۔ لیکن اس نے اس بات کو ذہن کے اسی گوشے ہی میں دفن کر دینے کی کوشش کی تھی...... یہ تو جازی ہی کے پیار کا استحکام تھا جو وہ ہمت نہیں ہار بیٹھا تھا...... رعنا کی قربتوں کی مہک کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہا تھا.....

جذبے صادق ہوں تو راہیں استوار ہو ہی جاتی ہیں۔ رعنا جازی کے دل و دماغ پہ

چھا گئی۔ پسند کا اپنا ہی معیار اور اپنا ہی طریق ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر کسی کو پورا اُترنا ہو تو پہلی نظر ہی میں پورا اُتر آتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بات تھی..... پرکھ اور پسند کسوٹی پر پوری اتری تھی...... رعنا دامن زیادہ عرصہ تک نہ کترا سکی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنا ہی پڑا..... اور جب دونوں قریب آئے تو انہیں یوں لگا جیسے ان کی قربتیں برسوں نہیں صدیوں پر محیط ہیں۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو زمانوں اور قرنوں سے چاہتے چلے آئے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

بلا روک

بلا جھجک

بلا رکاوٹ

رعنا چھٹی ہوتے ہی آفس سے باہر آتی تو جازی اپنی گاڑی لیے اس کا منتظر ہوتا.....

دونوں کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔

کبھی کسی ریسٹورانٹ میں جا بیٹھتے۔

اور

کبھی

جازی اسے اپنے شاندار آفس میں لے آتا..... جہاں وہ اپنا کام بھی نپٹاتا اور رعنا کی رفاقت سے محظوظ بھی ہوتا.....

دونوں کو ایک دوسرے کی بے پناہ چاہت اور محبت کا از خود یقین آ گیا تھا..... یقین دلانے کو انہیں موٹے موٹے رومانوی الفاظ کی ضرورت پڑی تھی نہ رومانٹک فقروں کی..... لہجے اور رویے بھی بولتے ہیں۔ چاہتوں اور محبتوں کا اظہار الفاظ سے زیادہ موثر طریق سے کر دیتے ہیں۔

رعنا جس دن جازی سے نہ ملکر جاتی وہ پریشان ہو جاتا۔ اور جو کبھی جازی کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر جاتا تو رعنا بے قرار ہو جاتی.....

"ایسے کب تک چلے گا" ایک دن رعنا نے جازی سے کہہ ہی دیا۔

جازی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور ہولے سے بولا..... "یہ صبر آزما لمحے ابھی ہمیں گزارنا ہی ہیں"

"کیوں"

"اس لیے کہ میری ایک مما بھی ہیں....."

"تو....."

"رعنا..... میری مما اور میری سوچ میں بہت فرق ہے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہر امیر کبیر ماں کی طرح میری ماں بھی مجھے اپنے ہی طبقے کی کسی لڑکی سے شادی....."

"اوہ" رعنا کا چہرہ اُتر سا گیا..... وہ آہستگی سے بولی "جازی..... میں نے تو اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا....."

"فکر کی بات نہیں رعنا..... جازی تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا..... لیکن میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے درمیان اک طبقاتی دیوار حائل ہے"

"جازی"

"گھبراؤ نہیں رعنا..... یہ دیوار میں گرا دوں گا....."

"نہ گرا سکے تو....."

"تو اپنی جان دے دوں گا"

"نہیں جازی....."

جازی ہنس کر بولا "رعنا..... میں اپنی مما کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہیں میری ضد کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اور یہ ضد ہوگی طبقاتی دیوار گرا کر تمہیں حاصل کرنے کی....."

رعنا چند لمحے چپ رہی پھر مرے مرے لہجے میں بولی "تم نے اپنی مما سے میرا ذکر کیا"

جازی نے نفی میں سر ہلایا..... تو رعنا کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

جازی نے بڑے پیار سے اسے دیکھا پھر مستحکم لہجے میں بولا "رعنا..... تم ہار گئیں تو میں جیتوں گا کیسے۔ تم اپنے جذبوں کے تقدس اور استحکام پر یقین نہیں رکھتیں کیا؟"

رعنا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "رکھتی ہوں..... لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری مما کا تعلق جس طبقے سے ہے۔ اس میں میرے لیے گنجائش نہیں نکلے گی....."

"کیوں..... کیا کمی ہے تم میں..... صرف دولت نا ؟..... میں اسے اہمیت نہیں دیتا مما ضرور دیتی ہیں۔ لیکن میں انہیں قائل کر لوں گا..... آج ہی ان سے بات کروں گا تم بے فکر رہو..... کل خوش خبری سننے کے لیے تیار رہنا..... مما کو میں راضی کر لوں گا"

لیکن.....

اس کل میں بہت عرصہ لگ گیا۔ مما بھڑک اُٹھیں۔ گلیوں محلوں میں رہنے والی ایک متوسط طبقے کی عام سی لڑکی کو بہو بنانا ان کے مرتبے اور سماجی درجے کے سراسر خلاف تھا۔ انہوں نے جازی کو ڈانٹ دیا۔

"خبردار جو یہ بات تم نے آئندہ مجھ سے کہی..... میں تمہارے رشتے کی بات پنکی سے طے کر رہی ہوں، مسز راحیلہ اعظم میری دوست ہیں، تم جانتے ہو پنکی کو بھی دیکھا ہے کتنی حسین کتنی طرح دار اور ایٹی کیٹس والی لڑکی ہے۔ پھر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی..... اعظم کا اسٹیٹس بھی تمہیں پتہ ہے جتنی دولت ان کے پاس یہاں ہے۔ اس سے زیادہ فارن میں ہے۔ اب تو انہوں نے اسٹیٹس میں بھی کام شروع کیا ہے..... ایسا نایاب رشتہ میں اس قلاش لڑکی کے لیے چھوڑ دوں گی؛ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....."

"اور مما..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ میں اپنے پیار سے دستبردار ہو جاؤں گا....."

"بہت دیکھے تم سے مجنوں....."

"میں اپنے الفاظ پر سنجیدگی سے قائم ہوں مما....."

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی....."

مما اٹھ کر چلی گئیں..... وہ واقعی اس سلسلے میں جازی کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی تھیں۔

رعنا مایوس ہو گئی۔ گو اس کی ہمت بندھانے اور حوصلہ دلانے کے لیے جازی ہر ممکن حیلہ کرتا رہا۔

"میں مما کو راضی کر لوں گا رعنا..... میں اپنے اکلوتا ہونے کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں انہیں میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے....."

"جب وہ خوشی سے قبول نہیں کریں گی۔ تو آئندہ....."

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے یقین ہے ایمان کی حد تک یقین ہے رعنا کہ جب تم میری ہو جاؤ گی۔ تو مما تم سے دور نہیں رہیں گی..... انہیں تم سے پیار کرنا پڑے گا..... اس لیے کہ تم میری ہو گی اور میں ان کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں پھر کیسے میرے پیار سے پیار نہیں کریں گی۔

کافی دن گزر گئے۔

جازی کی مما سے ہر روز ہی بحث ہوتی..... مما ماننے میں آتی ہی نہ تھیں۔

رعنا جازی سے خوشخبری سننے کی توقع لے کر روز آتی..... لیکن مایوس ہو جاتی..... اس کی مایوسی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اس دن عظمیٰ گھر آئی ہوئی تھی۔ رعنا کو اتنا نڈھال اور پژمردہ دیکھا تو پوچھ ہی لیا.....

"کیا بات ہے۔ بہت اداس لگ رہی ہو..... تم تو بڑی خوش باش نظر آتی ہو ہمیشہ....."

رعنا کا دل دکھ رہا تھا بہن نے ہمدردی سے ٹٹولا..... پوچھا تو درد الفاظ میں بہہ گیا۔

اس نے جازی اور اپنی چاہت کا راز اس کے سامنے کھول دیا۔

عظمیٰ نے اک گہری ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا "اک ایسے لڑکے سے پیار جو تیری پہنچ سے بہت اونچا ہے بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں رعنا....."

"نہیں عظمیٰ..... جازی بہت مخلص ہے"

"لیکن ہمارے درمیان جو دولت کی دیوار ہے"

"جازی کہتا ہے میں گرا دوں گا....."

"خیال خام ہے رعنا..... خصوصاً اس صورت میں کہ اس کی ماں پوژردا طبقے کی اہم رکن ہے اور جازی اس کا اکلوتا بیٹا ہے"

دونوں بہنیں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ عظمیٰ اس سے صرف دو سال ہی بڑی تھی لیکن زندگی نے اسے تجربوں سے گزارا تھا..... طبقاتی خلیجیں نہیں پاٹی جا سکتیں وہ جانتی تھی..... سوچ و فکر کا جتنا فرق طبقوں میں ہوتا ہے اس سے بھی آگاہ تھی اس نے رعنا کو ہر ممکن طریق سے سمجھایا..... کہ بڑھتے ہوئے قدم اب بھی روک لے..... پیار اپنی جگہ سہی..... لیکن خواب دیکھنا چھوڑ دے۔

عظمیٰ نے اپنے سسرالی رشتہ داروں میں اس کا رشتہ کروانے کا سوچ رکھا تھا..... ناصر ایک اچھا لڑکا تھا..... اپنی ہی طرح کے لوگ تھے۔ ناصر کی امی نے ایک آدھ بار رعنا کے لیے خواہش کا اظہار بھی کیا تھا..... اور آج عظمیٰ آئی بھی اسی مقصد سے تھی۔ امی سے اس رشتہ کا ذکر کیا تھا۔ وہ یہ خوش خبری رعنا کو بھی سنانے والی تھی۔ لیکن اسے پژمردہ اور نڈھال دیکھ کر بتایا نہیں تھا۔ اسے ٹٹولنے ہی میں لگ گئی تھی۔ رعنا نے جو کچھ بتایا تھا اس نے اسے متفکر کر دیا تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ جازی اپنی مما کو تا حال رضامند نہ کر پایا تھا۔

رعنا کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ پریشانیاں ایک طرف تو جازی کی مما کی طرف

سے تھیں دوسری طرف گھر میں کھسر پھسر ہونے سے تھیں۔ ناصر کا رشتہ ہر طرح سے موزوں تھا...... اشتیاق احمد اور نعیمہ اسے اپنی اور رعنا کی خوش بختی تصور کر رہے تھے۔ وہ بار بار عظمیٰ سے کہہ رہے تھے کہ ناصر کی امی سے کہے کہ وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔

لیکن......

عظمیٰ رعنا کی وجہ سے کشمکش و پیچ میں تھی۔ رعنا کو سمجھانے کے باوجود وہ اسے اس کی ڈگر سے ہٹا نہ پائی تھی...... رعنا کو اب بھی قوی امید تھی کہ جازی کی مما اسے اپنانے کے لیے رضامند ہو جائیں گی۔

اس دن بھی عظمیٰ آئی تو اس نے بہ منت اس سے کہا ”عظمیٰ جلدی نہ کرنا۔ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں جازی کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکوں گی عظمیٰ......

عظمیٰ فکرمندی سے بولی ”لیکن وہ اس سلسلے میں تا حال ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ رعنا تم خواہ مخواہ آس لگائے بیٹھی ہو۔ جازی مخلص بھی ہو تو بھی کچھ نہیں کر سکے گا اور میں جانتی ہوں اس کی ماں کبھی رضامند نہیں ہوگی۔“

”ایسی صورت میں وہ خود مجھے اپنا لے گا۔“

”یہ محض بہلاوہ ہے رعنا...... اس میں اتنی ہمت اور جرأت ہوتی تو یوں ٹالے نہ جاتا......“

”وہ ٹال نہیں رہا عظمیٰ......“

”رعنا میں نے تمہیں کتنا سمجھایا ہے۔ حقیقت سے آنکھیں نہ پھیرو...... وہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔“

رعنا کو عظمیٰ کی بات بہت بری لگی۔ لیکن غصے کا اظہار نہیں کیا جانتی تھی صرف وہی اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتی ہے۔ والدین ناصر پر ریجھے ہوئے تھے۔ ”چٹ منگنی پٹ بیاہ“ کا ارادہ رکھتے تھے۔

وہ عظمیٰ کی منتیں کرتے ہوئے بولی ”جازی مجھے دھوکہ نہیں دے گا عظمیٰ...... اس نے وعدہ کیا ہے کہ اپنی مما کو رضامند کر کے ہمارے گھر لائے گا......“

”لیکن کب......؟“

”جلدی......“

”ٹھیک ہے میں امی ابو کو چند دن اور ٹال لوں گی...... تم اسے کہو کہ جو بھی قدم اُٹھانا ہے جلد اُٹھا لے ورنہ نتائج کی ذمہ داری اسی پہ ہوگی۔ رعنا...... ہم اس کے جھوٹے بھروسے پر اتنا اچھا رشتہ چھوڑ نہیں سکتے...... اپنے والدین کی مجبوریوں سے تم بے خبر نہیں ہو......“

وہ اسے بڑی سنجیدگی سے والدین کی مجبوریوں کا بتاتی رہی۔ رعنا سر جھکائے سنتی رہی...... وہ چپ ہوئی تو آہستگی سے بولی ”عظمیٰ...... میں جازی کے سوا کسی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر وہ اپنی مما کے فیصلے کے سامنے جھک بھی گیا تو بھی کسی اور کو قبول نہیں کروں گی میں شادی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔“

”جذباتی نہ بنو...... شادی بہرحال تمہیں کرنا ہی ہے جازی سے کر دیا ناصر سے...... انکار کر کے والدین کے لیے مسائل کھڑے کرنا چاہتی ہو۔ ان کی شرافت ان کی عزت ان کے دقار کو اچھالنا چاہتی ہو...... ایسا سوچنا بھی نہیں میں تمہیں موقع ضرور دیتی ہوں لیکن اس شرط پر کہ جازی کی مما کے انکار کی صورت میں تمہیں ناصر کو قبول کرنا ہوگا...... میں دو چار ہفتے بات نہیں بڑھاؤں گی۔ تم جازی سے کہہ دو...... اس نے جو بھی قدم اُٹھانا ہے اُٹھا لے......“

عظمیٰ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

رعنا چپ ہو گئی۔

اگلے دن جب وہ جازی سے ملی تو اس نے کہہ ہی دیا......

"جازی تم بے نتیجہ کوشش میں لگے ہوئے ہو۔ میں جانتی ہوں تمہاری مما کبھی نہیں مانیں گی"

"مان جائیں گی......"

"ہم انتظار کر سکتے ہیں......"

"لیکن میرے حالات......"

"کیوں کیا ہوا تمہارے حالات کو......"

رعنا نے سر جھکا لیا اور آہستگی سے بولی "گھر میں...... میرے رشتے کی باتیں ہو رہی ہیں، میرے والدین نے کوئی قدم اُٹھا لیا تو...... میں......"

"نہیں رعنا...... نہیں......" جازی پریشان ہو گیا، "تمہیں میرا انتظار کرنا پڑے گا......"

"جازی...... تم نے جو کچھ کرنا ہے کر لو ورنہ نتائج جو بھی ہوں گے، کسی طور خوشگوار نہیں ہوں گے میں اپنے والدین کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر سکوں گی۔ ہمارے گھرانوں میں تو لڑکیاں ایسا کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتیں...... والدین کے فیصلے ان کی تقدیر بنائیں یا بگاڑیں...... انہیں ماننا ہی پڑتے ہیں"

"تو کیا تم ان فیصلوں کے سامنے سر جھکا دوں گی"

"تمہاری طرف سے کچھ نہ ہوا تو یہ فیصلے از خود مجھ پر مسلّط ہو جائیں گے"

"رعنا......"

"میں مجبور ہوں جازی......" رعنا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ جازی پریشان ہو کر بولا

"جی تھوڑا نہ کرو...... میں پُرامید ہوں گو مما کچھ زیادہ ہی سخت گیری کا ثبوت دے رہی ہیں پھر بھی میں پُرامید ہوں......"

جازی نے اس سے پھر وعدہ کیا کہ وہ ہفتے عشرے میں مما کو راضی کر کے اس کے ہاں لے آئے گا۔ لیکن یہ ہفتہ عشرہ تین مہینوں پر پھیل گیا۔ مما کوئی فیصلہ کیے بغیر تین ماہ

کے لیے امریکہ چلی گئیں۔ عظمیٰ اپنے اور ناصر کے گھر والوں کو زیادہ عرصہ ٹال نہ سکتی تھی۔ پھر بھی رعنا کی خاطر اس نے بات پکی کرنے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگایا...... اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ جازی جیسا امیر زادہ رعنا سے صرف محبت کا کھیل کھیل رہا ہے۔ یہی بات وہ رعنا کے ذہن نشین کرتی رہی۔ اب تو رعنا بھی مایوس ہو رہی تھی۔ اسے جازی کی تسلیوں اور دلاسوں سے اطمینان نہیں ملتا تھا۔

جازی کی مما واپس آئیں تو وہ رعنا سے ملا۔ اسے جلد خوش خبری سنانے کی نوید دی لیکن اگلے ہی ہفتے مما نے اسے فار ایسٹ بھیج دیا...... وہ جاتے سمے رعنا سے مل بھی نہ سکا۔ واپس آیا تو بھی ہفتہ بھر اتنی مصروفیت رہی کہ مما سے آخری فیصلہ کرنے کا وقت ہی نہ ملا۔

اور اب

اب......

کئی دنوں کی چپقلش بحث و تکرار ضد اور من مانی کرنے کی دھمکی دے کر وہ مما کو رضامند کرنے میں کامیاب ہوا تھا...... مما نے بڑی شرائط رکھی تھیں۔ حد بندیاں کی تھیں، لکیریں کھینچی تھیں۔ پر وہ پھر بھی خوش تھا...... مما کی تند و تیز باتوں زہریلے طنزیہ فقروں کے باوجود وہ خوش تھا۔ کہ آج مما اس کے ساتھ رعنا کو مانگنے اور شادی کی تاریخ طے کرنے آ ہی گئی تھیں۔

بازار کا لمبا چکر لگا کر وہ واپس اس کشادہ گلی کی طرف آ گیا جس کے اندر گاڑی جا سکتی تھی۔ اب بھیڑ ہٹ چکی تھی، گلی میں گاڑی لے جانے کی جگہ تھی...... وہ گاڑی اندر لے آیا اور بغلی گلی کے عین سامنے روک کر مما سے بولا "میں ابھی آیا......"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"رعنا کے گھر...... پتہ تو کر لوں اس کے امی ابو گھر پہ ہیں"

مما نے بیزاری سے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

وہ گاڑی سے نکلا اور گلی میں داخل ہو گیا...... گلی میں اب بھی نئے رنگ برنگے گوٹے کناری

والے کپڑوں میں ملبوس اکا دکا عورتیں اور بچے آجا رہے تھے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ ساری چہل پہل رعنا ہی کے گھر میں تھی۔

"کہیں.....؟" اس کے ذہن میں اک تازیانہ سا برسا لیکن اس نے سر جھٹک کر جلدی سے رعنا کے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اتفاق سے عظمیٰ باہر آرہی تھی اس نے جازی کے سراپا پر نگاہ ڈالی۔ پھر استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا.....اس نے جازی کو دیکھا ہوا نہیں تھا لیکن اس کی چھٹی حس نے بتا دیا کہ یہ خوبرو باوقار اور خوش لباس نوجوان جازی کے سوا اور کوئی نہیں۔

"آپ جازی ہیں" اس نے ایک دم ہی کہہ دیا۔

"ہاں...... آپ.....؟"

"میں عظمیٰ ہوں...... رعنا کی بڑی بہن....."

"ہیں؛ میں اپنی ما کو لے کر آیا ہوں..... وہ....."

عظمیٰ نے اک گہری سانس لی..... دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا ان نظروں میں ملامت بھی تھی آہستگی سے بولی "اب آئے ہو..... واپس لوٹ جاؤ..... تم نے بہت دیر کر دی..... تھوڑی دیر پہلے آجاتے تو اس زندہ لاش کو دیکھ بھی لیتے جسے سُرخ جوڑے میں لپیٹ کر....."

جازی نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر سینے میں پھٹنے والی چیخ کو روکا..... عظمیٰ آنسو پونچھتے ہوئے اندر لوٹ گئی۔

جازی کیسے واپس لوٹا.....؟

قسمت اچھی تھی..... جو ایکسیڈنٹ نہیں ہوا..... ہو بھی جاتا تو شاید اسے فرق نہ پڑتا۔ اس کی زندگی کا مہیب ترین حادثہ تو وارد ہو ہی چکا تھا۔

فیصلہ

دونوں اکٹھی ہی کالج سے گھر آئیں رابعہ سیدھی اوپر چلی گئی اور صائمہ نے حسبِ عادت بیگ صحن میں پڑے تخت پر پھینکا...... وہیں بیٹھ کر جوتے اُتارتے ہوئے زوردار سی آواز دی۔

"اماں..... بھوک لگی ہے۔ جہاں بھی ہیں باورچی خانے میں آجائیں....."

"کھانا بنا پڑا ہے کھا لے جا کے....." اماں نے کمرے سے جواب دیا۔

"صائمہ بیٹی کیسی ہو....." چھوٹی پھوپھو کی آواز آئی۔

"یہ ویسی کی ویسی ہی ہے" خالہ نے ہنس کر کہا۔

صائمہ جوتے اُتار کر ننگے پاؤں ہی لپک کر کمرے میں آئی.... پھوپھو اور خالہ آئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کو سلام کرتے ہوئے ان سے لپٹ گئی.....

"رابعہ آئی ہے" پھوپھو نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" ہم ساتھ ہی آتے ہیں....."

"کہاں ہے وہ....."

"اوپر اپنے کمرے میں....."

اماں نے کہا" وہ یونیفارم اتار کر گھر والے کپڑے پہن کر ہی کھانا کھاتی ہے"

صائمہ نے مسخرے پن سے کہا" صرف کپڑے بدل کر ہی نہیں منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کر کے....."

"اچھی عادت ہے، تو مذاق کیوں اڑا رہی ہے....." خالہ نے پیار سے صائمہ کے گال

پر تھپکی دی.....

"خالہ اتنے زوروں کی بھوک لگی ہوتی ہے کہ ذرا بھی صبر نہیں ہوتا مجھ سے۔ پہلے پیٹ پوجا۔

"جا پھر کھانا کھا ہی لے پہلے....."

"امّاں چلونا دو کھانا....."

"خود ہی نکال لے..... اور ہاں جلدی سے کھانا کھالے۔ پھر ڈرائنگ روم ٹھیک کر دینا۔"

"کیوں امّاں....." صائمہ نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔

"کچھ مہمان آرہے ہیں" پھوپھو معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"ہوں......اب سمجھی....."

"کیا سمجھیں..... رابعہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں....."

"یہی تو سمجھی ہوں امّاں....."

"رابعہ سے کہنا کوئی اچھا سا جوڑا پہنے....."

"امّاں"

"ہاں"

"آپ جانتی ہیں کہ اسے چڑ لگتی ہے ایسی باتوں سے....."

امّاں نے ایک ٹھنڈی گہری سانس چھوڑی تو خالہ بولیں....." آپا رشتے قسمت سے ہوتے ہیں اوڑھنے پہننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا....."

"پڑتا ہے باجی" پھوپھو بولی....." رابعہ صائمہ کی طرح گوری چٹی نہیں ہے نا..... کہ جو پہنا وہ سج جائے..... اور آپ کو پتہ تو ہے کہ رشتہ ہونے میں اس کی گہری سانولی رنگت ہی حارج ہو رہی ہے....."

امّاں نے پھر ایک دکھی سانس لی اور بولیں....." یہ بات تو ہے......لوگ گوری چمڑی دیکھتے ہیں گن نہیں دیکھتے۔ بھابی زبیدہ نے بھی جو رشتہ بھجوایا تھا۔ وہ لوگ بھی تو دوبارہ اسی لیے نہیں آئے....."

پھوپھو رنجیدہ سی ہو گئی...... تسلی دینے کو بولی....." بھابی آپ متفکر نہ ہوں اللہ نے چاہا تو آج جو لوگ آرہے ہیں ہاں کر کے ہی جائیں گے۔"

"صائمہ کے متعلق بھی بتا دیا ہے نا....." خالہ نے پوچھا" دو رشتے جو میں لے کر آئی تھی، ان کی نظر صائمہ پر ہی ٹک گئی تھی.......یہی کہتے رہے کہ بڑی کی جگہ چھوٹی کا رشتہ کرادو....."

"میں نے بتا دیا ہے کہ چھوٹی کا رشتہ چچازاد سے گھر ہی میں طے ہے....."

"یہ اچھا کیا....."

"اسی لیے امید تو ہے کہ رابعہ کا رشتہ آج طے ہو ہی جائے گا....."

"خدا کرے....."

"کب آرہے ہیں وہ لوگ" صائمہ نے تجسس سے پوچھا۔

"پانچ چھ بجے کے قریب آئیں گے....."

صائمہ کچھ خوش کچھ متفکر سی کمرے سے نکل آئی.....باورچی خانے میں آکر ٹرے میں کھانا لگایا اور لے کر اُوپر چلی آئی.....

رابعہ گھر پہنچنے کے بعد کپڑے کھونٹی سے اتار کر بدلنے جا رہی تھی.....صائمہ کو ٹرے لیکر اندر آتے دیکھا تو رک کر بولی۔

"یہ کیا ہے"

"کھانا....."

"اوپر کیوں لے آئیں...... میں ابھی آجاتی نیچے....."

"یہیں کھا لیتے ہیں...... آؤ کھانا کھالو.... پھر کپڑے بدلنا....."

" مجھے تمہاری طرح زوروں کی بھوک نہیں لگی ...... تم جانتی ہو میں جب تک منہ ہاتھ دھو کر کپڑے نہ بدل لوں کھانا نہیں کھاتی ......"

" آج پہلے کھا لو ...... پھر آرام سے اچھے سے کپڑے پہن لینا ......"

رابعہ نے گھوم کر غور سے صائمہ کو دیکھا " اچھے سے کپڑے؟"

" ہاں رابعہ ...... آج پھر کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں ......"

رابعہ کے گہرے سانولے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا ...... پھر وہ تلخ سے لہجے میں بولی " آ رہے ہیں تو آئیں ...... میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گی ......"

" رابعہ ...... پاگل ہو تم ...... رشتے کے لیے آ رہے ہیں ......"

" جو کبھی نہیں ہو گا ......"

" یہ کیسے کہہ سکتی ہو ......"

" بہت تجربہ ہو گیا ہے ...... اماں سے کہہ دو آس نہ لگا لیا کریں ...... کہیں نہیں ہو گا رشتہ وشتہ ......"

" رابعہ ...... ایسی مایوسانہ باتیں تو نہ کرو نا ......"

" ہاں تمہیں کیا احساس ...... کرب کے کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ...... لوگ آتے ہیں دیکھتے ہیں اور پھر کبھی نہ آنے کے لیے چلے جاتے ہیں ...... میں کہتی ہوں ...... جب سب کو پتہ ہے کہ میرا رنگ ......"

" رابعہ ...... آخر سانولی لڑکیوں کے رشتے بھی تو ہو ہی جاتے ہیں ......"

" ہو نہیں جاتے ...... کسی نہ کسی طرح دوسروں کے سر منڈھ دیئے جاتے ہیں ......"

" تم غلط سوچتی ہو ......"

" ٹھیک کیسے سوچوں ...... تمہاری طرح گوری چٹی تو ہوں نہیں ...... چچی نے تمہیں شروع ہی سے پسند کیا۔ نعمان کے لیے اسی لیے مانگ لیا ...... بڑی کو صرف اسی لیے نظرانداز کیا کہ ......"

" رابعہ یہ بات نہیں ......"

" تو اور کیا بات تھی"

" نعمان تم سے چھ ماہ چھوٹا ہے ......"

" اور پھر تم جانتی ہو کہ ہمارے خاندان میں فیصلے بزرگوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، جو چاہیں کر دیں کسی کو اعتراض کی مجال و ہمت نہیں ہوتی ...... تایا ابو چچا جان خالہ اور پھوپھا سبھی مل کر جو فیصلہ کر دیتے ہیں وہ پتھر پر لکیر ہو جاتا ہے ...... ہمارا فیصلہ بھی تو انہوں ہی نے کیا ...... پسند ناپسند کو تھوڑا ہی دیکھا انہوں نے ......"

" ہوں" رابعہ نہیں بولی ......

" صائمہ بولی " تمہارے لیے خاندان میں گنجائش نکل ہی نہ سکی ...... سب کزن ہی تم سے عمر میں چھوٹے ہیں ...... کوئی برابر کا ہوتا ...... تو کیا تم سمجھتی ہو خاندان کے بزرگ ناطہ نہ جوڑتے"

رابعہ کپڑے لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی ...... صائمہ کھانے کی ٹرے سامنے رکھے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی بھوک اُڑ گئی تھی ...... رابعہ کی مایوسی نے اس کے دل میں ہلچل سی پیدا کر دی تھی ...... واقعی کئی رشتے آ چکے تھے ...... لیکن بات کہیں نہ بنی تھی ...... رابعہ حق بجانب تھی ...... لیکن آج جو لوگ آ رہے تھے۔ ان کے سامنے رابعہ کو جانا ہی تھا ...... فیصلہ کچھ بھی ہو ...... کچھ بھی ...... صائمہ سوچتے سوچتے اُداس ہو گئی ......

رابعہ کے رشتے کا مسئلہ پریشان کن تھا۔ صرف ماں باپ ہی نہیں تایا چچا خالہ خالو پھوپھو وغیرہ سبھی کو فکر تھی ...... خاندان میں کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس لیے باہر کے رشتوں پر انحصار تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ کوشاں تھے ...... جس کو جہاں کہیں مناسب رشتہ نظر آتا ...... کسی نہ کسی طرح اسے گھر میں لانے کی کوشش کرتے۔ یہ خاندان ابھی بکھرا نہیں تھا۔ رشتوں کا احترام تھا ...... پیار محبت کے بندھن مضبوط تھے۔ ہر بات باہم مشورے سے طے پاتی

تھی......

اک رابعہ ہی کا مسئلہ تھا جو بزرگوں سے حل نہ ہو پا رہا تھا۔ بیچاری رنگت کی میلی تھی لیکن من کی بہت اُجلی تھی...... سگھڑ سیانی اور صابر سی لڑکی تھی...... تایا ابا تو کہتے تھے خوش قسمت ہوگا وہ گھر جس میں رابعہ جائے گی...... چچی چچا بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے...... اس کی عادتیں انہیں بہت پسند تھیں۔ خالہ کو تو بہت پیاری تھی...... ان کا بیٹا صرف سترہ برس کا تھا...... اور رابعہ اس سے چار سال بڑی تھی۔ عمر گزرتی جا رہی تھی اور رشتہ ہو ہی نہیں رہا تھا...... ایف اے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا لیکن کئی برس گھر بیکار بیٹھنے کے بعد اس نے پھر پڑھائی شروع کر دی تھی۔ مستقبل تو تاریک نظر آ ہی رہا تھا۔ اس لیے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی...... صائمہ اس سے تین برس چھوٹی تھی...... لیکن دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں۔ رابعہ کپڑے بدل کر آئی تو صائمہ نے کھانے کی ٹرے اس کی طرف بڑھا دی۔

"تم نے ابھی کھایا نہیں کھانا"

"تمہارے ساتھ کھاؤں گی"

"مجھے تو بھوک نہیں بالکل...... تو بیہ نے چاٹ کھلا دی تھی"

"جھوٹ نہ بولو رابعہ...... چلو دونوں کھا لیتے ہیں...... مجھے...... تمہاری پوزیشن کا احساس ہے۔ لیکن کیا کیا جائے"

"کچھ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے...... میں تو امی کی عقل پر حیران ہوں۔ یہ قصہ ختم ہی کیوں نہیں کر دیتیں...... ساری لڑکیوں کی شادیاں ضروری تو نہیں کہ ہو ہی جائیں۔ ...... اگلے برس تمہاری شادی ہو جائے گی...... سارے ارمان نکال لیں......"

"لیکن رابعہ......"

"کیا"

"یہ ٹھیک ہے کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ لیکن شادی تمہاری پہلے ہوگی......"

"شادی تو جب ہوگی نا جو کوئی مجھے قبول کرے گا...... اور وہ وقت آئے گا ہی نہیں۔ تو کیا تو بنا شادی ہی کے بیٹھی رہے گی......"

"ہاں......"

"اور تیرا نعمان...... صرف تیرے بی اے کے امتحان کا انتظار کر رہا ہے......"

"وہ تو ہے...... لیکن......"

اماں نے نیچے سے آواز دی...... تو صائمہ نے وہیں سے "آئی اماں" کہتے ہوئے رابعہ سے کہا "کھانا ٹھنڈا ہو گیا، چلو چند لقمے زہر مار کر ہی لیتے ہیں...... کھاؤ نا......"

دونوں کھانا کھانے لگیں...... صائمہ نے ایک پھلکا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا...... رابعہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ صائمہ برتن سمیٹ کر اُٹھی......

"رابعہ"

"ہاں"

"پانچ چھ بجے کے قریب وہ لوگ آ رہے ہیں۔ پلیز تیار ہو جانا...... چلو آج آخری بار ...... آئندہ یہ موقع میں نہیں آنے دوں گی...... امی سے صاف صاف کہہ دوں گی...... بس ...... آخری دفعہ...... بات مان لو میری...... اچھی بہن ہو نا...... وہ آف وائٹ کپڑے ہیں نا ...... براؤن ڈوری والے...... وہ تم پر بہت اُٹھتے ہیں۔ وہ پہن لینا اچھا...... میری خاطر...... آخری بار...... مان لو نا بات......"

رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا...... تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی اور اس نے صائمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

صائمہ خوش ہو گئی...... اس کے دل سے دُعا نکلی "اللہ کرے آج رشتہ طے ہو ہی جائے......" وہ ٹرے اُٹھائے باہر نکل گئی۔

صائمہ نے بے دلی سے اسے تسلی دینا چاہی...." خالہ کہہ رہی تھیں....."

"خالہ کیا کہہ رہی تھیں کیا نہیں کہہ رہی تھیں میں کچھ سننا نہیں چاہتی..... ہاں تم اماں سے کہہ دو..... کہ یہ روز روز کی بک بک مجھے پسند نہیں..... اب مجھ سے اپنی ذات کی یہ ہتک برداشت نہیں ہوتی..... ہر بار مجھے مہمانوں کے سامنے میٹھی ڈش کی طرح پیش کیا جاتا ہے چاندی کے ورق اور پستے کی ہوائیاں چھڑک کر..... لیکن مہمان مجھے کڑوے کسیلے لقمے کی طرح نگلے بغیر الٹ کر چلے جاتے ہیں۔ کسی کو میری ذلت کا احساس نہیں ہوتا۔ کسی کو اس کرب کا اندازہ نہیں ہوتا..... جس سے ہر بار مجھے گزرنا پڑتا ہے..... میں....."

"رابعہ....." صائمہ دکھی لہجے میں بولی" یہ سب ٹھیک ہے لیکن کیا کیا جائے..... ہمارے رسم و رواج ہی ایسے ہیں....."

"تم ان رسم و رواج کی بھینٹ نہیں چڑھی نا..... خوش بخت ہو....."

صائمہ نے خاموشی سے رابعہ کو دیکھا..... رابعہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی..... یہ اس کی خوش بختی ہی تھی..... جو اسے کرب کی ان منزلوں اور دکھ کے ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا تھا..... بزرگوں نے نعمان اور اس کا بندھن باندھ دیا تھا۔

شام گھر میں بڑی گہما گہمی تھی..... بیٹھک میں مہمان عورتیں بیٹھی تھیں..... خالہ پھوپھو اور چچی ان سے باتیں کر رہی تھیں..... اماں بھی وہیں تھیں..... صائمہ نے چائے بنا کر رابعہ کو اندر لے جانے کے لیے دی تھی..... چائے کے ساتھ لوازمات بھی تھے.....

تقریباً آدھے گھنٹے سے رابعہ اندر گئی ہوئی تھی..... صائمہ اس کے باہر آنے کی منتظر تھی لیکن اندر تو خوب باتیں ہو رہی تھیں کبھی کبھی قہقہے بھی سنائی دیتے تھے۔ ماحول کی خوشگواری سے اندازہ ہو رہا تھا..... کہ بات بن ہی گئی ہے۔

اور

بات بن ہی گئی تھی..... لڑکے کی ماں اور دونوں بہنوں نے رابعہ کو پسند کیا تھا۔

جانے یہ خالہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا..... یا واقعی انہیں رابعہ پسند آگئی تھی..... جو کچھ بھی تھا انہوں نے اپنی پسند کا اظہار اس طور کیا تھا کہ جاتے سمے رابعہ کے ہاتھ پر روپے رکھے تھے.....

گھر بھر میں کیا پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی..... مبارک سلامت ہو رہی تھی..... تایا ابا آگئے تھے..... ماموں ممانی چچا پھوپھا خالہ سبھی آن پہنچے تھے..... امی ابّا تو یوں ہلکے پھلکے ہو گئے تھے جیسے منوں بوجھ کندھوں سے اُتر گیا ہو..... سب سے زیادہ خوشی صائمہ کو ہوئی تھی وہ تو رابعہ سے پٹ لپٹ گئی رابعہ کو بھی توقع نہیں تھی۔ لیکن اسے پسند کر لیا گیا تھا۔ اعتماد و سکون سے اس کا سانولا سلونا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا.....

سب خوش تھے

بہت خوش تھے

لڑکے کی ماں بہنیں اگلے دن انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ گھر بار دیکھنا تھا۔ لڑکے سے ملاقات کرنا تھی..... ان کی طرف سے بھی ہاں ہونے کی صورت میں منگنی کی رسم ادا ہونا تھی۔ رشتے کے لیے جتنے مسائل کھڑے ہوئے تھے انہیں دیکھتے ہوئے تو گھر بار دیکھے بنا اور لڑکے سے ملے بغیر ہی رشتہ طے کر دیا گیا تھا..... اتنا ہی کافی سمجھا گیا تھا کہ کھاتے پیتے انہی کی طرح متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ مکان اپنا ہے جو محلے میں سب سے بڑا ہے..... لڑکا بی اے پاس ہے اور بنک آفیسر ہے۔ خالہ نے لڑکا دیکھا ہوا تھا..... واجبی سی شکل تھی..... لیکن قد کاٹھ کا اچھا تھا..... تکلفاً ہی ان کے ہاں جانا تھا۔

رات پورا خاندان اکٹھا ہوا تو چیدہ چیدہ بزرگوں نے لڑکے کے ہاں جانے اور منگنی کی رسم ادا کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ سب اپنے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

"شکر ہے خدا کا،" تایا ابا رابعہ کے ابّا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے" بات طے ہو گئی....

تم تو باپ تھے۔ تمہارے کندھوں پر بوجھ تو تھا ہی..... لیکن یہ بوجھ ہم لوگ بھی اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتے تھے.....،"

"بالکل" چچا میاں نے کہا" بس نہیں چلتا تھا میرا ورنہ رابعہ جیسی پیاری بیٹی کو کب کا اپنے گھر کا کر دیا ہوتا۔

"ہمیں اس بات کا پتہ نہیں تھا..... آج تک جتنے رشتے بھی ہوئے خاندان برادری ہی میں ہوئے" پھوپھو نے کہا..... "باہر رشتہ کرنا کتنا مشکل ہے...... توبہ توبہ..... خاص کر بیٹی کا.....،"

"واقعی......" چچی نے کہا..... "شکر ہے بات بن تو گئی..... آگے بھی خدا اچھا کرے.....،"

"لوگ تو اچھے ہی لگتے ہیں...... رنگت کا اعتراض کیا نہ کسی اور بات کا....،" ممانی نے گہری مطمئن سانس لیتے ہوئے کہا.....

"خدا انجام بخیر کرے" خالہ بولیں۔

"آمین" تقریباً سبھی نے کہا۔

پھر خوشی خوشی کل لڑکے والوں کے ہاں جانے کا پروگرام بننے لگا۔ تایا ابا نے جو فیصلہ کیا سب نے مان لیا۔

"کل صرف رابعہ کی امی اور خالہ وہاں جائیں گی۔ ساتھ اظہر چلا جائے گا۔ لڑکے کے متعلق پوچھ گچھ میں خود کر لوں گا۔ کل صرف رسمی کارروائی کرنا ہے جیسے وہ لوگ رابعہ کے ہاتھ پر پیسے رکھ گئے ہیں تم لوگ بھی رکھ آنا۔ باقی سب کچھ منگنی پر دیکھا جائے گا..... ہاں بہتر ہو گا اچھے شگون کے لیے ساتھ مٹھائی بھی لیتے جاؤ.....،"

"جی بہت اچھا" رابعہ کی امی نے کہا۔

دوسرے دن خوشی خوشی تینوں لڑکے کے ہاں گئے۔ خاطر مدارات ہوئیں گپ شپ رہی

منگنی کی تاریخ بھی طے ہو گئی رابعہ کی امی نے امتیاز احمد کے ہاتھ پر سو سو کے پانچ نوٹ رکھے مبارک سلامت کا شور مچا۔ امتیاز احمد کو سب نے پسند کیا خوبصورت نہ سہی قبول صورت ضرور تھا۔

منگنی کی رسم ادا ہوئی اس دن بڑی رونق بڑی گہما گہمی تھی ہر کوئی خوشی کا اظہار کر رہا تھا سب کو خوشی ہوئی بھی بہت تھی۔ جو بات سب کے ذہنوں میں ناممکن بنی ہوئی تھی وہ ممکن ہو گئی تھی۔ خوشی و مسرت کا اظہار قدرتی تھا۔

رابعہ نے منگنی کا کامدانی جوڑا پہنا۔ لال نگینے والی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی گئی لڑکے والے رخصت ہو گئے تو خاندان کے لڑکے لڑکیوں نے رابعہ کو آن گھیرا۔ سارے کزن بے حد خوش تھے اور اپنی اپنی خوشی کا اظہار چھیڑ چھاڑ قہقہوں اور ہنسی مذاق سے کر رہے تھے۔

شادی چھ ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی لیکن تیاریاں شروع ہو گئیں اماں نے کپڑا لتا تو خرید رکھا تھا۔ برتن بھانڈے بھی لیے ہوئے تھے سوئی سلائی بھی کافی جمع کر رکھی تھی۔ پھر بھی سو کام تھے۔ بازاروں کے چکر تو اسی دن سے شروع ہو گئے تھے خریداری ہی ختم نہ ہو رہی تھی درزی کے پاس جا آ رہی تھیں رنگائی کے لیے دوپٹے دیئے جا رہے تھے۔ کامدانی کپڑے تیار ہو رہے تھے گوٹے لپے دوپٹوں پر ٹکائے جا رہے تھے اماں کا تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہا تھا ایک تو پہلی بیٹی کی شادی تھی دوسرے اتنے ذہنی کچوکوں اور جھٹکوں کے بعد یہ خوشی کا موقع آیا تھا خوشی خوشی بھاگ دوڑ کر رہی تھیں پھپھو خالہ ممانی تائی اماں چچی بھی مقدور بھر تیاری میں مدد کر رہی تھیں۔

رابعہ اور صائمہ بھی جتنا وقت ملتا صرف کرتیں امتحانوں کے بعد دونوں نے اماں کا بار سنبھال لیا۔ کڑھائی سلائی کے ڈھیر سارے کام دونوں نے اپنے ذمہ لے لیے۔

خدا خدا کر کے وہ دن قریب آ گیا رشتہ داروں کو بلاوے دے دیئے گئے عزیزوں دوستوں کو کارڈ بھجوائے گئے...... بارات بٹھانے کے لیے جگہ کا انتخاب ہوا..... شامیانے آئے

کرسیاں بچھیں رات بھر دیگیں چولہوں پر چڑھتی اُترتی رہیں۔ لذیذ کھانوں کی خوشبو فضا میں پھیلتی رہی۔

بارات دوپہر کو آنا تھی سو آدمی آنا تھے لیکن عورتیں اور بچے ملا کر ڈھیر سو سے بھی بڑھ گئے گھر مہمانوں سے پہلے ہی بھرا تھا چہل پہل تھی رونق تھی گہما گہمی تھی بیٹی کا معاملہ تھا۔ رشتے دار تو رشتے دار گلی محلے کے لوگ بھی بڑھ بڑھ کر کام کر رہے تھے۔

بارات کو آتے ہی مشروب پیش کیے گئے

کھانے سے پہلے نکاح ہونا تھا۔ مولوی صاحب آئے بیٹھے تھے لڑکے اور لڑکی کے بزرگ آپس میں مہر اور دوسری باتیں طے کر رہے تھے۔

لیکن

جانے کیا ہوا

بات کس کی طرف سے ہوئی...... دونوں طرف کے بزرگوں کے چہرے تن گئے.....

ناگواری سی پھیل گئی آہستہ آہستہ باتیں کرنے والے بلند آوازوں میں بولنے لگے۔

"کیا ہوا......؟"

"کیا ہوا......؟"

لوگ ان کے اردگرد جمع ہو گئے کسی نے پوچھنے کی کوشش کی۔ کسی نے سمجھانے کی۔ لیکن آوازیں بلند سے بلند تر ہو گئیں۔ لڑکے والے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ تو تکار ہونے لگی۔ لڑائی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

مہر باندھنے پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ جو دوسرے رشتہ داروں کے بیچ بچاؤ کرنے سے بھی حل نہ ہوا۔ تلخ لہجے اور تیز ہو گئے۔ غصہ آ گیا۔ تاؤ میں کچھ پتہ نہ چلا کر کیا کہا جا رہا ہے کیا سنا جا رہا ہے۔

تُو تُو مَیں مَیں بک بک۔ محاذ تپ اُٹھا۔ اور جب لڑکے کے ماموں نے للکار کر تایا ابا سے

کہا "اور تم کس بات کی دے رہے ہو۔ ہمارے لڑکے کے لیے لڑکیوں کی کمی ہے کیا؛ دیکھیں گے تمہاری کالی کلوٹی بیٹی کا ڈولا کوئی اُٹھانے آتا ہے..... ہم ہی....."

لوگ پکڑ نہ لیتے تو تایا ابا اس آدمی کا گلا دبوچ دیتے طیش سبھی کو آ گیا تھا مہمانوں نے بمشکل لڑکے والوں کو پنڈال سے نکالا۔ باراتی تو پہلے ہی اٹھ اٹھ کر جانے لگے تھے۔

بارات کیا لوٹی۔ قیامت ہی ٹوٹ پڑی جیسے رابعہ تو پتھرا ہی گئی اماں نے سینہ پیٹ لیا ابا دھاڑیں مار مار کر رونے لگے سب رشتہ دار عزیز ساکت سے ہو گئے صرف تایا ابا اور چچا میاں دھاڑ رہے تھے۔

"ہمیں طعنہ دے کر گئے ہیں ذلیل...... ہماری بیٹی کا ڈولا نہیں اُٹھے گا؟"

"جیسے یہی رہ گئے تھے ڈولہ اٹھانے والے"

اماں نے سینے پر دوہتڑ مارا اور روتے ہوئے چلائیں "ہاں ہاں۔ ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ کیسے ڈولہ اُٹھے گا۔ کون لے کے جائے گا اسے...... کون لے جائے گا اسے....؟"

"میں لے کر جاؤں گا....." اماں کے جواب میں چچا نے سینے پر جوش جذبات میں ہاتھ مار کر کہا۔

"کیا؟" کئی آوازیں اُٹھیں۔ تایا ابا نے بھائی کی طرف دیکھا "تم......"

"ہاں بھائی...... رابعہ کا ڈولا پروگرام کے مطابق آج ہی اٹھے گا۔ میں نعمان کے ساتھ اس کی شادی کر دوں گا"

پھر دونوں بھائیوں نے ہولے ہولے کچھ کھسر پھسر کی۔ حاضرین تو اس فیصلے سے دم بخود ہو گئے تھے۔ نعمان کو بلایا گیا۔ بیچارہ سٹپٹا گیا۔ نہ کرنا چاہی لیکن لب ہلنے سے پہلے ہی تایا ابا دھاڑے "اس وقت خاندان کی عزت اور وقار کا سوال ہے۔ خبردار جو کسی نے اس فیصلے کے خلاف زبان کھولی......"

"لیکن نعمان تو صائمہ سے منسوب ہے" کسی رشتہ دار نے جرأت کر ہی ڈالی کہنے کی۔

"اس نسبت کا فیصلہ بھی ہم ہی نے کیا تھا،" چچا جذباتی طیش سے بولے "اور یہ فیصلہ بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ نعمان کی شادی رابعہ سے ہو گی ابھی اسی وقت۔ چلیے بھائی صاحب مولوی صاحب سے کہیے نکاح پڑھائیں.....؟"

اور پھر رابعہ اور نعمان کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی مولوی صاحب کے دو بولوں نے انہیں ایک بندھن میں باندھ دیا۔

بزرگوں کے فیصلے کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اس خاندان کے بچوں نے ان فیصلوں کو برداشت کر لینا ہی سیکھا تھا۔ کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ بزرگوں نے خاندان کی عزت و وقار اور حالات کی نزاکت کو دیکھا تھا، مصلحتوں پر حقیقتوں کو قربان کر دینا ضروری سمجھا تھا۔

لیکن

ان کے اس فیصلے سے زندگی ایکا ایکی کسی اچانک اور کس تیزی سے پلٹا کھا گئی تھی۔ یہ لہولہان دل ہی جانتے تھے۔

پھر بھی سرتابی اور عدول حکمی کے حق کا اس خاندان میں تصور ہی نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ وار سہہ جانا اور خاموشی سے مصلحتوں پر حقیقتوں کو قربان کر دینا ہی ضروری تھا۔

دو دل

بے آواز ٹوٹ گئے۔

قسمت کے کھیل

رابعہ نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ مختصر سا خط اس نے چند لمحوں میں پڑھ لیا۔ خط پڑھ کر اس کے چہرے پر نڈھال سی پژمردگی چھا گئی۔ آنکھوں میں ہلکے سے کرب نے انگڑائی لی۔ ایک غیر محسوس سی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس نے خط تخت کے کنارے رکھ دیا۔

تخت پر بیٹھی گاجریں چھیلتی اماں نے گول شیشوں والی عینک کے اوپر سے اس کو دیکھا۔ ہاتھ روک کر جلدی سے بولی۔

کس کا خط ہے بہو۔

عصمت آپا کا..... رابعہ پلاسٹک کے کٹورے میں پڑے مٹر اپنی طرف کرتے ہوئے تخت پر بیٹھ گئی۔

"تمہاری کراچی والی بہن کا۔

"ہاں....."

"کیا لکھا ہے"

"عرفان کی شادی کا لکھا ہے"

"کب ہو رہی ہے"

"اس ماہ کی اٹھائیس کو....."

"بارات کراچی سے آئے گی؟ منگنی تو اس نے یہیں کی ہے نا....."

"کراچی سے کیسے اتنے لوگ آ سکتے ہیں..... بارات یہیں بنے گی....."

"نہیں"

"ہاں اماں..... آپا ہمارے ہاں ہی ٹھہریں گی"

"اچھا....."

"کراچی سے تو صرف گھر والے ہی آئیں گے..... لکھا ہے، مہندی کی رسم بھی یہاں کریں گے بارات بھی یہیں اور ولیمہ کراچی میں ہو گا"

"اماں کے چہرے پر بھی کچھ خوشگوار تاثرات نہیں تھے۔ ہولے ہولے ٹھنڈی سانسیں وہ بھی لینے لگی۔

"قسمت کی بات ہے نا....." وہ افسردگی سے بولی۔ ربیعہ نے بھی آہستگی سے سر ہلایا ہاں اماں یہ رشتے ناطے قسمت ہی سے ہوتے ہیں۔

"جب عصمت نے فریدہ کا رشتہ لینے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اس وقت نوید سے رشتے کی بات پکّی ہو رہی تھی....."

"کیا خبر تھی..... اتنا اچھا رشتہ اس طرح ٹوٹ جائے گا"

"ہوں"

"اور ٹوٹا بھی اس وقت جس وقت آپا نے عرفان کی منگنی کر دی"

"پہلے ٹوٹ جاتا تو عرفان ہی سے نہ ہو جاتا..... دیکھا بھالا لڑکا تھا"

"مالی لحاظ سے بھی عصمت آپا ہم سے بہت اونچی ہیں"

"بس یہی تو لیکھ نصیب ہوتے ہیں بہو..... اس وقت تو جو رشتہ ہو رہا تھا۔ وہ عرفان سے تو کہیں زیادہ اچھا تھا نا..... تعلیمی لحاظ سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی۔

"رشتہ ہوتے ہوئے بھی آپا پوچھ لیتیں۔ تو میں نوید پر عرفان ہی کو ترجیح دیتی۔ اپنا بچہ تھا کوئی عیب کوئی برائی نہ تھی۔ نوکری بھی اچھی ہی تھی۔ آہستہ آہستہ ترقی ہو ہی جاتی ہے۔

"کہا نا بہو، سب لیکھ نصیب کی بات ہے۔ اپنوں سے اچھا کون۔ غیر ہی تھے۔ جو لگائی

بجھائی میں آ کر رشتہ توڑ دیا....."

"ہاں اماں..... پر اب کیا کریں۔ مجھے تو فریدہ ہی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ رشتہ کسی وجہ سے بھی ٹوٹے۔ دوبارہ کرنے میں سو قباحتیں نکلتی ہیں"

"جانتی ہوں بہو..... لڑکی پر ہی حرف آتا ہے..... لیکن کیا کریں۔ ہماری بچی کی قسمت خدا اچھی کرے۔ بس یہی دعا کرتی ہوں میں تو....."

"فریدہ خود بھی تو بہت حساس ہے۔ جب سے منگنی ٹوٹی ہے۔ بجھ سی گئی ہے۔

"اللہ بہتر ہی کرے گا..... قصور سراسر لڑکے والوں کا ہے"

"سزا تو ہم بھگت رہے ہیں۔ خدا جانے اب کہاں رشتہ ہو گا۔ کب ہو گا"

"فکر نہ کیا کر بہو..... بس خدا سے دعا کیا کر..... ہو ہی جائے گا کہیں نہ کہیں"

"ربیعہ نے مٹروں کے دانے نکالتے ہوئے اک گہری آہ بھری....." رشتہ نہ ٹوٹتا۔ تو شادی کو دو ماہ گزر بھی چکے ہوتے۔ بار اتر جاتا سر سے..... بیٹی ایک ہی ہوتی تو فکر نہ کرتی میں اب تو سعیدہ بھی سترہ سال کی ہو گئی ہے اور حمیدہ بھی تو دیکھو کیسے قد کاٹھ نکال رہی ہے۔ ابھی چودہ برس کی بھی نہیں۔ اور سعیدہ کے برابر کی لگتی ہے۔

"لڑکیاں بیلوں کی طرح بڑھتی ہیں بیٹی....." اماں نے گاجریں چھیل کر چھری لگن میں رکھتے ہوئے پاس پڑی صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا" اللہ کی رضا بیٹے دونوں چھوٹے ہیں۔ اور بیٹیاں جوان....."

"فریدہ ہی کی شادی ہو جاتی تو فکر نہ تھی....."

"ایک لحاظ سے تو رشتہ ٹوٹ کر اچھا ہی ہوا۔ لالچی لوگ تھے۔ ہم لوگ ان سے کیسے نبھا کر سکتے تھے..... لالچ ہی میں تو رشتہ توڑ کر امیر گھر میں کیا ہے....."

"ہاں اماں" ربیعہ نے گاجروں والا لگن اور مٹروں والا کٹورا اٹھاتے ہوئے کہا۔

پھر دونوں چیزیں سامنے باورچی خانے میں لے جاتے ہوئے بولی....." اماں مٹر قیمہ نہ بنا

لوں دوپہر کے لیے بچے بھی خوش ہو کر کھاتے ہیں اور فریدہ کے ابا کو بھی پسند ہیں.....

"کچھ پکا لو بہو..... اماں نے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ وہ تو سوچوں میں ہی گم ہو گئی تھی۔ سوچ رہی تھی فریدہ کا رشتہ ٹوٹنا ہی تھا۔ تو عرفان کی منگنی سے پہلے ٹوٹ جاتا۔ کتنا اچھا ہوتا۔ جو بات گھر میں ہی بن جاتی۔ اب تو..... اب تو.....

وہ جانے کیا کیا سوچے گی.....

"ربیعہ باورچی خانے میں کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ ذہن اس کا بھی اماں کے ڈھنگ پہ ہی سوچ رہا تھا۔

"آپا..... آپا....." سعیدہ فریدہ کے کمرے میں آندھی کے تیز جھونکے کی طرح داخل ہوئی۔ "کیا ہے" فریدہ کاپیاں چیک کر رہی تھی..... اسے یوں اندھا دھند آتے دیکھا تو گردن موڑ کر کہا۔ "بہت خوش ہے..... کیا مل گیا"

"آپ کو نہیں پتہ" سعیدہ نے اس کے ہاتھ سے کاپی لے کر باقی کاپیوں پر رکھ دی۔

وہ ابھی ابھی کالج سے آئی تھی..... فریدہ ان دنوں ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھا رہی تھی۔ وقت گزاری اور منگنی کے صدمے کو بھلانے کے لیے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شادی کی خوشی میں فورتھ ایئر ہی میں پڑھائی چھوڑ دی تھی..... اب یہ بھی ارادہ تھا۔ کہ بی اے کا پرائیویٹ امتحان دے دے گی..... بہت حساس لڑکی تھی۔ وہ بھی تھوڑی ہی دیر پہلے سکول سے آئی تھی۔ امی گھر پہ نہیں تھیں۔ دادی پڑوس میں گئی تھیں۔ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ ڈھیر ساری کاپیاں چیک کرنا تھیں اسے۔

"آپا....." سعیدہ نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر کہا،

"کیا"

"آپ کو پتہ نہیں ہمارے گھر میں شادی ہو رہی ہے"

"فریدہ نے چونک کر اسے دیکھا..... اور بے اختیارانہ بولی" شادی"

"ہاں آپا..... خوب مزہ آئے گا۔ دھوم دھڑکے سے شادی ہو گی..... خوب رونق رہے گی"

"لیکن شادی کس کی ہو رہی ہے"

"عرفان بھائی کی....."

"عرفان....."

"ہاں خالہ عصمت کے بیٹے عرفان کی..... خط آیا ہے، خالہ کا، عرفان بھائی کی منگنی یہیں لاہور ہی میں ہوئی ہے نا....."

"ہاں....."

"شادی بھی یہیں ہو گی۔ خالہ ہمارے ہاں ہی ٹھہریں گی....."

"خط آیا ہے"

"ہاں..... آپا خوب مزہ آئے گا..... چار پانچ دن تو گہما گہمی رہے گی"

"سعیدہ خوشی خوشی اسے بتاتی رہی..... فریدہ بولی" شادی ہے کب"

"اٹھائیس کو..... ستائیس کی شام مہندی ہو گی..... اٹھائیس کی دوپہر بارات جائے گی۔ دلہن ہمارے ہاں ہی اُترے گی..... انتیس کی شام چار بجے کی فلائیٹ سے سب واپس جائیں گے۔ ولیمہ ایک دن چھوڑ کر یعنی اکتیس کی رات کو ہو گا۔ آپا ہم سب تو کراچی نہیں جا سکیں گے نا..... ہائے اللہ..... میں تو ضرور جاؤں گی.....

"تیرے امتحان سر پہ آ رہے ہیں سعیدہ....."

"ہیں تو....."

"یہ ہفتہ بھر کا ہلہ گلہ اثر انداز نہ ہو گا"

"کیا ہوا....."

"اچھا کچھ نہیں ہوا....."

"بھئی آپا..... ایسے موقع کبھی کبھی ہی تو آتے ہیں۔ اب اتفاق ہی ہے کہ عصمت خالہ کراچی میں رہتی ہیں۔ اور انہیں بیٹے کی شادی لاہور میں کرنا ہے۔ ٹھہرنے کے لیے ٹھکانہ تو چاہیے تھا نا..... اپنی بہن کے گھر نہ ٹھہرتیں..... تو.....؟"

"ان کے سسرالی عزیز بھی تو ہیں لاہور میں....."

"بہن سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ ہوتا ہے آپا" اس نے پیار سے فریدہ سے کہا.....

فریدہ مسکرا دی.....

"اب ہٹ" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ کام کرنے دے مجھے۔"

"آپ تو بس کام ہی میں جتی رہے گی۔"

"تو اور کیا کروں"

"ناخوشی کی بھی بات نہیں۔ لیکن مجھے کام کرنا ہے..... ڈھیر ساری کاپیاں چیک کرنی ہیں....."

"آپ چیک کرتی ہیں۔ میں تو امی سے حساب کتاب کرتی ہوں جا کر..... شادی پر پہننے کے لیے کپڑے تو ہیں ہی نہیں میرے پاس..... دو جوڑے تو بنوا کر دیں....."

"جی ضرور بنوا کر دیں گی۔ ایک تم ہی تو نہیں ہو..... میں اور حمیدہ بھی ہیں جناب...."

"سعیدہ نے منہ بنایا۔ فریدہ ہنس پڑی.....

صبح دس بجے کی فلائٹ سے عصمت اپنے میاں دونوں بیٹوں اور چھوٹے بیٹے کے ہمراہ پہنچ گئی۔ عرفان شام کی فلائٹ سے آ رہا تھا.....

ربیعہ نے سارے انتظامات پہلے ہی سے کر دیئے تھے۔ اوپر والی منزل ان کے لیے خالی کر دی تھی..... یہاں سے اکٹھے ہونے والے مہمانوں کے لیے بھی کمرے ٹھیک کر دیئے تھے۔ راشن بھی جمع کر لیا تھا۔ فالتو بستر بھی محلے سے اکٹھے کر کے ایک کمرے میں جمع کر دیئے تھے۔ فریدہ اور سعیدہ نے تو مہندی کے تھال بھی سجا دیئے تھے۔ سعیدہ تو دو دن سے ان کی

سجاوٹ میں لگی ہوئی تھی۔ رنگا رنگ پنیوں اور کاغذوں سے بڑے خوبصورت تھال سنوارے تھے۔ شمعیں بھی منگوا رکھی تھیں۔" عصمت سارے انتظامات دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بار بار ان سب کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کر رہی تھی.....

"شکریئے کی کیا بات ہے بیٹی" اماں نے بار بار شکریہ ادا کرنے پر اسے ٹوکا....." اپنا گھر ہے تمہارا..... اطمینان رکھو....."

"اماں" عصمت مسکرا کر بولی" اپنے گھر میں بھی شاید میں اس طرح کے انتظامات نہ کر پاتی آپ لوگوں نے اتنی محبت اور پیار سے میرا بار بٹایا ہے۔ شکریہ تو از خود ہی ادا ہونے کو مچل رہا ہے....."

"خدا خیریت سے تمہیں اس فرض سے فارغ کرے اور بخیر و عافیت دلہن لے کر گھر جاؤ"

"آپ کی دعاؤں کی طالب ہوں....." عصمت بولی۔

شام عرفان بھی آ گیا.....

"اماں اور ربیعہ نے اسے کوئی دو تین سال بعد دیکھا تھا۔ اب تو وہ خاصی وجیہہ اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ جسم بھی پہلے سا دبلا پتلا نہیں تھا..... جوانی ٹوٹ کر آئی تھی..... بہت نکھرا نکھرا تھا۔ ہنس مکھ بھی بہت تھا اس کے آتے ہی گھر میں رونق آ گئی..... اماں اور ربیعہ اسے دیکھ دیکھ دل ہی دل میں قدرتی طور پر افسوس بھی کر رہی تھیں۔ کاش یہ بر فریدہ کے نصیب میں ہوتا۔

"عرفان جلد ہی خالہ اور خالہ زادوں سے گھل مل گیا۔ سعیدہ تو تھی ہی باتونی..... وہ بھی عرفان سے بے تکلف ہو گئی..... تکلف فریدہ بھی نہیں برت رہی تھی۔ عرفان کی خوش خلقی اور ہنسنے ہنسانے کی عادت نے سارے تکلف بالائے طاق رکھ دیئے تھے۔

رات سب دیر تک گپ شپ لگاتے رہے۔ عصمت نے دلہن کے لیے جو بری بنائی تھی۔ وہ سب کو دکھائی.....

"بہت خوبصورت جوڑے تھے۔ ایک سے ایک بڑھیا ایک سے ایک قیمتی..... ساڑھیاں بھی بہت پیاری تھیں۔

عصمت نے فریدہ سے کہا تھا..... کہ وہ سب کو چیزیں دکھائے۔ سعیدہ نے بکس کھولے تھے۔ اور فریدہ ایک ایک جوڑا نکال کر سب کو دکھا رہی تھی۔ کامدانی جوڑے بیحد خوبصورت تھے۔

"خالہ یہ کام کہاں سے کروایا....."

"یہ ساڑی کتنے میں خریدی"

"اس غرارے کا کام تو بہت ہی پیارا ہے"

"یہ دوپٹہ بڑا نفیس ہے"

"اف یہ جوڑا تو سب پر سبقت لے گیا۔ بہت بھاری کام ہے۔ یہ پہلے دن دلہن پہنے گی یا ولیمہ کے دن" کپڑے دیکھ دیکھ کر سب سوال کر رہے تھے۔ تعریف کر رہے تھے۔ فریدہ بھی خوشی خوشی کپڑے دکھاتے ہوئے لباسوں کی تعریف کر رہی تھی۔

پھر سعیدہ نے زیور کے ڈبے فریدہ کی طرف بڑھا دیئے..... اس مہنگائی کے زمانے میں بھی خوب زیور بنا تھا۔

"خالہ آپ تو واقعی بہت امیر ہیں" فریدہ نے مسکرا کر کہا۔

"بس اللہ کا شکر ہے بیٹی" عصمت نے فریدہ کو دیکھ کر کہا "جس کی قسمت میں تھا بن گیا"

"خدا اس کے نصیب کرے" ربیعہ نے بے دلی سے کہا۔ کپڑے اور زیور دیکھ کر اسے خوشی تھوڑا ہی ہوئی تھی..... وقت کے تھوڑے سے ہیر پھیر نے اس کی بچی کو ان سب چیزوں سے محروم کر دیا تھا۔

دوسرے دن مہمان آنا شروع ہو گئے۔ رات رسم حنا تھی..... لڑکیاں بالیاں جمع تھیں۔ بسنتی کپڑے پہنے ڈھولک پیٹ رہی تھیں۔ ادھورے ادھورے گیت گا گا کر شور مچا رہی تھیں..... فریدہ سعیدہ اور حمیدہ تینوں بہنیں بھی ان میں شریک تھیں۔ میزبانی کے فرائض بھی ادا کر

رہی تھیں۔ عصمت کو توقع نہیں تھی..... لیکن اب ان سب کا رویہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ربیعہ نے بہن ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ ربیعہ کے دل میں جو کسک تھی عصمت کے دل میں بھی تھی..... لیکن اب کچھ ہو تو نہیں سکتا تھا۔ وہ بھی فریدہ جیسی لڑکی کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ کہ اسے اچھا بر اور گھر جلد مل جائے۔

رات سارا گھر روشنیوں سے بھرا تھا۔ رنگا رنگ روشنیوں کے جھومر مکان کے ماتھے پر بھی سجے تھے۔ عورتیں بن سنور رہی تھیں۔ زیور اور کپڑے کی نمائش کا یہی تو موقعہ ہوتا ہے۔ فریدہ اور سعیدہ نے بھی پیلے کپڑے پہنے تھے۔ دونوں بہنیں مہندی کے تھالوں پر شمعیں سجا رہی تھیں۔ خاندان کی دو چار اور لڑکیاں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ بہت خوبصورت تھال سجے تھے۔ عرفان ادھر آ گیا۔ مہندی کے سجے تھالوں کو دیکھ کر بولا.....

"یہ کیا؟"

"مہندی..... فریدہ بولی۔

"سجائی کس نے"

سعیدہ نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا "مابدولت نے....."

"چل جھوٹی..... سارا کام میں نے کیا ہے عرفان بھائی" فریدہ بولی "سکول سے پورا ہفتہ چھٹی کی ہے میں نے یہ سب کام کرنے کے لیے....."

"تم سکول جاتی ہو؟"

"پڑھاتی ہوں"

"نہیں تو....."

"اس میں نہیں کی کیا بات ہے..... گھر بیٹھے بور ہوتی رہتی تھی۔ سکول جانے لگی۔ وقت اچھا گزرنے لگا ہے۔ عرفان نے بڑی گہری نظروں سے فریدہ کو دیکھا..... خوش نظر آنے کے باوجود وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔

"ہاں تو عرفان بھائی" سعیدہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"ہوں" وہ اس طرف مڑا۔

"مہندی سجانے کا مجھے کیا ملے گا"

"کیا لو گی"

پورا سو روپیہ"

"بس!"

فریدہ جلدی سے بولی" اپنی حیثیت دیکھ کر بات کی ہے اس نے ہیں تو....."

"تم کیا لو گی....."

"پانچ سو....."

"منظور......"

دونوں ہنس پڑے......

عرفان دولہا بنا بیٹھا تھا۔ باراتی جمع ہو چکے تھے۔ بینڈ بج رہا تھا۔ خوب شور شار مچا تھا..... بارات کے ساتھ جانے کے لیے عورتیں بھی تیار ہو رہی تھیں...... خوب بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ کوئی میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھی کوئی لباس کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوسری سے رائے طلب کر رہی تھی۔ کوئی بچوں سے نپٹ رہی تھی۔ کوئی زیور پہن رہی تھی۔

دولہا کو بھی بہنیں گھیرے ہوئے تھیں۔ عرفان کی اپنی تو دو ہی بہنیں تھیں۔ ہاں رشتے ناطے کی پندرہ بیس لڑکیاں اس کے ارد گرد جمع تھیں۔ یہ سب رشتے ناطے کی بہنیں تھیں۔ بارات کی روانگی سے پہلے سب بھائی سے اپنا نیگ مانگ رہی تھیں۔

فریدہ بھی ان میں شامل تھی.......

عصمت قریب ہی کھڑی ان سب کا ہنسی مذاق دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی اس

نے اپنا بھاری بھرکم بٹوہ کھولا..... اور پچاس پچاس کے نوٹوں کی گڈی عرفان کو دیتے ہوئے کہا" سب کو ایک ایک نوٹ پکڑاتے جاؤ......

یعنی صرف پچاس پچاس" لڑکیوں میں سے کوئی بولی۔

تو اور کتنے گھیرے میں کھڑی لڑکیوں کے پیچھے کھڑی ربیعہ نے کہا۔"

"اوں ہوں ....." فریدہ نے سر ہلایا۔ وہ عرفان کے دائیں ہاتھ بہت قریب کھڑی تھی۔

"نہیں بیٹی" ربیعہ نے کہا" کافی ہیں۔

"اوں ہوں..... امی..... آپ درمیان میں نہ آئیں..... ہم خود عرفان بھائی سے وصول کریں گے۔

"بالکل۔ بالکل" سب لڑکیوں نے تالیاں پیٹیں۔

"اتنا شور مچاؤ گی۔ تو پچاس کی بجائے صرف دس دس روپے ملیں گے۔ عرفان نے جیب سے دس دس کے بہت سارے نوٹ نکالے۔

"یہ اپنی دلہن کو دیجئے گا جناب" فریدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہمارے لیے تو لال لال نوٹ نکالیے۔

"بات سنو" عرفان نے شوخی سے اسے قریب بلایا۔ وہ جھکی تو عرفان نے اس کے کان میں اونچی آواز میں سرگوشی کی" ہم تم معاملہ طے کر لیتے ہیں....."

"کیسے!"

"ان سب کو پچاس پچاس میں ٹرخا دو..... تمہیں سو دوں گا....."

"واہ..... کل سو....."

"چلو یہ دس دس کے سارے نوٹ تم لے لینا....."

"میں نے کہا نا اپنی دلہن کو دیجئے گا یہ..... سنبھال کر رکھیے..... ہمیں تو دو لال

نوٹ دے دیں۔ جان چھڑا دو سب سے.....“

”ٹھیک.....“

”منظور.....“

”منظور.....“

”عرفان اور فریدہ میں معاملہ طے ہو گیا۔ خوب شور مچا..... ہلا گلہ ہوا..... لیکن سب کو پچاس پچاس روپے لینا ہی پڑے۔ کیونکہ بارات کی روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ مرد غصے ہو رہے تھے۔ بارات کا وقت پر پہنچنا ضروری تھا..... پھولوں سے لدی گاڑی دروازے پر آن پہنچی تھی۔

دعاؤں اور خوشی کے کلمات کے سائے تلے دولہا اٹھا... اٹھتے وقت اس نے دو لال نوٹ فریدہ کی مٹھی میں چپکے سے تھما دیئے۔

دلہن والے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ استقبال بارات انہوں نے شان شایان طریق سے کیا۔ پنڈال میں رنگین کرسیاں بچھی تھیں۔ کھانے کی میزیں بھی دوسرے شامیانے تلے ترتیب سے لگائی گئی تھیں۔ کھانے کی مہک اور خوشبو فضا میں پھیلی تھی..... لڑکی والے بڑی ہوشیاری سے کام کر رہے تھے..... باراتیوں کو پھولوں کے ہار ڈال رہے تھے۔ اور بڑی عزت و تکریم سے کرسیوں تک لے جا کر بٹھا رہے تھے۔

گھر میں عورتوں کا بھی استقبال بڑے تپاک سے کیا جا رہا تھا..... لڑکیاں بالیاں پھولوں کی پتیاں ان کی راہوں میں بکھیر رہی تھیں..... ہنس ہنس کر عورتیں ان کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

چاروں طرف خوشی اور مسرتوں کی پھوار پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

”لیکن“

جانے کہاں سے ایکا ایکی ہی ظلمت کے اندھیرے پھیل گئے۔ ہنستا مسکراتا گھر سوگواری کی لپیٹ میں آ گیا۔ اک شور مچ گیا۔ گڑبڑ سی پھیل گئی۔ پہلے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ کہ کیا ہوا

ہے۔ لیکن جلد بات پھیل گئی......

نکاح کے وقت حق مہر کے معاملے میں فریقین میں جھگڑا ہو گیا..... لڑکی والے جو کچھ لکھانا چاہتے تھے اس پر لڑکے والوں کو اعتراض تھا۔ بیچ بچاؤ کی کوشش میں معاملہ اور بگڑ گیا نوبت سخت کلامی پر آ گئی جو بڑھ کر لڑائی کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر گالی گلوچ اور ہاتھا پائی کی صورت بھی پیدا ہو گئی۔ پنڈال میں بدنظمی پھیل گئی..... اک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا۔

غصہ حرام ہوتا ہے۔ یہ سر چڑھ جائے تو عقل و ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ انسان سوچ سمجھ نہیں سکتا..... جوش میں ہوش کی باتیں کب سوجھتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی لڑکی کے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ہوا..... رسوائی کا خیال آیا نہ ہی لگی لگائی کا..... لڑکے والوں کی اتنی بے عزتی کی کہ سوائے بارات کو لوٹا لے جانے کے کوئی چارہ ہی نہ رہا..... دونوں طرف کے بزرگوں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی۔ کہ غصے کی بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑ جائے ...... اور معاملہ طے ہو جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا......

”بارات لوٹ گئی......

سب کے چہرے اُترے سے گئے تھے۔ دولہا کو تو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ صبح جب وہ تیار ہوا تھا۔ تو اس پر کتنا نکھار تھا۔ کتنا حسن تھا۔ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ خوشی کی سرشاری تھی۔ بہک رہا تھا..... انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ لیکن اب تو چہرہ ویران سا لگ رہا تھا۔ ندامت کی تلخی آنکھوں میں گھل رہی تھی۔ آتے ہی بستر میں نڈھال ہو کر پڑ گیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا، کیوں ہو گیا تھا، اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

باراتی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ گھر میں آئے مہمان بھی اپنا بوریا بستر گول کر رہے تھے۔ ہر کوئی عصمت کو تسلی دے رہا تھا..... اس کے میاں کا حوصلہ بندھا رہا تھا۔

ربیعہ اور امّاں بھی اس انہونی سے پریشان تھیں......

امّاں تو بار بار یہ کہہ رہی تھیں۔ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ سب..... قسمت.....

کے کھیل ہیں......

عصمت غصّے سے لال پیلی ہو ہو کر لڑکی والوں کو کوس رہی تھی۔ انہیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔

"چلو اب بس بھی کرو اس کے میاں رحمان نے اسے یوں ہلکان ہوتے دیکھ کر مایوسی سے کہا" اب آگے کی سوچو..... کراچی اطلاع تو کر دیں۔ کہ ولیمہ کینسل کر دیں۔

عصمت ایک دم ہی چمک کر بولی" یہ رسوائی اور جگ ہنسائی گوارہ کرلو گے.....

اماں بیچ میں بولیں" بیٹی حوصلے سے کام لو..... اب سب کچھ برداشت کرنا ہی پڑے گا تمہیں.....؟"

ربیعہ بولی" رسوائی اور جگ ہنسائی تو لڑکی والوں کا مقدر بنی ہے آپا....."

اماں نے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا" قسمت کے کھیل ہیں بی بی....."

"ہاں اماں....." عصمت نے کہا" واقعی رشتے ناطے قسمت ہی کے کھیل ہیں"

رحمان اُٹھتے ہوئے بولا...." میں کسی کو بھیجوں۔ فون تو کر دے کراچی..... پھر دیکھا جائے گا سب کچھ۔ ولیمہ تو کینسل ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ وہاں....."

عصمت نے رحمان کی طرف دیکھا۔ پھر اماں اور ربیعہ پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ذہن میں کوئی بڑی اہم بات آئی تھی۔ چند لمحے چپ رہی پھر مستحکم لہجے میں بولی" آپ بیٹھ جائیں ولیمہ کینسل نہیں ہوگا۔

"کیا؟..... تقریباً سبھی نے عصمت کو حیرانگی سے دیکھ کر کہا۔

"ہاں..... ولیمہ کینسل نہیں ہوگا۔

میں اپنے بیٹے کی دلہن لے کر ہی کل کراچی جاؤں گی....." عصمت نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔ تو سب کو جیسے اس کی دماغی صحت پر شک سا ہوا.....

لیکن

وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی..... نارمل اور پرسکون......

اس نے اماں جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور التجا بھرے لہجے میں بولی" اماں..... میں عرفان کی دلہن کو لے کر ہی کراچی جاؤں گی.....؟"

بیٹی...." اماں نے کچھ کہنا چاہا

تو عصمت نے جھولی پھیلا کر اماں جی سے کہا میری جھولی میں خیر ڈال دیں اماں جی......

فریدہ کو میری بیٹی بنا دیجئے..... میں خالی ہاتھ نہیں لوٹوں گی..... میرا دامن بھر دیجئے....."

بات رحمان کے بھی شاید دل لگی...... وہ بھی کرسی سے اُٹھ کر اماں جی کے قدموں میں آن بیٹھا۔ عصمت کی طرح اس نے بھی فریدہ کو بیٹی بنانے کی خواہش کی۔

اماں تو کیا ربیعہ اور فریدہ کے ابا کا بھی دل خوشی اور حیرانگی سے دھک دھک کرنے لگا۔

عصمت اور رحمان فریدہ کا ہاتھ مانگ رہے تھے۔ بڑے ملتجی انداز میں۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ نہ تو اماں کی سمجھ میں آ رہا تھا نہ ہی ربیعہ اور فریدہ کے ابا کی...... ان کے کانوں میں تو شہنائیوں کا شور ایکا ایکی اتنے زور سے گونج اُٹھا تھا۔ کہ اور کوئی آواز کان میں اُتر ہی نہ رہی تھی۔

رات اُترتی تو ہر تھان ہر ٹھکانے پر ایک ساتھ ہی ہے۔ لیکن ہر جگہ اس کا ایک سا رنگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی رویئے ایک سے ہوتے ہیں۔ کہیں یہ چپ چاپ اُتر آتی ہے۔ کہیں سوگواری کا بوجھ لیے اور کہیں...... کہیں ہولے ہولے مسکراتے گنگناتے اُترتی ہے۔

یہ رات آج فریدہ کے کمرے پر بھی اس بھرپور انداز میں ہنستے مسکراتے اُتری تھی۔ یہ سادہ سا کمرہ جس میں حجلۂ عروسی والی کوئی جھلک نہ تھی۔ نہ ہی خوابناک روشنیاں تھیں اور نہ ہی پھولوں کے ہار تھے..... پنیوں اور کاغذی پھولوں کی لڑیاں بھی نہیں تھیں۔ خوشبوؤں سے معطر بھی نہیں تھا...... پھر بھی خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ فریدہ دلہن بنی بیٹھی تھی...... سادہ

سے سوٹ پر اس نے بہت بڑھیا کام والا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا...... یہ دوپٹہ عرفان کی دلہن ہی کے لیے بنا تھا...... کپڑے فریدہ کو پورے نہیں آئے تھے۔ اس لیے دوپٹہ ہی اوڑھا کر دلہن بنا دیا گیا تھا اب وہ سر جھکائے گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی...... عرفان اس کے قریب بیٹھا تھا..... تقدیر کے اس پلٹے پر دونوں ہی حیران تھے۔

"لیکن"

یہ

حیرانگی خوش کن بھی تھی۔

عرفان نے مسکراتے ہوئے فریدہ کا گھونگھٹ اٹھایا......اس کی جیب میں ننھے سے ڈائمنڈ والی وہ انگوٹھی بھی تھی۔ جو اس نے اپنی دلہن کو رونمائی میں دینے کے لیے خریدی تھی۔

لیکن

اس نے رونمائی میں دینے کے لیے وہ انگوٹھی نہیں نکالی۔

بلکہ مسکراتے ہوئے

دس دس کے وہ سارے نوٹ نکال کر فریدہ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ جو آج صبح فریدہ نے اس سے نیگ مانگتے ہوئے لوٹائے تھے اور کہا تھا" سنبھال کر رکھیے اپنی دلہن کو دیجئے گا......"

فریدہ نے ان نوٹوں کو دیکھا۔ خوشبوں کے سوتے تو اس کے انگ انگ سے پہلے ہی پھوٹ رہے تھے۔ عرفان کی اس شوخی سے اس کا من پھول سا لگا..... اس نے جھولی سمیٹ لی۔

عرفان نے اپنا ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے کرتے ہوئے اور شوخ ہوتے ہوئے کہا

" لاؤ میرے دو سو روپے واپس کرو..... جو صبح نیگ میں وصول کیے تھے۔

"کیوں؟" فریدہ نے حیا بار نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"بھئی نیگ تو بہنیں لیتی ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

فریدہ شرمائی لجائی پھر ہولے سے بولی "تب میں آپ کی بہن ہی تھی۔"

"اور اب؟" عرفان نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا......

اب..... !اب؟" فریدہ نے حیا کے بار سے جھکی جھکی ایسی نظروں سے اسے دیکھا جن میں اس نئے رشتے کی رومانوی اور مقدس معنویت تھی۔

عرفان سرشار سا ہو گیا......

قسمت کے کھیل کتنے نیارے ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔
